عکس مکتوب مولانا آزاد
بالمقابل صفحہ 22

علی گڑھ میگزین

ایڈیٹر

مختارالدین آرزو

علی گڑھ میگزین

جلد ۲۴ بابت سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء نمبر

نگراں
رشید احمد صدّیقی

منیجر
سیّد ظہیر الدّین علوی

ایڈیٹر
مختار الدّین آرزو

اراکین:-
محمّد الدین موجد
نفیس احمد ترمذی
قاضی سعید احمد
محمد مسعود صدّیقی
اقبال انصاری

غزلیں :-

طنزیات :-

خاکے :-

احمد جی دعر ا ای معلومات -

مکتوبات :-

ترتیب

مرتب

مختارالدین احمد آرزو

(Photo by C. N. Flower)

شذرات

ہندوستان میں آج کل جو مسائل زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں اور جو حل طلب ہیں اُن میں قومی زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں بہکافی عرصہ سے زیر بحث ہے۔ گاندھی جی اور بعض دوسرے ملک کے خیرخواہوں نے اُردو اور ہندی کے روز افزوں تنازع کو ختم کرنے کے لئے یہ صورت نکالی کہ عربی فارسی کے ثقیل اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ کو نکال کر ایک ملی جلی زبان تیار کی جائے جو صاف اور آسان ہو اور صحیح معنوں میں ہندوستان کی زبان ہو' اس زبان کا نام انھوں نے ہندوستانی رکھا۔ کانگریس پہلے ہی ۱۹۲۰ء میں کہہ چکی تھی کہ کانگریس کی سرکاری زبان ہندوستانی ہی ہوگی جو دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائیگی' بعد میں اسکی پھر توثیق کیگئی کہ شمالی ہند کے عام باشندوں کی زبان جو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستانی اسی کا نام ہو اور یہی زبان قومی زبان ہوگی۔ اُردو کے بعض زعماء نے بھی جو صرف اُردو زبان ہی کے حق میں تھے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور ڈاکٹر عبدالحق مولٰنا سید سلیمان ندوی اور دوسرے لوگ بھی اسی موعودہ زبان ہندوستانی کو اُردو کی جگہ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ خیال تھا کہ حکومت ملتے ہی زبان کا مسئلہ اسی طرح طے ہوگا جس طرح وعدہ کیا گیا تھا اور جس طرح کانگریس کمیٹی نے منظور کیا تھا۔ لیکن ابھی ہمارے وزراء زمام حکومت سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ اُردو کی بیخ کنی شروع ہوگئی عام تقریروں میں ایک مصنوعی اور غیر فطری زبان استعمال کرنی شروع کی گئی۔ ہندی کی حمایت میں پروپیگنڈا ہونے لگا اور آل انڈیا ریڈیو نے ہندی نوازی بلکہ سنسکرت نوازی شروع کردی۔ تقسیم ہند کے بعد تو یہ پالیسی اور واضح ہوگئی اور اب تو صوبوں کی حکومتوں نے بھی کھلم کھلا ہندی نوازی شروع کردی ہے اور اسکولوں کی نیچی جماعتوں میں ہندی لازمی قرار دیدی گئی ہے۔

قومی زبان اصل میں وہی زبان بن سکتی ہے جو آسان ہو' عام فہم ہو' اور جو عوام کی زبان ہو۔ عوام پر نہ تو بوجھل سنسکرت لادی جاسکتی ہے اور نہ ثقیل فارسی و عربی۔ جو قومی زبان ہوگی وہی حکومت کی زبان ہونی چاہیئے آج جو حکومت کی زبان ہے اور جسمیں اسکے کمیونکے وغیرہ شائع ہوتے ہیں اُسے اکثر عوام نہیں سمجھتے قومی زبان اس طرح نہیں بنتی ہے جس طرح حکومت یوپی کے کارخانہ میں زبان ڈھالی جارہی ہے۔ اُس میں آورد ہے اور تکلف ہے مصنوعی ہے اس میں کوشش کو دخل ہے۔ زبان تو خود بخود بنتی ہے اور جسے عوام عام طور پر استعمال کریں وہی قومی زبان ہونی چاہیئے' اس میں اس کے مستعمل الفاظ کو عام از یں کہ کسی بھی زبان سے کیوں نہ آئیں جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے' آج تو تعصب برتا جارہا ہے۔ عربی و فارسی کے رسیلے اور سبک الفاظ نکال کر پھینکے جارہے ہیں انگریزی کے وہ الفاظ جو بہت نرم اور دلکش ہیں انھیں کھسوٹا جارہا ہے اور اُن کی جگہ اس زمین میں سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ بوئے جارہے ہیں۔ یہ کانگریس کے اعلان کردہ اور مسلمہ نصب العین سے فرار' اور اسکی طے شدہ لسانی پالیسی سے غداری کے مرادف ہے یہ سخت بھول ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کررہے ہیں وہ آج نہیں تو کل ضرور پچھتائیں گے اور پھر انھیں اس منزل پر لوٹنا پڑیگا جہاں وہ ہمیں پہلے تھے

اُردو اور قانون ساز اسمبلی:-

گاندھی جی کے دشمن وہی نہیں ہیں جنھوں نے انھیں قتل کیا ہے' اُن کے دشمن وہ بھی ہیں جو اُنکی رائے اور منشا اور اُن کے اصول کے خلاف چل رہے ہیں۔ گاندھی جی کا جسم فانی تھا' اور اُسے کبھی نہ کبھی فنا ہونا ہی تھا لیکن اُن کے اصول امر ہیں۔ اور اُن کے آدرش ابدی' گاندھی جی خود کہا کرتے تھے جسم مرتا ہے لیکن اصول نہیں مرتا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کچھ لوگ اُن کے اصولوں کو بھی موت کی نیند سُلا دینا چاہتے ہیں۔ اُنکی تعلیمات اور کارناموں کو

ایشین ریلیشن کانفرینس دھلي کے چند مسلم مندوبین

مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ میں

جناس اعظم (نمایندہ انڈونیشین یوتھہ جاوا)
ڈاکٹر برھان‌الدین (صدروفد ملایا) عبدالوھاب عزام
(نمایندہ عرب لیگ) مصطفے مومن (صدر وفد مصر)

عبدالوھاب عزام عربی میں جوابی تقریر کر رہے ھیں
علامہ عبدالعزیز میمنی
ان کی تقریر کا اردو ترجمہ سنا رہے ھیں

اسی طرح سکھائی جائینگی جس طرح یورپ میں فرانسیسی اور المانوی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ اور اگر عربوں کا اتحاد کامیاب ہوگیا اور ان کی حکومتیں مضبوط و استوار ہوگئیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی سارے مسلمانانِ عالم کی مشترکہ زبان ثابت ہوگی۔

ہم اپنے لائق وائس چانسلر صاحب سے عرض کرینگے کہ عربی و فارسی کے شعبوں کی طرف خاص توجہ فرمائیں، ہمارے جامعہ میں طلبا کو بولنے اور لکھنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایرانی اور عرب اساتذہ کا یہاں تقرر ہونا چاہیئے۔ پنجاب یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے وہاں اورینٹل کالج میں ایک عرب موجود ہیں، خود علی گڑھ میں شیخ عبدالحق موجود تھے، شعبۂ فارسی میں بھی ایک ایرانی استاد کا تقرر کیا جائے۔ یونیورسٹی کو چاہیئے کہ اپنے طلبا کو مصر اور ایران جانے کے لیے کم از کم ایک وظیفہ ہر سال دے تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں اور وہاں کی زبان اور موجودہ ادب سیاسی ثقافتی حالات کا مطالعہ

عربی و فارسی نصاب تعلیم:۔

صوبہ متحدہ میں عرصہ ہوا ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ صوبے میں عربی و فارسی مدارس جنھیں حکومت امداد دے رہی ہے اُن کے نصاب تعلیم پر غور کیا جائے، مولٰنا آزاد اس کمیٹی کے صدر تھے اس کے جلسے بھی ہوئے اور سب کمیٹیاں بھی بنادی گئیں، علی گڑھ کے بھی دو نمایندے پروفیسر عبدالعزیز میمن اور مولٰنا ضیا احمد بدایونی علی الترتیب عربی و فارسی کمیٹیوں کے رکن تھے۔ مشاہیر اساتذہ نے مل کر بڑی محنت سے نصاب تیار کیا اور بعض اصلاحات کی سفارش بھی کی۔ ہمیں جان کر افسوس ہوا کہ کام کی رفتار یک گونہ سست پڑگئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اس سلسلے میں مالی امداد دے اور اعانت کا ہاتھ بڑھائے تاکہ نہایت خوش اسلوبی سے کمیٹی کے سفارشات پر عمل درآمد کیا جاسکے۔

ہندوستانی اکیڈمی:۔

ہمیں یہ جان کر افسوس ہوا کہ اواخر اگست ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ میں ہندوستانی اکیڈمی کا جلسہ ہوا جس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہندوستانی اکیڈمی کا نام اب ہندی اکیڈمی کردیا جائے گا اور اس کا مقصد اب صرف ہندی کی ترویج و ترقی ہی ہوگا۔ ہندوستانی اکیڈمی بالکل نیم سرکاری ادارہ ہے اس کے اراکین بھی حکومت ہی مقرر کرتی ہے اس کا مقصد ابتک یہی تھا کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کو ترقی دیکر ایک سنگم یعنی ہندوستانی بنایا جائے۔ ابھی حال میں جو اُردو کو نکال کر صرف ہندی کی ترویج اس کا مقصد قرار دیا گیا ہے وہ کسی طرح مستحسن نہیں۔ یو۔پی کے وزیر تعلیم نے اُس وفد سے جو آل احمد سرور صاحب کی سرکردگی میں اُن سے ملا تھا بہت ہی اُمید افزا باتیں کی ہیں اور یقین دلایا ہے کہ اُردو کے معاملہ پر وہ خاص توجہ کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وزیر موصوف اپنے وعدے کو بھولے نہ ہوں گے اور جلد ہی کوئی ایسا عملی اقدام کریں گے جو اُردو کو اس کا حق دلادے۔

نئے ستارے:۔

آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں کچھ نئے رسالے شائع ہونے شروع ہیں ان میں "سویرا" کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے جو اپنے ترتیب مضامین، تنوع اور ظاہری تزئین و آرائش کے لحاظ سے اُردو زبان کا سب سے بہتر رسالہ ہے۔ جسے ہم غیروں میں بھی فخر کے ساتھ اُردو زبان کا رسالہ کہہ کر پیش کرسکتے ہیں۔ یہ رسالہ اگرچہ پاکستان سے شائع ہوتا ہے لیکن مضمون نگاروں میں پاکستان اور ہندوستان کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ادب کو خانوں میں بانٹ کر رکھا بھی نہیں جاسکتا۔ لکھنے والوں میں چوٹی کے اہل قلم شامل ہیں، ابتک اس کے چار نمبر شائع ہوچکے ہیں، ہم اس کے لئے ساحر لدھیانوی صاحب کو جس قدر بھی مبارکباد دیں کم ہے۔

"نقوش" "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب" کا ترجمان ہے۔ جسے ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی لاہور سے شائع کر

بھی فنا کا حکم دینا چاہتے ہیں۔

پنڈت نہرو نے متعدد تقریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مورتیں بنانے سے اور مجسمے نصب کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ گاندھی جی کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو ان کے اصول اور تعلیمات کو زندہ رکھو۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے اصولوں کے خلاف عمل درآمد ہو رہا ہے انھوں نے ہمیشہ کہا کہ ناگری اور اُردو دونوں رسم الخط باقی رکھے جائیں اور تمام دفتروں کی کارروائی میں دونوں زبانیں استعمال ہوں لیکن اس کے خلاف حکومت یوپی نے یہ فیصلہ کردیا کہ وہاں کی سرکاری زبان ہندی اور رسم الخط دیوناگری ہوگی۔ یہ فیصلہ یوپی میں ہوا ہے۔ جہاں کے رہنے والوں کی چاہے وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں اصلی زبان اُردو رہی ہے جہاں اُردو پروان چڑھی۔ بہار اسمبلی نے بھی ہندی حکومت کی زبان قرار دیدی ہے پنجاب میں بھی یہی حکم نافذ کردیا گیا ہے جہاں کی اکثر و بیشتر آبادی ہندی زبان اور ناگری رسم الخط سے ناواقف ہے اور جہاں زیادہ تر اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے جب ان صوبوں میں یہ حال ہے تو پھر دوسرے صوبوں میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

ہند کی قانون ساز اسمبلی میں اب زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا ہے۔ پنڈت نہرو نے ہمیں کئی بار یقین دلایا ہے کہ وہ اُردو زبان اور رسم الخط کو مٹانے کی تحریک کی پُرزور مخالفت کریں گے ہم چاہتے ہیں کہ سارے آزاد خیال لوگ جو نہرو حکومت کے ساتھ ہیں اور گاندھی جی کی تعلیمات کو امر رکھنا چاہتے ہیں اس موقع پر اُردو زبان اور رسم الخط کی تائید کریں گے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ہندی اُردو تنازع کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا "ہندی کو اُردو سے خائف نہ ہونا چاہیئے درحقیقت اُردو کے اسالیب کو جذب کرکے ہندی مالا مال ہو جائیگی۔ ہندی کے قواعد کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں جو اُردو کے ہیں اس لیے یہ تنازع مجھے غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے" میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گا کہ اُن کی آواز باہر ہی نہیں حکومت کے ایوانوں کے اندر بھی گونجنی چاہیئے۔

مشرقی زبانوں کی اہمیت :-

مشرقی زبانوں میں فارسی اور عربی کی حیثیت، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں قدیم زبانوں کی حیثیت ہے اور اُن کا مطالعہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح یورپ میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا۔ دونوں میں ممکن ہے ایک گونہ مشابہت ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی قدیم زبانوں اور عربی و فارسی میں بڑا اہم فرق ہے۔ یونانی اور لاطینی مردہ زبانیں ہیں لیکن اس کے برخلاف عربی و فارسی زندہ اور طاقتور زبانیں ہیں۔ زندہ زبانوں کا مطالعہ ہمیں مردہ زبانوں کی طرح نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں عام طور پر قدیم کتابیں درس میں رکھی جاتی ہیں، جدید عربی پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ اہل زبان کے موجودہ تلفظ کی طرف بھی توجہ نہیں کی جاتی۔ اور نئے رسالوں اور روزناموں کی طرف سے تو بے حد بے توجہی برتی جاتی ہے۔ جب عربی و فارسی زندہ اور ترقی پسند زبانیں ہیں تو ہمیں اُنکی ترقیوں کا ساتھ دینا چاہیئے اُنکے ادب کے نئے بہاؤ اور دھاروں کو جاننا اور پرکھنا چاہیئے اور ان اسباب سے واقفیت حاصل کرنی چاہیئے جنکی بنا پر ہماری زبانیں نیا قالب اختیار کر رہی ہیں

عربی و فارسی زبانوں کی اہمیت، ہندوستان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے مشکل یہ ہے کہ ہم عربی کو ایک مذہب کی زبان اور فارسی کو تاریخ اور شاعری کی زبان سمجھنے لگے ہیں، حالاں کہ انکی اہمیت اور فوائد بے انتہا ہیں۔ یہ زبانیں مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کے درمیان ثقافتی رابطے کا کام دینگی۔ یہ زبانیں مسلمانانِ عالم میں اتحاد اور یک جہتی کا بہت بڑا سبب اور ذریعہ بن سکتی ہیں مستقبل قریب میں جبکہ ایشیائی قومیں ایک دوسرے کے نزدیک تر ہو جائینگی تجارتی رشتے ہندوستان اور مشرق قریب کے درمیان ازسرِنو تازہ ہوں گے۔ عربی و فارسی زبانیں آپس کے رابطہ و تعلق کا ذریعہ اور واسطہ بنیں گی۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں ان زبانوں کی اہمیت میں گوناگوں اضافہ ہوگا اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں یہ زبانیں

ان فسادات سے جو نقصان پہنچا ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے ... حالات میں صلاح الدین صاحب سے دلی ہمدردی ہے اور ہماری دعا ہے کہ انھیں سکون خاطر نصیب ہو اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ وہ اسی آب و تاب سے "ادبی دنیا" شائع کرنا شروع کر دیں۔ اردو رسائل میں ان دو رسالوں کی غیر موجودگی سے جو خلا سا معلوم ہوتا ہے وہ فوراً کسی طرح پر ہو جائے۔

اب اُن رسالوں کو لیجیے جو عارضی طور پر بند ہو گئے ہیں۔ ادبی دنیا کے لئے افسوس کا مقام ہے کہ حکومت پنجاب نے کچھ اخبارات و رسائل کو چھ ماہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ اس میں سویرا، نقوش، ادبِ لطیف جیسے رسائل بھی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان رسائل کو صاف طور پر حکومت نے نہیں بتایا کہ انھیں کس گناہ کی یہ سزا مل رہی ہے۔ نقوش کے متعلق صرف کہا گیا ہے کہ منٹو کی ایک کہانی "کھول دو" کی اشاعت پر بند کیا گیا ہے۔ اس کہانی کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو حکومت کے خلاف ہو یا جس میں بغاوت کا شائبہ بھی ہو۔ اور سویرا و ادبِ لطیف کو تو ابھی تک ان کا جرم بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ سویرا، نقوش اور ادبِ لطیف پاکستان اور ہندوستان کے بہترین ادبی رسالوں میں ہیں اور ان رسالوں کا اجرا پاکستان ہی نہیں ہندوستان کیلئے بھی باعث فخر ہے۔

جامعہ اردو:-

جامعہ اردو جسکی بنیاد ۱۹۳۹ء میں آگرہ میں پڑی تھی اُس نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے دس سال پورے کر لئے۔ اگر کسی جماعت اور ادارہ کا اندازہ اس کے افراد اور کارکنوں سے کیا جا سکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس ادارے میں صوبہ متحدہ کی تمام یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے صدر، جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ، انجمن ترقی اردو، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ہندوستانی اکیڈمی، دارالمصنفین کے نمائندے، رشید احمد صدیقی، نواب چھتاری، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر عبدالحق، شانتی سروپ بھٹناگر جیسے لوگ اس کے مجلس منتظمہ میں شامل ہوں، اسکی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں کرنا چاہئے۔

جامعہ کے تحت تین امتحانات ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ لوگوں نے کافی دلچسپی لی ہے۔ ۱۹۴۵ء تک ان امتحانوں میں ۱۳۴۶ طلبا شریک ہوئے۔ جن میں ۲۳۲ طالبات تھیں۔ گزشتہ سات سال کے نتائج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نتائج کافی حوصلہ افزا ہیں۔ اس میں ۷۹ فیصدی تک طلبا کامیاب ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر نے اچھے لفظوں میں جامعہ کے بارے میں رائے دی ہیں۔ پروفیسر طاہر فاروقی کی علیحدگی کے بعد مقامِ مسرت ہے کہ جامعہ کے انتظامات ایک لائق محنتی اور جفاکش انسان کے ہاتھوں میں چلے آتے ہیں۔ ہماری مراد پروفیسر ظہیر الدین علوی استاد شعبۂ اردو علی گڑھ سے ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ علوی صاحب نے جامعہ کی ناخدائی کا بیڑا ایسے وقت اٹھایا ہے جب ہر طرف جامعہ کی کشتی کو موج بلا گھیرے ہوئے تھی۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ادب نوازی اور علم پروری سے کام لیکر سلطان جہاں منزل کی بالائی گیلری جامعہ کے دفتر کو دیدی ہے چنانچہ ۲۳ جنوری کو آگرہ سے اس کا دفتر علی گڑھ کو منتقل ہو گیا ہے۔ آجکل ہنگامی دنوں میں بھی جامعہ کے طلبا کی تعداد باعث تعجب ہی نہیں، قابل رشک بھی ہے۔ ایسے زمانہ میں جب یونیورسٹی میں اردو کے طلبا کی تعداد گھٹ گئی ہے جامعہ نے گزشتہ دس سال کا ریکارڈ قائم رکھا ہے اس سال بھی طلبا کی تعداد ساڑھے تین سو سے زائد ہے۔ ہم اس کامیابی پر جامعہ کے رجسٹرار جناب ظہیر الدین علوی صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ہمارے بعض شعبے:-

شعبۂ عربی۔ علامہ عبدالعزیز المیمنی (صدر شعبۂ عربی) کی ذات گرامی ایشیا کے لئے باعثِ ناز ہے۔ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے علاوہ، کیمبرج، آکسفورڈ، ماسکو اور یورپ کے اکثر مستشرقین کی نگاہوں کے مرکز، اور ساری

[illegible] مضامین کا حامل ہے [illegible]

[illegible] جمیل" خدیجہ مستور اور فارغ بخاری وغیرہ پشاور سے نکالتے ہیں۔ ادھر دوسرا نمبر شائع ہوا ہے۔ خدیجہ مستور کی کہانی
[illegible]ل ہے۔ یہی ایک کہانی اس نمبر کو بلند بنانے کے لئے کافی تھی۔ راشد کا مقالہ بے حد بصیرت افروز ہے۔ احمد ندیم قاسمی اپنے
[illegible] سے بہت اچھے انداز میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔

[illegible] عظیم کراچی سے ماہِ نو شائع کر رہے ہیں یہ حکومت کا رسالہ ہے اور یہ کہنے میں ہمیں باک نہیں کہ مواد اور ترتیب کے
[illegible] حکومتِ ہند کے رسالہ آجکل سے کہیں بلند ہے۔

ہندوستان میں بھی بعض اچھے رسائل نکلنے شروع ہوئے ہیں اُن میں ساحر ہوشیار پوری کا "چندن" خاص طور پر قابلِ
[illegible]داشت نذار ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب "چندن" ہندوستان کے رسالوں میں ایک مخصوص جگہ اپنے
[illegible]گا۔ علی سردار جعفری وغیرہ نے "نیا ادب" ایک عرصے کے بعد پھر شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ظاہری حسن تو پہلا سا
[illegible] معنوی طور پر نقشِ ثانی، نقشِ اول سے اگر بہتر نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے 'دار و رسن' کا سلسلہ بہت دلچسپ اور
[illegible]ہے لیکن سردار کے لہجہ میں بعض جگہ تیزی، سختی اور ایک طرح کی جھلاہٹ بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ آخر میں خطوط کا سلسلہ
[illegible] مفید ہے۔ ہم ان رسالوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور انھیں اردو ادب کے لئے فالِ نیک سمجھتے ہیں۔

[illegible] ہوئے تارے:۔

جہاں ہم بعض نئے رسالوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اُن کی زندگی و ترقی کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، وہیں بعض اُن
[illegible] کا بھی افسوس ہے جو اب عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔

معاصر (پٹنہ) جس کے روحِ رواں کلیم الدین احمد صاحب تھے اب ایک عرصہ سے بند ہے۔ اس رسالے نے گذشتہ سات آٹھ سال
[illegible] ادب اور تنقید کا بڑا اونچا معیار قائم کر دیا تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب کے تحقیقی مضامین کلیم الدین صاحب کی تنقید، اختر اورینوی
[illegible] کی کہانیوں اور پروفیسر حسن عسکری کے تاریخی مقالوں نے ادب اُردو میں قابلِ قدر اضافہ کیا تھا۔

"مصنف" (علی گڑھ) جسے سید الطاف علی صاحب مجلسِ مصنفین علی گڑھ سے گذشتہ ۸ سال سے شائع کر رہے تھے اور جو اپنے
[illegible]ات، تواریخی نادر، سائنسی مباحث، اور ادبی و علمی مقالوں کی وجہ سے اُردو کے رسالوں میں ایک خاص اہمیت و حیثیت کا مالک تھا
[illegible]وں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ سید صاحب نے ۵۰۰ خطوط لوگوں کے پاس بطور اپیل چھاپ کر بھیجے تھے، قوم نے ۲۷ روپے کی گراں قدر
[illegible] بھیجی۔ ع "یہ بفیضِ اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"۔ یہ فیاضی اور دریا دلی دیکھئے۔ ہندیونین سے اگر اُردو مٹی تو یقین فرمایئے
[illegible] ٹنڈن جی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود ہماری قوم کی ناقدر دانی اس کا گلا گھونٹے گی۔

ان کے علاوہ دو اور رسالوں کا ذکر ہم خاص طور پر کرنا چاہتے ہیں جن کی اشاعت معرضِ التوا میں پڑی ہوئی ہے رسالہ "اردو"
[illegible] ایک طویل عرصے تک اُردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے اور اس کے ٹھوس اور وقیع مضامین نے اُردو ادب میں گراں بہا اضافہ
[illegible] کے بعد سے یہ رسالہ بند پڑا ہے، ہم مولانا عبدالحق قبلہ سے التجا کریں گے کہ وہ جہاں سے بھی مناسب سمجھیں یہ رسالہ ضرور شائع
[illegible] رسالہ "[illegible]" (لاہور) کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد صاحب کے

مولانا ... ابن العلوی ۱۳۶۳ھ میں شرح المختار من شعر بشار، اور ۱۳۶۸ھ میں دیوان شعر الامام ابی بکر بن درید، قاھرہ سے شائع کر چکے ہیں، آج کل دیوان بشار بن برد کی ترتیب و تہذیب میں مصروف ہیں۔ بشار کے مکمل دیوان کا دنیا میں وجود نہیں۔ مولانا نے بڑی محنت سے مختلف ماخذوں اور مصدروں سے بشار کے اشعار ڈھونڈھ کر جمع کئے ہیں، جن کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچتی ہے۔ ابھی حال میں دیوان بشار کے ایک نسخے کا پتہ چلا ہے جو ناقص الاول ہے، یہ نسخہ ٹیونس میں ہے اور زیتونیہ یونیورسٹی کے چانسلر محمد طاہر بن عاشور کی ملکیت ہے۔ انھوں نے مولانا کی کتاب شرح مختار کے مطالعے کے بعد ہی ڈاکٹر کرنکو کو اپنے نسخے کی اطلاع دے دی تھی۔ مولانا نے علامہ شیخ خضر حسین جمعیۃ الھدایۃ الاسلامیہ اور پروفیسر احمد امین صدر لجنۃ التالیف کے ذریعے اس نسخے کا روٹو گراف منگوانے کا انتظام کر لیا ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ شعبۂ عربی کے دو سابق طالب علم آج کل امریکا، اور مصر میں اعلیٰ تعلیم میں مصروف ہیں ڈاکٹر سید محمد یوسف ام۔ اے۔ پی ایچ ڈی (علیگ) جنھوں نے علامہ عبد العزیز المیمنی کی زیر ہدایت "مہلب بن ابی صفرہ" پر کام کیا ہے، اب جامعہ فواد اول (قاھرہ) میں اردو زبان کے استاد ہیں اور وہیں ڈاکٹریٹ کے لئے عرب و ہند کے تعلقات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

دوسرے طالب علم نبی بخش بلوچ ام اے (علیگ) جو یہاں "سندھ، عربوں کے تحت۔ متوکل تک" پر کام کر رہے تھے، آج کل کولمبیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں اور وہاں تعلیمات کے کئی امتحانات امتیازی طور پر پاس کر چکے ہیں اور بہت جلد "ڈاکٹر آف ایڈوکیشن" کی ڈگری لے کر واپس آرہے ہیں۔

- ڈاکٹر خورشید احمد فارق ام اے۔ پی ایچ ڈی (علیگ) جنھوں نے زیاد ابن ابیہ پر ریسرچ کیا تھا آجکل دہلی کالج (سابق عربک کالج) میں استاد ہیں اور کئی علمی تالیفات میں مصروف۔ ان کا تحقیقی مقالہ اور تاریخ ادب عربی' اشرف اینڈ کو لاہور جلد ہی شائع کرنے والے ہیں۔ 'تاریخ ادب عربی' ڈاکٹر صاحب نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کی ہے اور یقین ہے کہ یہ کتاب ہمیں نکلسن اور دوسرے مغربی مصنفین کی تاریخوں سے بے نیاز کر دے گی۔

اس سال مجتبیٰ حسن صاحب ام اے (علیگ) "اردو زبان میں عربی الفاظ، ان کے تبدیل شدہ معانی اور ان کی صورتیں" پر ریسرچ کر رہے ہیں، وہ اپنا کام جلد ہی ختم کرنے والے ہیں۔

شعبۂ فارسی ۔ سال گزشتہ اس شعبہ میں خالد عمر صاحب اور سید خلیق نقوی صاحب ریسرچ کر رہے تھے۔ ان صاحبوں کے موضوع علی الترتیب یہ ہیں:۔ (۱) "فارسی کے ملک الشعراء دربار مغلیہ میں" (۲) "قدسی، تذکرہ و تبصرہ" "مولانا ضیاء احمد بدایونی، فیضی اور اس کے عہد" پر کام کر رہے ہیں۔

شعبۂ اردو ۔ شعبۂ اردو میں نو اساتذہ ہیں اور سب کے سب علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہیں۔

رشید احمد صدیقی ۔ ہمارے نگراں اور استاد رشید احمد صدیقی صاحب کی شعبے کے اندر بے حد مصروفیات ہیں، شعبے کے اندر اس وقت سات آٹھ اساتذہ ریسرچ کر رہے ہیں اور ان سب کے کاموں کی نگرانی اور دیکھ بھال تنہا انھیں کی ذات کرتی ہے۔ اس کے علاوہ شعبے کے اندر جو کچھ کام ہوتا ہے اور وہاں کے اساتذہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ بہت کچھ رشید صاحب کی وجہ سے ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کا کام اور صرف ہمارے شعبۂ اردو کا کام مجموعی طور پر برابر ہی ہوگا۔ اس عدیم الفرصتی کے باوجود رشید صاحب کچھ نہ کچھ کرتے

عربی دنیا کے طالب علموں کے امیدوں کے مرجع ہیں۔ عربی زبان و ادب پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اور بلے بلا کے حافظے کے مالک ہیں، از منۂ وسطیٰ کے عربی شعراء کے کئی لاکھ اشعار زبانی یاد ہیں۔ الزہراء (مصر) اور مجلۃ المجمع العلمی (دمشق) میں کثرت سے مضامین لکھے۔ اب تک مندرجۂ ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں:-

اقلید الخزانۃ (پنجاب یونیورسٹی) خلاصۃ السیر للمحب الطبری (دہلی) حیات ابن الرشیق (مصر) النتف من شعر ابن رشیق و ابن شرف (مصر) ما اتفق لفظہ و اختلف معناہ فی القرآن للمبرد (مصر) ابواب مختارہ (مصر) ما تلحن فیہ العوام للکسائی (مصر) مقالۃ کلا لابن فارس (مصر) حواشی خزانۃ الادب ۴ جلد (مصر) (۶ جلدیں غیر مطبوعہ) حواشی لسان العرب (مصر) ابو العلاء و ما الیہ (مصر) فائتۃ شعر ابی العلاء (مصر) رسالۃ الملائکۃ (مصر) زیادات ۔ ۔ دیوان المتنبی (مصر) سمط اللآلی ۲ جلد (مصر) نسب عدنان و قحطان للمبرد (مصر) دیوان الافوہ الاودی (مصر) دیوان الشنفری الازدی (مصر) دیوان ابراھیم بن العباس الصولی (مصر) الاختیار من دواوین المتنبی و البحتری و ابی تمام (مصر) تسع قصائد نادرۃ (مصر)۔

کتاب التنبیہات علی اغالیط الرواۃ لعلی بن حمزۃ البصری۔ بالکل مرتب ہے اور جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔

جو کتابیں زیر ترتیب ہیں ان میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

من نسب الی امہ من الشعراء   النکت علی طبعۃ مرجلیوث من معجم الادباء۔

عربی دنیا نے قدر افزائی میں کسی طرح کی کمی نہیں کی۔

حکومت دمشق نے دنیا میں عربی زبان کی سب سے زیادہ مستند اور بڑی جماعت مجمع العلمی کا ممبر رکن بنایا۔

حکومت شام نے ابو العلاء المعری کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر شام آکر ایک جلسے کی صدارت کی دعوت دی اور انھیں لانے کے لئے اپنے ہوائی جہاز بھیجنے کا انتظام کیا۔

حکومت مصر نے ذیل کی کتابیں مرتب کرنے کی استدعا کی اور اب انھیں حکومت مصر اپنے خرچ سے شائع کر رہی ہے۔

الوحشیات، وھی الحماسۃ الصغری لابی تمام، الفاضل للمبرد، دیوان کعب ابن زھیر، دیوان سھیم ابن العبد، دیوان حمید بن ثور۔

حکومت ھند پر "چراغ کے نیچے اندھیرا" کی مثل صادق رہی۔ اسے اپنے جواہر ریزوں کی خبر نہیں۔ اب جبکہ ہندوستان پر سے استعماری طاقتیں اپنا سایہ اٹھا چکی ہیں اور ملک آزاد ہو گیا ہے، ہمیں توقع ہے کہ حکومت ہند ان کی قدر پہچاننے میں دیر نہ کرے گی۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مرکزی حکومت کے علوم و معارف کا قلمدان ایک ایسی گراں مایہ ہستی کے ہاتھ میں ہے جو خود عربی اور اسلامیات میں بین الاقوامی حیثیت و اہمیت رکھتی ہے اور جس پر علامہ موصوف کے جوہر چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

ڈاکٹر عابد احمد علی ام۔اے (علیگ) ڈی فل (آکسفورڈ) ابن السکیت کی اصلاح المنطق مرتب کر رہے ہیں۔ یورپ سے انھوں نے روٹوگراف (عکسی نقلیں) حاصل کرلی ہیں، وہ اسے جلد ہی شائع کرنے والے ہیں۔

دو ٹکڑے "معارف" میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی غزلیں بھی آپکی معارف میں شائع ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دارالمصنفین کے سلسلہ تاریخ اسلام پر بھی ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔

ظہیر الدین علوی صاحب۔ مقالوں اور نظموں سے زیادہ ٹھوس کام کر رہے ہیں، جامعہ اردو کا سارا کام انھوں نے اپنے شانوں پر لے لیا ہے، اور روایات اس کی بقا و ترقی کے خیال میں سرگرداں نظر آتے ہیں، فرصت مل جاتی ہو تو حدیقۃ الشعراء کے جلسوں میں کرد ہمدمی بھی ہیں اپنی غزلیں سنا دیتے ہیں، اور کبھی کبھی اشک و رشک غالب وغیرہ قسم کی چیزیں بھی لکھ دیتے ہیں۔

نفسیات آج کے زمانے میں بے حد اہم موضوع بن گیا ہے ہر شعبے میں کام کرنے کے لئے نفسیات کا جاننا کچھ ضروری سا ہو گیا ہے اچھا ادب پیدا کرنے کے لئے بھی نفسیات کی واقفیت ضروری ہے۔ ہمارے شعبے کے دو استاد اس طرف بھی متوجہ ہیں ڈاکٹر مسعود حسین خاں پروفیسر میاں محمد شریف ایم اے (کیمبرج) کی نگرانی میں نفسیات میں ڈاکٹریٹ کے لئے ایک مقالہ لکھ رہے ہیں اس کا عنوان ہے "شاعری کے نفسیاتی نظریات کا تنقیدی جائزہ"۔ اردو میں لسانیات ان کا خاص موضوع ہے اور اس پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں مضامین لکھتے کافی ہیں لیکن شائع کم کراتے ہیں۔ ریڈیو سے کئی عمدہ تقریریں نشر کی ہیں۔ منظومات میں نظم، غزل، گیت سب ہی کچھ لکھتے ہیں۔ آجکل اردو میں ایک نظم لکھ رہے ہیں جو شاید اردو زبان کی طویل ترین نظم ہو گی۔

انور انصاری۔ اردو اور فلسفے میں علی گڑھ سے ایم اے ہیں، لیکن علم کی پیاس نہیں بجھتی، آجکل نفسیات کی تعلیم کیلئے جامعہ کلکتہ تشریف لے گئے ہیں۔

ابو اللیث صدیقی۔ حدیث ہے "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" (علم حاصل کرو چین ہی جا کر کیوں نہ سہی) تیرہ سو برس پہلے ممکن ہے عربوں کے لئے چین اور وہاں کے علوم کی خاص اہمیت ہو، لیکن آجکل تو علم کا مخزن یورپ ہے۔ ہمارا بیشتر عربی و فارسی اور اردو لٹریچر وہاں موجود ہے اور جو دیکھو ان کو یورپ میں تو ہوتا ہے [illegible] ڈاکٹر صاحب بھی تعلیم کو لئے یورپ تشریف لے گئے ہیں جہاں وہ جامعہ لندن میں لسانیات پر کام کریں گے۔

شعبۂ فلسفہ۔ جناب عمر الدین صاحب ایم اے (علیگ) صدر شعبۂ فلسفہ، شعبہ کی نشو و نما میں کافی دلچسپی اور انہماک کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ صحت کی خرابی کے باوجود علمی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں، ابھی حال میں انھوں نے اپنی انگریزی کتاب غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر شائع کی ہے۔ جہاں ڈاکٹر ظفر الحسن، میاں محمد شریف، ڈاکٹر محمود احمد کی جدائی کا ہمیں غم ہے وہاں اس شعبے میں کچھ نئے اساتذہ کی آمد ہمارے لئے باعث مسرت ہے۔ ظفر احمد صدیقی صاحب ڈاکٹر ظفر الحسن کے خاص تلامذہ میں ہیں اور بریلی اور آگرہ کے کالجوں میں استاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اقبال پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ شہاب الدین محمد منشی صاحب بی اے (آنرز) ایم اے (علیگ) نے ڈاکٹر ظفر الحسن اور میاں محمد شریف دونوں سے فیض حاصل کیا ہے اور وہ فلسفہ اور نفسیات دونوں مضامین سے دلچسپی رکھتے ہیں، فلسفے میں ایم اے ہیں اور عملی نفسیات کا کام ابھی جامعہ کلکتہ میں ہندستان کے مشہور ماہر نفسیات پروفیسر بوس کی نگرانی میں کر کے آئے ہیں۔ "اقبال کا مابعد الطبیعات" کے مصنف ڈاکٹر عشرت حسین جو چین میں حکومت ہند کی طرف سے چینی فلسفہ پر ریسرچ کر رہے تھے ان دنوں اسی شعبے میں استاد ہو کر آگئے ہیں۔ یہ تینوں اساتذہ ہمارے قدیم طالب علم ہیں، ہم ادارہ کی طرف سے انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اسی سال مسٹر ڈے کا تقرر بھی عمل میں آیا ہے جو نفسیات کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں، زمانہ حاضرہ کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اس سال نفسیات میں ایم اے کی کلاس کھول دی گئی ہے۔ شعبے میں اس وقت چار اصحاب ریسرچ کر رہے ہیں ظفر احمد صاحب صدیقی، اقبال کا فلسفۂ تصوف پر کام کر رہے ہیں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا موضوع "شاعری کے نفسیاتی نظریات کا تنقیدی جائزہ" ہے۔ محمد حنیف صاحب سرسید کے علم کلام پر کام کر رہے ہیں اور آنسہ جمیلہ خاتون ایم اے (علیگ) "اقبال کے فلسفے میں انسان، خدا اور کائنات" پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھ رہی ہیں۔ آنسہ قمر جہاں نامی ایم اے (علیگ) نے گزشتہ سال عمر الدین صاحب کی کتاب "امام غزالی کا فلسفۂ اخلاق" کا بہترین شستہ اردو میں ترجمہ کیا۔ شعبے کی طرف سے یہ مفید ترجمہ شائع ہو جائے تو بہتر ہے۔

رہتے ہیں۔ آج کل اپنی کتاب "طنزیات و مضحکات" پر نظر ثانی اور مفید اضافے کر رہے ہیں، آل انڈیا ریڈیو کے لئے متعدد تقریریں لکھیں، اور وہ سب ہندوستان میں بے حد پسند کی گئیں۔

اختر انصاری نے اس طرف ادب کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ لکھا اور جو کچھ لکھا اس کی ایک مستقل حیثیت رہی۔ اختر انصاری کی ہستی کئی ہستیوں کا سنگم معلوم ہوتی ہے، وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈراما نویس بھی، تنقیدیں بھی لکھتے ہیں اور مقالے بھی، ہلکے پھلکے طنزیہ بھی سپرد قلم کرتے ہیں اور نظمیں بھی، "سنجیدہ" مضامین بھی لکھتے ہیں اور "نیم وحشیانہ" صنف شاعری سے بھی دل چسپی رکھتے ہیں، طویل نظمیں بھی کہتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قطعے بھی، گو فن پر قدرت ایسی ہے کہ وہ طویل نظموں کا مواد بھی بیشتر چھوٹے سے قطعہ میں سمو دیتے ہیں۔ اختر انصاری ان مصنفین میں ہیں جنھوں نے کم عمری ہی میں درجنوں نظم و نثر کے مجموعے ادبی دنیا کے سامنے پیش کر دیے اور لوگوں نے ہمیشہ انھیں "قدر اول" کی چیز سمجھا۔ اردو ادب کے ہر صنف میں ان کی ایک مستقل جگہ ہے اور اگر وہ کسی ایک صنف کے بھی ہو رہتے تو اردو کی "نجات اور ان کی مغفرت" دونوں کے لئے کافی ہوتا۔ ان کی نظم میں بسا اوقات ایک چونکا دینے والی کیفیت ملتی ہے اور نثر میں وہ کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان لکھتے ہیں، ہمارے ادیبوں میں کم لوگ ہیں جو زبان کی صحت کا اس قدر خیال کرتے ہیں جس قدر خیال اختر کو ہے۔ اس طرف انھوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں جن میں "دنیا کی دوسری بڑی لڑائی" "شاعر کے نغموں میں" "اردو غزل کا ماضی، حال، مستقبل" "قدیم زمانے میں فن اور اس کا طریقۂ اظہار" "مرزا فرحت اللہ بیگ اور ان کا فن" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو سے بھی کئی تقریریں نشر کیں جن میں بعض بے حد پسند کی گئیں "نئی روشنی" پر بیسیوں نظمیں اور قطعے لکھے، اردو زبان کا ایک پرانا ناول ڈھونڈھ نکالا ہے اور اسے اردو زبان کے سب سے بہتر ناول کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں، آج کل تین ایکٹ کا ایک ڈرامہ لکھنے میں مصروف ہیں، ساتھ ہی ساتھ اردو کی ترقی پسندی کی تحریک پر ڈاکٹریٹ کے لئے ایک تھیسس بھی لکھ رہے ہیں۔

خورشید الاسلام کو نظم و نثر دونوں پر بھرپور قدرت حاصل ہے، لکھتے کم ہیں لیکن جو لکھتے ہیں ادب کے اندر اس کا ایک درجہ ہوتا ہے۔ خورشید الاسلام صاحب طرز ادیب ہیں ان کا اپنا ایک طرز اور خاص اسٹائل ہے۔ ان کی اسٹائل مولانا آزاد تک سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ ان کے کسی مضمون کی چار سطریں پڑھیے، فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ "یہ خورشید الاسلام لکھ رہے ہیں" ایک زمانے میں وہ مادر یونین کے بہترین مقرروں میں تھے، اب یونین میں تو نہیں لیکن دوستوں میں اکثر بیٹھے ہوئے سرگرم گفتگو نظر آتے ہیں، چند جملے سن کر آپ کہہ اٹھیں گے "یہ خورشید الاسلام بول رہے ہیں" "خطوط نگاری" "شبلی" "نوجی سے چچا چھکن تک" "امراؤ جان ادا" ان کے چند مشہور مضامین ہیں۔ آج کل "غالب کے فن" پر اپنی تھیسس لکھنے میں بے حد مصروف ہیں۔

معین احسن جذبی۔ "اردو زبان کی قومی شاعری (سن ستاون سے اب تک) پر ریسرچ کر رہے ہیں، وہ ترقی پسندی کے حامیوں میں ہیں لیکن وہ خالص ادب اور "غوغا آرائی" میں شاید حدیں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ شاعری کا سلسلہ بھی جاری ہے، ابھی حال میں بعض اصحاب نے جذبی کی شاعری پر اعتراضات کئے تھے، یہ اعتراضات معترض کی نارسائی پر مبنی ہیں۔ جذبی فطرتاً کم گو ہیں، گفتگو اور روزانہ کے معمولات میں بھی ان کا یہی حال ہے۔ جذبی کا تخیل دیر اثر واقع ہوا ہے، مہینوں سے ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔ اب تک نامکمل ہے لیکن علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں زبان زد ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی شاخ علی گڑھ کے صدر ہیں اور دو سال سے آپ کی نگرانی میں انجمن بحسن و خوبی اپنا کام کر رہی ہے۔

شاہ عزیز احمد صاحب نے اپنا تحقیقی مقالہ "اردو زبان کا ذخیرۂ اسلامی، مذہبی اور اخلاقی ادب" مرتب کر ڈالا، اس کے

[illegible]ت باعثِ [illegible]دی

یونیورسٹی کی حالیہ تاریخ کا سب سے اہم اور قابلِ ذکر واقعہ وائس چانسلری کے عہدے کے لئے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کا انتخاب ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جیسے منصبِ وقیع کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب جیسے برگزیدہ شخص کا انتخاب صحیح معنوں میں ایک عہد آفریں، اور ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ یہ ایک ایسا اقدام ہے جو بے حد وسیع اور پُرشکوہ امکانات اپنے اندر رکھتا ہے، جو بلا شبہ ہماری جامعہ کے دَورِ زریں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ گزشتہ سال کی معروف سیاسی تبدیلیوں کے بعد ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب کے صفحات کھُل چکے ہیں۔ سیاسی انقلاب اور اس کے عقب میں رونما ہونے والے تہلکات و تغیرات نے عقیدتوں اور قدروں کی دنیا کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ نقطہ ہائے نظر اور زاویہ ہائے فکر بدل چکے ہیں اور بدل رہے ہیں۔ اس بحران اور عمرانیاتی خلفشار نے انڈین یونین کے باشندوں میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر کیا ہے۔ سلجھے ہوئے دماغ اور واضح سیاسی تصورات رکھنے والے اصحاب نہ پہلے تاریکی میں تھے [illegible]اب ہیں۔ مگر عام مسلمان جو گزشتہ چند سالوں سے سیاسی نعروں کی رَو میں بہنے کے عادی رہے ہیں آج اپنے غلط قسم کے جذباتی سہاروں سے محروم ہو کر بُری طرح اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ متضاد کیفیات اور متحارب میلانات نے اُن کو ایک شدید کشمکش اور ذہنی پیکار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مسلم یونیورسٹی جو ایک طویل مدت سے مسلمانوں کی تمدنی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی کا مرکزِ ثقل بنی رہی ہے اور جس کو آج پہلے سے بھی زیادہ وضاحت اور استقامت کے ساتھ اپنی رہنمایانہ خدمت انجام دینی چاہیئے تھی، خود اِس طوفان میں تھپیڑے کھاتی ہوئی ایک کشتی کی حیثیت رکھتی ہے۔ وجہ ظ[illegible] ہے۔ خود یونیورسٹی اب تک صحیح قسم کی رہنمائی اور مقتدر قوم پرست اصحاب کے تعاون و تناصر سے محروم رہی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی تشریف آوری اِس خلا کو بطرزِ احسن پُر کرتی ہے۔ یقیناً اس وقت یونیورسٹی کو ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب جیسی شخصیت کی ضرورت تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا متوازن سیاسی مسلک، اُن کی پختہ اور [illegible] ہوئی علمیت، اُن کا بے پایاں تعلیمی تجربہ، اُن کی فراخ و دل کشا انسانیت اور تمام دوسری گرامی قدر صفات نہ صرف یونیورسٹی بلکہ عام مسلمانوں کی زندگی کے حق میں مسیحائی کا کام کریں گی۔

اِس حکایتِ لذیذ کا لذیذ ترین جزو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے اور یونیورسٹی کے لئے نئے یا اجنبی ہرگز نہیں ہیں۔ وہ اسی ادارے کے پُرانے فرزند ہیں اور آج اُن کا شمار اُن چند ممتاز اور عظیم القدر ہستیوں میں ہوتا ہے جن کی پیدائش در تعمیر و پرداخت کا فخر علی گڑھ کو حاصل ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے انتخاب پر اُن کی خدمت میں سعادت مندانہ اور عقیدتمندانہ ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اور اُن کے ورودِ مسعود کو اپنی کشائش اور خوش بختی کا مژدہ خیال کرتے ہوئے خود اپنے کو بھی کچھ کم لائقِ مبارک باد نہیں سمجھتے۔

فلاسفیکل سوسائٹی۔ ظفر احمد صدیقی صاحب کی نگرانی میں قائم ہے، ہر پندرھویں روز مضامین پڑھے جاتے ہیں، اس سال ۲۲ مقالے پڑھے جا چکے ہیں جن کی فہرست شائع ہو چکی ہے۔ پچھلے سال پروفیسر حبیب الرحمٰن ٹریننگ کالج نے "پروپیگنڈے کی نفسیات" پر، محمود اقبال نے فاشزم کے فلسفہ پر اور آنسہ جمیلہ خاتون نے "اقبال کے مرد کامل" پر مضامین پڑھے اور مسٹر ڈونلڈسن نے غزالی کی اخلاقیات پر تقریر کی۔ اس سال نفسیات کے تجربات کا مشاہدہ ظفر احمد صدیقی اور شہاب الدین محمد مغنی صاحبان نے کئے۔ محمود اقبال نے "اقبال بحیثیت مفکر و شاعر" ایک مقالہ پڑھا۔

کامرس ڈپارٹمنٹ۔ میڈیکل کالج کی طرح کامرس کالج بھی جامعہ کی شدید ضروریات سے ہے اور قوم کو اس کی جس قدر شدید حاجت ہے وہ مخفی نہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے صرف ایک شعبے کے طور پر جناب ایس۔ ایم شفیع صاحب کی سرکردگی میں اس کا آغاز کر دیا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ شفیع صاحب نے اس شعبہ کی توسیع و ترقی اور اس کی بنیادیں مضبوط کرانے میں کسی طرح کی کمی نہیں کی۔ انھوں نے اپنی ان تھک محنت اور جفاکشی سے اس شعبے کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد صحیح معنوں میں اس سے دلچسپی لیں اور طلبہ کا ذوق و شوق اسی طرح بڑھتا رہے تو وہ دن دور نہیں جب شفیع صاحب کے ہاتھوں یہ شعبہ کامرس کالج کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ گذشتہ سال کے نتائج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آئی کام میں طلبا پچاس فی صدی اور بی کام میں ۹۴ فی صدی کامیاب ہوئے ہیں یعنی ۱۸ طلبا میں ۱۷ کامیاب ہوئے۔ ہم اس نتیجے پر جس قدر بھی شفیع صاحب کو مبارکباد دیں کم ہے۔ اس سال بھی طلبا کی مجموعی تعداد ۱۴۳ ہے۔ شعبۂ کامرس میں ایک سوسائٹی بھی ہے اور اس کا اپنا ایک رسالہ "جرنل آف کامرس" دو سال سے نکل رہا ہے۔ ہم اپنے نئے شیخ الجامعہ سے اس بات کی پرزور سفارش کریں گے کہ اس شعبے کو جس قدر ترقی دے سکیں دینا چاہیے اس لئے کہ اس وقت قوم اور ملک کو اس شعبہ کی سخت ضرورت ہے۔

کچھ میگزین کے بارے میں۔ علی گڑھ میگزین، ایک سہ ماہی رسالہ ہے اور جنگ سے پہلے سال میں بالعموم اس کے تین چار نمبر نکل جاتے تھے، اس طرف جب سے دوسری جنگ کا آغاز ہوا کاغذ کم یاب بلکہ نایاب ہو گیا، کاغذ کے ساتھ ساتھ دوسرے سامان طباعت کی گرانی اس قدر ہوش ربا رہی کہ گزشتہ چھ سات سال سے یہ معمول سا ہو گیا ہے کہ سال بھر میں صرف ایک نمبر نکل کر رہ جاتا ہے جو ضخامت کی ایک حد تک تلافی ضرور کر دیتا ہے لیکن طلبا کے ذوق کی تسکین کسی طرح نہیں ہوتی۔ جنگ کو ختم ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن کاغذ بازار میں اب بھی عنقا ہے، کنٹرول ریٹ پر بھی کاغذ نہیں ملتا ہے اس لئے کہ ہمارے پاس حکومت کا عطا کردہ پرمٹ نہیں ہے، اور بازار میں جو نرخ ہے اس نرخ پر ہم ۴ اشاعتوں کے لئے کاغذ خرید لیں تو ہمارا سارا اثاثہ ختم ہو جائیں اور کتابت و طباعت کے لئے ایک پیسہ بھی باقی نہ رہے ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ متعدد نمبر نکال سکیں لیکن ہم اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابتدا میں اسی ارادے کے تحت کئی جزو کی طباعت بھی کرائی گئی لیکن پریس کے انتظامات اس زمانے میں اسقدر درہم برہم تھے کہ ہم تو اس سال پرچہ نکالنے سے بھی مایوس ہو چلے تھے، مہینوں وہ اجزا چھپے پڑے رہے اور تاخیر اسقدر ہوتی گئی کہ کئی نمبر نکالنے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ میگزین اور مضامین کے معیار اور معنوی حسن کے بارے میں ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے اور نہ ہم انشا کے لفظوں میں "اپنا مال چھڑک کر بیچنے" کے قائل ہیں۔ ظاہری حسن کے متعلق ہمارا ذوق جس قدر مجروح ہوا ہے اور جو اذیت ہمیں پہنچی ہے اس کے بیان کے لئے دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ اس "مدینۃ العلم" میں ایک بھی ڈھنگ کا پریس ایسا نہیں جس میں ستھری اور حسین طباعت ہو سکے۔ پرانے عملے میں جو لوگ تھے وہ پاکستان سدھار گئے۔ لیتھو کی طباعت ویسے بھی غلاظت اپنے اندر لئے ہے، ٹائپ کا سرے سے یہاں وجود ہی نہیں، حیرت کا مقام ہے کہ آج سے ۶۰ سال پہلے تو یہاں سے کتابیں اور سرسید کا پورا اخبار ٹائپ میں چھپے اور اب اتنا سامان نہیں کہ ہم ایک صفحہ بھی ٹائپ میں شائع کر سکیں۔ ہم جب تک اس ذہنی تنگی کو سینے سے لگائے رہیں۔ گے ہماری ناکامیوں کی داستان طویل ہوتی جائے گی۔

گزشتہ دسمبر میں میگزین کا آخری شمارہ محمود فاروقی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد اسکی ادارت جناب شجاع احمد زیبا صاحب کو تفویض کی گئی۔ وہ ابھی ابتدائی کام بھی شروع نہ کر سکے تھے کہ ان کے والد محترم کی طبیعت علیل ہو گئی اور وہ وطن تشریف لے گئے اتفاق سے ان کے قیام وطن کا سلسلہ طویل ہوتا گیا، اور جب اسی حیص بیص میں متعدد مہینے گزر گئے اور انکی واپسی کی امید نہ رہی تو رسالے کی ادارت کی پوری ذمہ داری راقم کے کمزور شانوں پر ڈالدی گئی۔ زیبا صاحب ہمیں چند مقالے اور کچھ نظمیں دے گئے تھے، انکی کتابت بھی کرالی گئی تھی لیکن ہم نے انکی محنت اور کوشش سے فائدہ اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور ان مضامین کی اشاعت سے بچنے پر مجبور ہوئے۔ دوسروں کی سوچی ہوئی راہ پر قدم زن ہونا اور دوسروں کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کرنا ویسے بھی ہمیں پسند نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ علیگڑھ میگزین ایک لائق ایڈیٹر سے محروم رہ گئی۔ ہمیں یقین ہے کہ زیبا صاحب اپنی جامعہ کے میگزین کو بھولیں گے نہیں اور کچھ نہ کچھ اس کے لئے ضرور لکھتے رہیں گے۔

احسان فراموشی ہوگی اگر ہم اس موقعے پر اپنے استاد اور نگران رشید احمد صدیقی صاحب کی محبت و شفقت اور ان کی مہربانیوں کا ذکر نہ کریں، ساتھ ہی ساتھ ہم اپنے لائق منتظم سید ظہیر الدین علوی صاحب کے بھی بدل ممنون ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آسانیاں ہمارے لئے بہم پہنچائیں۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ میں ہم اختر انصاری صاحب، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام صاحب، جذبی صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ مفید مشورے دیئے۔

ادارے کے لوگوں میں ہم محمد الدین معین کے ممنون ہیں کہ انھوں نے میگزین کے نصف اجزا کے پروف پڑھے۔ پنڈت نہرو کے خطبے کی پہلی سطروں کا ترجمہ کیا اور بعض دوسرے پریس کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، نفیس احمد ترمذی نے خط و کتابت اور ترسیل میگزین کا کام اپنے ذمے لیا اور اقبال انصاری نے میگزین کا دفتر درست کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ہم ان سب صاحبان کے ممنون ہیں۔

مختار الدین آرزو
۷ نومبر ۴۷ء
۵۷۔ ایس۔ ایس، ویسٹ (سرسید ہال)

قائداعظم

محمد علی جناح

قائدِ اعظم

قائدِ اعظم کی وفات، کسی ایک شخص یا ایک قوم کے لئے نہیں، بلکہ ایک پورے دور کے لئے سانحہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ عظیم تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں، ان کی منطق بے پناہ تھی، ایک دنیا اس کی قائل ہے، وہ غیر متزلزل ارادے کے مالک تھے، ان کا سیاسی کارنامہ اس پر گواہ ہے۔ ان کے طوفان میں تصوّر، پندار میں جلال اور جوش میں جبروت تھا۔ ان کی عظمت میں ایک قوم کے روز و شب کی جھلک تھی۔ قائدِ اعظم نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور کبھی پیچھے نہیں رہے۔ ان کی دوستی اور دشمنی اصولی تھی، دوست اور دشمن دونوں کو ان سے خبردار رہنا پڑتا تھا۔ وہ آگے بڑھنے میں نہ موانع دیکھتے تھے نہ مصلحت کو خاطر میں لاتے تھے۔ مفاہمت کے دل دادہ نہ تھے، وہ ایک تناور درخت تھے، جس کے سایے میں آرام ممکن تھا، حفاظت بھی، لیکن ابھرنا مشکل اکثر اندیشہ ناک! حالات اور اشخاص ان کے ہاتھ میں کھلونا تھے، وہ حالات اور اشخاص پر اتنا اعتماد نہ کرتے جتنا اپنے آپ پر۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہی کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایک ریاست قائم کر دی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اس طرح انھوں نے ایک تاریخ بھی بنا دی۔

اس تاریخ کے کچھ اوراق ابھی سادہ ہی تھے اور بعض کے نقوش بھی پورے طور پر ابھرنے نہ پائے تھے کہ ۱۱ ستمبر ۴۸ ۱۹ء کی شب کو وہ اپنے مورخوں سے منھ موڑ کر اپنے خالق کے حضور میں جا پہنچے۔

خدا ہندستان اور پاکستان کو ہم نوا و ہم دم بنائے، اور دونوں حکومتیں ایک دوسرے ہی کے لئے نہیں، تمام عالم کے لئے موجب خیر و برکت ہوں۔ دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور اُن کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے، آمین!

(رخ)

خونِ شفق

ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

گاندھی جی

تیس جنوری کی شام، ہندستان اور ایشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کی سیاہ ترین شام تھی، اس تاریخ کو عدم تشدد کا دیوتا، اہنسا کا پجاری، ایک رندے کے ہاتھوں ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا گیا۔

گاندھی جی کے کارنامے سورج کی طرح روشن و تاباں ہیں، اس دبلے پتلے، نحیف و لاغر انسان نے چوتھائی صدی تک ہندستانیوں کے دلوں پر حکومت کی ہے سنگینوں کے زور سے نہیں بلکہ محبت شفقت کی مسحور کن طاقتوں کے ذریعے۔ وہ برسوں برطانوی سیاست دانوں سے لڑتے رہے، صرف سچائی اور عدم تشدد کے بل بوتے پر۔ انھیں بظاہر کمزور اور بے جان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہیت سے ٹکر لی، اور آج دنیا جانتی ہے کہ اس معرکے میں جیت کس کی رہی۔

گاندھی جی کی ذات مختلف و متنوع صفات کی سنگم تھی، انھوں نے انسانی خامیوں، کمزوریوں اور خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، انسانی عظمت کے تاج محل بھی تعمیر کئے اور محبت و خلوص کا ایلورا اور اجنتا بھی تراشے۔ اسی مادی دنیا میں انھوں نے ایک روحانی دنیا بھی پیدا کر لی تھی، ایک ایسی دنیا جس میں مادیت کے بازو مفلوج اور تشدد کے اعضا مسلوب نظر آتے ہیں اور روح اپنی تمام مسحرانہ قوتوں کے ساتھ انسانی دلوں اور جانوں پر قبضہ و تصرف حاصل کر لیتی ہے۔

گاندھی جی کی شخصیت و عظمت کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی، ان کی شخصیت ہی ہے جس نے انھیں عظمت بخشی، گاندھی جی اگر شہید نہ ہوتے تو ان کی عظمت نامکمل رہتی، اگر پہلے وہ عظیم تھے تو اب وہ عظیم تر ہیں۔

گاندھی جی کا پیغام، کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہ تھا، بلکہ آفاقی اور کائناتی تھا، انکی عمر بھر کی جد و جہد میں کسی مخصوص جماعت یا فرقے کا مفاد نہیں، بلکہ سارے زمانے اور کل بنی نوع انسان کی فلاح مضمر تھی انکی شخصیت تاریخ عالم کا ایک طوفانی اور ظلمت آفریں دور میں انسانیت کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کے لیے منارۂ روشنی کا حکم رکھتی تھی۔ غرض یہ کہ ان کی زندگی، وقت اور مقام کی حدود سے بالاتر تھی اور اسی کی طرح سارے زمانوں اور مقامات میں گھل مل کر تحلیل ہو گئی تھی۔

گاندھی جی کا فانی جسم، زمین کی وسعتوں اور آسمان کی پہنائیوں میں گھل مل گیا ہے، وہ سمندر کی تہوں اور آگ کے شعلوں میں تحلیل ہو گیا ہے، لیکن صدیاں بیت جانے کے بعد بھی جب انکے خاکی جسم کی یاد کے نقوش، دلوں کی لوح پر مدھم پڑ جائیں گے ان کی روح کی مسحور کن تجلی روشنی سے سارا جہان منور و درخشاں نظر آئے گا۔ (مرتب)

عربک سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سنہ ۳۸-۱۹۳۷ء
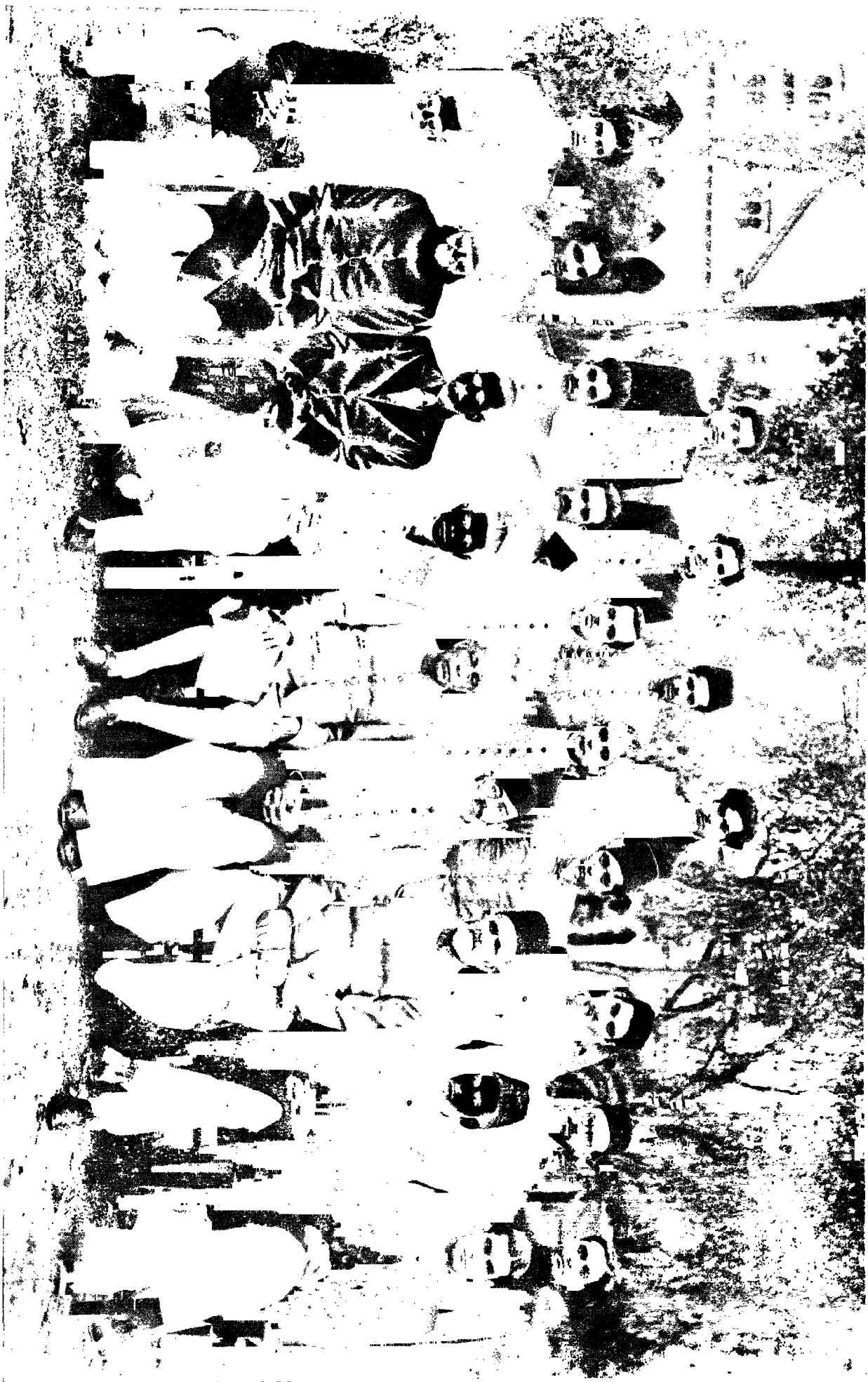
(بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) مجتبیٰ حسن (رسرچ اسٹوڈنٹ) ڈاکٹر خورشید احمد فارق (جونیر لیکچرر) پروفیسر عبدالعزیز میمن (صدر شعبہ عربی) مختار الدین احمد آرزو (نائب صدر سوسائٹی) نواب محمد اسمٰعیل خاں (وائس چانسلر) محمد مسعود صدیقی (سیکریٹری) ڈاکٹر عابد احمد علی (ریڈر) مولانا بدرالدین علوی (سینئر لیکچرر) خورشید حسن ایم اے (فائنل)

SEGAON, WARDHA.

(۱)

مورخہ ۹ جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین -

آپ کا خط ملا - ڈاکٹر اقبال مرحوم
کے بارے میں میں کیا لکھوں ؟
لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب
انکی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا"
پڑھی تو میرا دل اُبھر آیا - اور
یرودہ جیل میں تو سینکڑوں بار
میں نے اس نظم کو گایا ہوگا - اس نظم
کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ
خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے
کانوں میں گونج رہی ہے

آپکا

مو. ک. گاندھی

ناظمہ بیگم

گاندھی جی کی اُردو تحریریں

آج ان بدلتے ہوئے حالات میں جو کچھ بھی کہا جائے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گاندھی جی اردو زبان اور اُردو رسم الخط کے مخالفوں میں نہ تھے، بلکہ انھوں نے بارہا اُردو زبان اور رسم الخط دونوں کی حمایت کی، ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندی سیکھیں اور سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنی چاہتے ہیں اُردو سیکھیں، یہ ان کا صرف قول اور پیغام ہی نہ تھا بلکہ اس پر انھوں نے عمل کرکے بھی دکھا دیا اور ایک بار جب وہ جیل گئے تو اس فرصت سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے اُردو سیکھ لی۔ اُردو سیکھنے کے بعد ایک روایت کے مطابق پہلا اُردو خط انھوں نے حکیم عبدالمجید خواجہ کے نام لکھا تھا، افسوس یہ ہے کہ وہ خط ہمیں نہ مل سکا ورنہ ہم گاندھی جی کی سب سے پہلی اُردو تحریر آپ کے سامنے پیش کرسکتی۔

حضرت احسن مارہروی نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے کہ گاندھی جی نے بندے ماترم کے ایڈیٹر کے نام سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک خط اُردو میں لکھا تھا اُس کی دو سطریں یہ ہیں :-

"تلک مہاراج نے آدھے اشلوک میں ہند کو سکھایا کہ سوراجیہ ہمارا حق ہے اگر ہم ان کے بھگت ہیں تو کھدر پوشی پہن کر سوراج حاصل کرکے اپنی بھگتی کا ثبوت دیں۔"

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں ایک اردو خط انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھا تھا جسے بھائی عبدالماجد سے مشہور کیا تھا۔

گاندھی جی کی تحریر کے جو نمونے ہمارے پیش نظر ہیں آئیے اُن پر ایک سرسری نظر ڈال لیں :-

(۱) حسین سید، جامعہ ملیہ دہلی سے رسالہ جوہر کا اقبال نمبر شائع کر رہے تھے انھوں نے گاندھی جی سے اس نمبر کے لئے پیام مانگا تھا۔ گاندھی جی کا یہ رقعہ اسی کے جواب میں ہے۔

(۲) یہ رقعہ ۲۶ دسمبر سنہ ۳۹ء کو گاندھی جی نے انجمن ترقی اُردو کے اجلاس سنہ ۳۹ء کے موقعہ پر مولانا عبدالحق کو لکھا تھا۔

(۳) ۲۰ ستمبر سنہ ۴۱ء والی تحریر انھوں نے بی بی سلطانہ کو لکھی ہے، بی بی سلطانہ سے مراد سلطانہ قاضیہ بیگم ہیں جو حیات اللہ انصاری صاحب کی بیوی ہیں، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حیات اللہ اور ان کی بی بی دونوں گاندھی جی کی بے حد معتقد ہیں۔ گاندھی جی سے ان کے خاندان سے اچھے تعلقات تھے، رقعوں کے اندراجات سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

(۴) یہ تحریر بھی جو ردی کاغذ کے دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے بہن سلطانہ قاضیہ بیگم سے متعلق ہے، انھوں نے ایک مرتبہ سنہ ۱۹۴۲ میں گاندھی جی سے شکایت کی کہ آپ نے کہا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ چاہیں تو رکھیں اور چاہیں تو مٹا دیں۔" بہن سلطانہ جس دن اُن سے ملیں وہ ان کی خاموشی کا دن تھا۔ سلطانہ کی شکایت پر انھوں نے یہ سطریں لکھی تھیں جس میں انھوں نے اس بات کی تصریح کی کہ "یہ قول غلط طور پر میری طرف منسوب ہوا ہے میں نے کبھی یہ نہیں کہا ہے، پریس والے بات کو توڑ مروڑ کر پیش کر دیتے ہیں۔"

(۵) اس خط کے مکتوب الیہ بھائی حیات اللہ انصاری کے دادا خسر قاضی نجم الدین احمد صاحب (اندر کوٹ۔ میرٹھ) ہیں۔ گاندھی جی اور قاضی صاحب سے خلافت کے زمانے کے مراسم چلے آتے تھے، گاندھی جی گزر بڑے شوق سے کھاتے تھے، قاضی صاحب نے اُن کو میرٹھ کا گزر تحفے کے طور پر بھیجا تھا، اس کے ساتھ خط انگریزی میں لکھا تھا، گاندھی جی کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی، گاندھی جی کا یہ رقعہ اسی کا جواب ہے جس میں انھوں نے قاضی صاحب کو اُردو خط و کتابت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

گاندھی جی نے اردو بڑھاپے میں سیکھی تھی، پھر سیاسی اور دوسری مصروفیات کے باعث انھیں اُردو میں لکھنے کا زیادہ موقعہ نہ مل سکا اسی لیے اُردو رسم الخط میں کچا پن نمایاں ہے۔ گاندھی جی کی تحریر میں املا کی بھی بعض غلطیاں مل جاتی ہیں، انھوں نے ان معاملات پر اتنی توجہ بھی نہ دی ہوگی، ان کا کمال یہی تھا کہ اس عمر میں اُنھوں نے اپنے کو ایک نئی زبان لکھنے پڑھنے پر آمادہ کر لیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے، ان خطوط کا مطالعہ، گاندھی جی کو ان تمام نہاد فدائیوں کے لئے سرمہ بصیرت کا کام دیگا جو اردو زبان اور اردو رسم الخط دونوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

بھائی صاحب

آپکا تار ملا تھا۔ مجھے دکھ ہے
کی آپکے جلسے ہیں میں حاضر نہیں
ہو سکتا ہوں۔ میری امید ہے کہ
جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا
آپ جانتے ہیں کی میں اردو
زبان کی ترقی چاہتا ہوں، میرا
خیال ہے کی سب ہندو جو ملک کی
خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں
اور مسلم ہندی کا سیکھیں،

سیگاوں
وردھا 12/1/39 کے آپکا گاندھی

(۴)

تم نے میری بحث، دیکھی تھی سچ با۔۔۔ ایسے ہی کی میں نے کبھی ایسا نہیں کہا ہے۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے میں نکال کے بھیج سکتا ہوں کیا کیا جائے؟ اخباروں میں میرے بارے میں بہت سے غلط باتیں لکھی جاتی ہے اگر کل تک رہنا ہے تو آجاؤ کچھ بات کرینگے اور کچھ بتاؤنگا۔

اشعر ملیح آبادی

قتلِ انسانیت

کدھر بڑھے یہ کارواں — ؟ یہ قافلہ چلے کہاں — ؟
تمام وسعتِ فضائے ارض پر رواں دواں ہیں غم کی بدلیاں
اندھیری گھاٹیوں میں ناامیدیوں کی گم ہے زندگی — !

—

زمینِ ایشیا سے ایک "مردِ مومن" آج اٹھ گیا
وہ غیب دانِ رازدانِ کائنات
مزاج دانِ شش جہات
وہ اپنے دل کے آئینے میں جامِ جم سے بڑھ کے صاف دیکھتا تھا عکس کائنات
وہ شمعِ بزمِ معرفت — وہ آگہی کی روشنی
وہ جس کی چشمِ پاک بیں کی جنبشوں سے کل تلک ٹھہر رہی تھی زندگی
سیاستوں سے جس کی تھک گئے سفید قوم کے دماغ
دہانِ حلقہ ہائے زنگ خوردہ کھل گئے — !
جبیں سے داغہائے لعنتِ غلامی دھل گئے — !
نئی شعاعیں ہند کے افق سے پھوٹنے لگیں — !!
جہاں میں جس کا نعرۂ "عدم تشدد" آج تک بنا رہا نشانِ راہ
خود اس پہ آج ظلم اور تشدد اپنا وار کر گئے — !
لئے ہوئے جبینِ تابناک پر طلوعِ آفتابِ عصرِ نو
سروشِ غیب آج خاکیوں کے دستِ خونچکاں سے گود میں عدم کی سو گیا — !!

—

وہ ہر نظر کا طور تھا
ہر ایک دل کا نور تھا
معلم و مدبر و مجاہد و غیور تھا
نفاق و شر کی آگ سے ہزاروں کوس دور تھا
فضیلتوں، بصیرتوں، محبتوں کا پیکرِ جمیل
بشر کی عظمتوں کا، رفعتوں کا سنگِ میل
لبوں کی جنبشوں میں سحرِ سامری نطقِ موسوی کی گم شدہ کرامتیں
دل و دماغ — جس کی وسعتوں میں ایشیا کی عظمتِ کہن رہی جواں
ہزاروں زخم خوردہ، مضمحل دلوں کو جس کے پاک نور نے دکھائی زندگی کی راہ
ہزاروں بن گئے نفوس جس کی آس پر ابھر رہی تھی زندگی کی سیلِ تند و تیز میں
وہ آس ختم ہو گئی — وہ روشنی چلی گئی !!
پیمبرِ سکونِ آشتی و اتحاد ایک دستِ تنگ ظرف و کم سواد سے فنا کا جام پی گیا — !!!

—

کدھر بڑھے یہ کارواں — ؟ یہ قافلہ چلے کہاں — ؟
ہزاروں پرچم بلند اپنی نرم چھاؤں میں کھا رہے ہیں سبز باغ
تسلیاں سی دے رہے ہیں بے شمار نقشِ پا
مگر کسی کا اعتبار کیا — ؟
ترے بغیر کون غم زدہ دلوں کا آسرا بنے — ؟
مگر نہیں! یہ کس نے کہہ دیا کہ تیرا آسرا نہیں ؟؟
امر ہے! جاوداں ہے تو!! فنا تری فنا نہیں!!
ترے پیام — ترے زرنگار اصول
ہنوز شمعِ راہ بن کے دیں گے حق پرستیوں کا درسِ جاوداں — !
ترے عمل کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی کائنات — !!
انھیں شعاعوں کے سہارے کاروانِ زندگی بڑھے چلے — !!
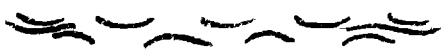
اردو سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء

بیٹھے ہوئے (دائیں سے بائیں) سید ظہیرالدین علوی (منیجر علیگڑھ میگزین) خورشیدالاسلام - ڈاکٹر ابواللیث صدیقی - رشیداحمد صدیقی (سنسر علیگڑھ میگزین) آل احمد سرور (لکھنؤ یونیورسٹی) اختر انصاری - ڈاکٹر مسعودحسین خاں - معین احسن جذبی -

ایس، ایم، شفیع

شعبہ کامرس کے صدر، اور سرسیدھاں کے محبوب ترین پروووست

اسرار الحق مجاز

تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا

دردِ غمِ حیات کا درماں چلا گیا — وہ خضرِ عصر و عیسیٔ دوراں چلا گیا
برہم ہے زلفِ کفر تو ایماں ہے سرنگوں — وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا
بیمارِ زندگی کی کرے کون دل دہی — نبّاض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا
کس کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی — وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا
وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا — وہ غمگسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا
اب کافری میں رسم و رہِ دلبری نہیں — ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا
اک بیخودیِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا — اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا
با چشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات — زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا
اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش — ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا
اب سنگ و خشت و خاک و خذف سر بلند ہیں — تاجِ وطن کا لعلِ درخشاں چلا گیا
اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغِ خوں چکاں — خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا
دیوِ بدی سے معرکۂ سخت جاں سہی — یہ تو نہیں کہ زورِ جواناں چلا گیا
کیا اہلِ دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا — کیا عزمِ سرفروشیٔ مرداں چلا گیا
کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی — کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا
کیا وہ جنون و جذبۂ بیدار مر گیا — کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

جوش ملیح آبادی

اٹھو کہ نو بہار ہے

پہلی آواز

وطن کے روئے پاک پر ہے آب و رنگِ سروری
قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تونگری
شکوہ بحرِ ہند کا، ہمالیہ کی برتری
وطن کے طول و عرض کی پیمبری و داوری
ہجوم در ہجوم ہے، قطار در قطار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

نشانِ صولتِ وطن مچل رہا ہے کوہ پر
دمک رہے ہیں بام و در چھلک رہے ہیں بحر و بر
چمک رہی ہے زندگی، چھلک رہا ہے جامِ زر
چلیں نہ رند کس لیے زمیں پہ سینہ تان کر
کہ آج طرفہ جیت کا گلے میں تازہ ہار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

سنا رہی ہے زندگی، سرور کی کہانیاں
مچل رہی ہیں عصرِ نو میں تازہ کامرانیاں
برس رہی ہیں عرش سے رسیدہ شادمانیاں
ابل رہی ہیں فرش سے دمیدہ نوجوانیاں
روش روش نکھار ہے، چمن چمن سنگار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

حیاتِ نو کے زمزمے ہیں کوئے مے فروش میں
حواس میں زمین ہے نہ آسمان ہوش میں
ترنگ ہے شباب پر امنگ ہے خروش میں
اٹھاؤ جامِ زر فشاں کہ باغ نائے و نوش میں
ہزار ہے، چنار ہے، نگار ہے، ملار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

دوسری آواز

یہ بیونت اور یہ کتر، یہ کانٹ چھانٹ ابتری
شناوروں کی ڈبکیاں مجاہدوں کی بے پری
یہ کوہکن کی ہچکیاں یہ پیرزن کی تھرتھری
لباسِ بذل و جود میں چھپی ہوئی یہ قیصری
شگفتہ برگ ہائے گل کی تہ میں نوکِ خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے
یہ مقبلوں کی دشمنی، یہ مفلسوں کی جاں کنی
یہ امن سوز شیخیت، یہ کینہ ور برہمنی
بدی، برائی، بے رخی، بگاڑ، بحث، بدظنی
کشیدگی، رمیدگی، عناد، بغض، دشمنی

ہمارے نئے شیخ الجامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

اٹھو کہ نو بہار ہے

اٹھو کہ اس زمین کو ہم آسماں بنائیں گے
عمارتوں کو پھونک کر، عمارتوں کو ڈھائیں گے
نشیب کو ابھار کر، فراز کو جھکائیں گے
سفینہ بھر نور ہیں ... زور سے چلائیں گے
اگرچہ اپنے گرد و پیش آج موج نار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے
ہماری جستجو میں ہیں رواں، جہاں پناہیاں
فلک کی شہریاریاں، زمیں کی کج کلاہیاں
ہم اور لب طلبے ولی، یہ دل شکن جماہیاں
ہر اک قدم پہ ہیں تو ہوں تباہیاں سیاہیاں
تباہیوں سیاہیوں میں صبح زرنگار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے
ارے بتاؤ کون ہے یہ زندگی کا نغمہ خواں
یہ کس کے دل کی گونج سے لرز رہا ہے آسماں
یہ کس کا حرف گرم ہے، ستارہ بار و مہ چکاں
ارے یہ کون بھر رہا ہے، دو دلوں کی بجلیاں
یہ شاعر حیات ہے، یہ جوشؔ بادہ خوار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

جوشؔ ملیح آبادی

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل

رواں ہے قافلۂ بے درا و بے مقصود
جو دل گرفتہ ہیں راہی تو رہنما غافل

یہ اضطراب، یہ شوقِ عروس آزادی
اٹھا کے دیکھ تو لینا تھا پردۂ محمل

یہ بات کہ کے ہوا ناخدا الگ مجھ سے
یہ ہے سفینہ، یہ گرداب ہے، وہ ہے ساحل

سنا رہا ہوں بہ رنگ غزل زمانے کو
حکایت غم دوراں، فسانۂ غم دل

حفیظؔ ہوشیارپوری

غضب کا خلفشار ہے، بلا کی گیرو دار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

قتال خون و جنگ ہے، جنونِ قہر و جبر ہے
گرج ہے بات بات میں فساد شہر شہر ہے
فضا میں رقص مرگ ہے، زمیں پہ موج زہر ہے
سیاہیوں کا زور ہے، تباہیوں کی لہر ہے
کماں میں تیر حرب ہے، کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

یہ لٹتیں، یہ رشوتیں، یہ پگڑیاں" یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں، اور اس پہ سینہ زوریاں
سبک گراں فروشیاں، ذلیل نفع خوریاں
ادھر غلا ہے بھوک کا، ادھر بھری ہیں بوریاں
نہ پیٹ میں نوالہ ہے، نہ تن پہ ایک تار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

ادھر مہا مہنت ہیں، ادھر کبیر امام ہیں
وہ تنگیوں میں پختہ ہیں، یہ وسعتوں میں خام ہیں
مہاجنوں کے جال ہیں، ریاستوں کے دام ہیں
عوام کا شمار کیا، عوام کالا نام ہیں
مویشیوں میں آج تک عوام کا شمار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

تیسری آواز

میاں یہ وقت جشن ہے، مناظرہ سے فائدہ
محل رقص و وجد ہے کہ راستہ تو پا لیا
فضا سے ابر چھٹ گیا، ہوا کا رخ بدل گیا
جو دل میں ہے حسینیت، تو کیا بلا ہے کربلا
وہ کل بنے گی برگِ گل جو آج نوکِ خار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

ہے کہ جو بچھڑ گئے ہیں، راستے پہ آئیں گے
تڑپ کے ایک دوسرے کو پھر گلے لگائیں گے
بہم گر حریف تھے، یہ بات بھول جائیں گے
کھلیں گے گنگنائیں گے، ہنسیں گے، مسکرائیں گے
یہ آرزوئے دہر ہے، یہ حکم روزگار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

اٹھو دریچہ کھل گیا وہ منزلِ فراز کا
وہ غزنوی کے قصر میں دیا جلا ایاز کا
سرا ملا وہ عقدہائے گیسوئے دراز کا
چمن پہ رنگ چھا گیا وہ چشم نیم باز کا
رقیب غم نصیب ہے، حبیب غم گسار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

ان کے لوہے کے در پر کلیساؤں کے پادری پاسباں تھے
وہ امیروں کو جنت کے پروانے اور مفلسوں کو
صبر و شکر و سکون اور روحانیت کا سبق دے رہے تھے۔
اور وہ ماسکو کا کریملین ہے۔
جس کے ماتھے کا روشن ستارہ
سرخ کرنوں کی تنویر برسا رہا ہے
اس کے اندر ابھی کل تلک
روس کے زار کھیتوں اور کارخانوں کے مالک روئی فولاد
تیل اور بارود کے بین الاقوامی بیوپاری بیٹھے ہوئے سازشیں
کر رہے تھے۔؎

میں صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
آج دلی کی آواز بھی سن رہا ہوں
جس کے سینہ پر ظالم فرنگی حکومت کا ایک بوجھ رکھا ہوا تھا
آہ! یہ میری اپنی ہی آواز ہے
میرے اہلِ وطن کے دلوں کی صدا ہے
جو ہمارے گلوں میں
ایک زخمی پرندے کی مانند
ڈیڑھ سو سال تک پھڑپھڑاتی رہی ہے۔
اب نہ وہ بابل و نینوا کے شہنشاہ ہیں
اور نہ وہ مصر کے سرپھرے اور مغرور فرعون ہیں
اور نہ روم و یوناں کے بردہ فروش
اور نہ خونخوار چنگیز و تیمور
اب نہ بسٹیل کے پاسباں
اور نہ وہ روس کے زار ہیں
اور نہ دلی کے خود سر فرنگی
صرف ان کے مظالم کی اک خوں بھری داستاں رہ گئی ہے

(۲)

آج دلی کی کھوئی ہوئی رفعتیں اس کو پھر مل گئی ہیں
اس کا مکھڑا خوشی سے دمکنے لگا
جس کی تنویر سے ایشیا جگمگایا ہوا ہے۔
کتنے ہی تخت دیکھے ہیں اس نے
کتنے ہی تاج پہنے ہیں اس نے
اس کے سینے پر کتنے ہی شاہوں کے نقشِ قدم ہیں
کتنی تہذیبیں کتنے تمدن
اُس کی آغوش میں سو رہے ہیں
کتنے ٹوٹے ہوئے آفتاب اور مہتاب
اس کے کھنڈروں میں بکھرے پڑے ہیں
کتنے ہی گیت کتنے ہی نغمے
اس کی شانوں میں الجھے ہوئے ہیں
اس کے ماتھے پہ سورج بھی چمکا
چاند جگمگایا

؎ ماخوذ از کارل سینڈ برگ (امریکا)

جشن آزادی

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہوں
کتنے پر ہول المناک افسانوں کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہوں
کتنے ہی جشن، کتنی ہی عیدیں
میری یادوں کے دامن میں محفوظ ہیں
ظلم اور جبر کی خون بھری داستانیں
بادشاہوں کی جنگی حکایات
دیو پریوں کے قصّے کہانی
انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے
میرے ہونٹوں پر سوئے ہوئے ہیں
میں انھیں جب بھی چاہوں جگا لوں۔
مجھ کو معلوم ہیں بابل و نینوا کے کھنڈر
وہ فرات اور دجلے کی موجیں جنھیں لوریاں دے رہی ہیں
کس لیے آج ویران ہیں
ان میں ان مطلق الحکم شاہوں کے ایوان تھے
جن کے ہونٹوں کی جنبش
موت کی ہمزباں تھی
ساحل نیل پر وہ ابوالہول سکتے کے عالم میں اب تک کھڑا ہے

مصر کے سربلند آسماں بوس اہرام مبہوت ہیں
علم و تہذیب کی اس پرانی زمیں پر
سر پھرے اور مغرور فرعون چھائے ہوئے تھے
جو خدا بن کے انسانوں کو لوٹتے تھے۔
اور وہ یونان کے قصر ہیں
روم کے اونچے اونچے ستون ہیں
وہ بھی اک داستان کہہ رہے ہیں
ان کے سایہ میں بردہ فروشی کے بازار تھے
جن میں انسان انسان کو بیچتا تھا۔
وہ سمرقند کے سبز گنبد
اور بخارا کے ایوان ہیں
جن پر خونخوار تاتاریوں کی اڑائی ہوئی گرد بیٹھی ہوئی تھی
اُف یہ چنگیز اور تیمور کی عیش گاہیں
ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلی ہوئی آدمیت کی
مظلوم چیخوں سے گونجی ہوئی تھیں۔
اور وہ بسٹیل کے قید خانے کی دیواریں
جن کی اینٹیں شرابی زناکار جاگیرداروں پہ جی کھول کر
ہنس رہی ہیں۔

یہ تیرے سرسبز و شاداب میدان یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں
یہ تیری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیاں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیاں ہیں
ان کو اپنے گلے سے لگا لے
تو اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپا لے
دیکھ یہ اپنے خونیں کفن ہیں
تیرے لاکھوں شہیدوں کی روحیں کھڑی ہیں
جو تجھے تہنیت دے رہی ہیں
ان کی آنکھیں مسرت کے اشکوں سے نمناک ہیں
لیکن ان کے گریبان ابھی چاک ہیں
ان کو اپنی محبت سے سی دے

(۴)

ڈیڑھ سو سال کے بعد ہندوستان کا علم آج پھر کھل رہا ہے
پرچموں سے کہو کھل کے انگڑائیاں لیں
فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جمائیں
فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں
توپیں ہندوستان کی سلامی اتاریں
اور طیاروں کو حکم دو
آسمانوں پر جھپٹیں
اپنے مضبوط فولاد کے شہپروں کو ذرا آزمائیں
چاند تاروں کو آکاش سے توڑ لائیں
کشتیاں اپنے لپٹے ہوئے بادباں کھول دیں
اور جہاز اپنے لنگر اٹھائیں
سینۂ بحر سے شاہی جھنڈا اٹھا کر
اپنے جمہوری جھنڈے اڑائیں۔
بچے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں
مائیں اشکوں سے بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں
دیویاں مانگ میں اپنی سیندور بھریں
بیبیاں اپنے ہاتھوں پر افشاں لگائیں
ناچیں ناچیں اجنتا کی شہزادیاں
اور ایلورا کی پریاں
اپنی صدیوں کی خاموشی کو توڑ کر گیت گائیں۔
کیتکی اور چمپا کی کلیاں
اپنی خوشبو بکھیریں
اور ہمالہ کی جھیلوں میں ہنستے ہوئے سرخ و دلکش کنول
اپنی نازک ہتھیلی پر رنگین شمعیں جلائیں
وادیاں مسکرائیں
کھیتیاں لہلہائیں
کوہسار اپنے سینوں کی دولت نکالیں
آبشار اپنی قوت دکھائیں
کانیں اپنے خزانوں کے در کھول دیں
اور ہندوستان کے قدم پر

غم کی گھنگھور کالی گھٹائیں بھی چھائیں
دکھ کی راتیں بھی بیتیں
سکھ کی صبحیں بھی آئیں
یہ مگر اک نئے عہد کی اک نئی نسل کی منتظر تھی۔
میری دلّی
میری محبوب دلّی
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ اور خود کام جاگیرداروں
کی لونڈی نہیں ہے
غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے
تو ہماری امیدوں کا مرکز، خوابوں کی تعبیر ہے
آرزوؤں کی تصویر ہے۔
تیرے چہرہ پر میں آج ایک نور سا دیکھتا ہوں
جیسے تیری جبیں پر کروڑوں ستارے سمٹ آئے ہیں۔
یہ اشوک اور اکبر کے عہد حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے
بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے۔
دیکھ ہندوستان کے کروڑوں سپوتوں کی نظریں
آج تیری طرف اٹھ رہی ہیں
یہ ہماری نگاہوں کی کرنیں ہیں جو تیرے رخ پر نور کا
جال سا بن رہی ہیں
روٹیوں کے لیے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کے ٹکڑے کی خاطر کھڑے ہیں
ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ
یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں
تیرے ہندوستان کے بہادر سپاہی ہیں جو انقلاب اور بغاوت
کی پگھلی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں
ننگی تلواروں کی دھار پر چل چکے ہیں
یہ تیری مملکت کے طرفدار ہیں
تیری قسمت کے معمار ہیں
تیری آزادی کے پاسبان ہیں
یہ ان ہی کے رگوں کا لہو ہے
تیرے ماتھے پر جو آج رنگ شفق اور ہتھیلی پر رنگ حنا بن گیا ہے

(۳)

جاگ ہندوستان اب خواب گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے
تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آ رہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانوں کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں بٹھا لے
یہ ہمالہ ہے یہ بندھیاچل یہ نیلگری
یہ تیرے کھیت ہیں تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ باغ ہیں یہ تیرے کارخانے

معین احسن جذبی

نیا سورج

بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج — ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا — نئے بل، نئے زور اُن کو سکھائے
لباس زری آبشاروں نے پایا — نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اُڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر — یہ ہیں آج سب آب زر میں نہائے

مگر ان درختوں کے سایے میں لے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سرد، بے حال، بے دم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے

ارے او نئی شان کے میرے سورج — تری آب میں اور بھی تاب آئے

ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے؟
جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو جو سمٹے ہوؤں کو
حرارت بھی بخشے، گلے بھی لگائے

۲

بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج — ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
فضاؤں میں ہونے لگی بارشِ زر — کوئی ناز نیں جیسے افشاں چھڑائے

اپنے لعل و جواہر نچھاور کریں
آہنی کارخانوں سے کہہ دو
اپنے پہیوں کی رفتار کچھ تیز کردیں
اور نغموں کے طوفان اٹھائیں

(۵)

آسماں پر چمکتے ہوئے صبح آزادی کے سرخ سورج
تو ہمیں دور سے کس لئے دیکھتا ہے
آ، ہماری زمین پر اُتر آ
تیرے سینہ میں وہ روشنی اور حرارت نہیں ہے
جو ہمارے دلوں میں
تیرے ماتھے پر رنگ شفق ہے
اور ہماری جبین پر ہمارے شہیدوں کا خوں ہے
روشنی تیری کرنوں کی سطح زمین تک
اور ہماری نگاہوں سے دل کے کنول جل رہے ہیں
تو فقط صبح نور کا پیمبر
ہم نئے عہد کے ترجماں ہیں
اپنے آکاش کے اونچے آسن پر بیٹھے ہوئے دیوتا
تو کروڑوں برس سے
اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے
ایک ہی راہ پر صبح سے شام تک شام سے صبح تک
چل رہا ہے
آ ہماری زمین پر اُتر آ
دو گھڑی ہند کے سبزہ زاروں میں آرام کر لے
اپنی جھولی کو پھولوں سے بھر لے
اور اپنے سفر پر چلا جا۔
مجھ کو معلوم ہے ایشیا اور یورپ کی راتیں
تیرے انوار کی منتظر ہیں
جا اور اُن کو نئے نور سے جگمگا دے
ان کی گردن میں ہندوستاں کے چمن کے مہکتے ہوئے
تازہ پھولوں کے گجرے پہنا دے!!

وہ ایک تم ہو کہ تکمیلِ جلوہ پر نازاں
وہ ایک ہیں کہ تصور بھی کامیاب نہیں
حریم ناز کے پردے تمہیں مبارک ہوں
نگاہِ شوق کو مجبوریِ حجاب نہیں
آرزو

خلیل الرحمن اعظمی

صبح آزادی

ابھی ہیں آس لگائے یہ زیست کی راہیں
کبھی تو غم کے چراغوں سے پھول برسیں گے

یہ دھوپ چھاؤں، یہ ہلتے ہوئے حسیں پردے
یہ اک غبار سا چھایا ہوا فضاؤں پر
یہ آرزوؤں کی دنیا میں سرمئی بادل
ہے اک نیند سی طاری ابھی ہواؤں پر

ابھی تو اُن کی طرف سے پیام آیا تھا
ابھی تو کان میں گونجے تھے دور کے نغمے
مگر فضا میں یہ کیوں ہیں سکوت کی لہریں
طویل خواب میں شاید ہیں آج ویرانے

کبھی کبھی تو امیدوں کا جال ٹوٹا ہی
مگر نگاہ میں پھرتی رہی وہ اک تصویر
دل حزیں نے پرانے غموں سے اکتا کر
بنا لی اپنی محبت کی اک نئی تصویر

دمکنے لگے یوں خلاؤں کے ذرّے کہ تاروں کی دنیا کو بھی رشک آئے

ہمارے عقابوں نے انگڑائیاں لیں سنہری ہواؤں میں پر پھڑپھڑائے
فسردوں تر ہوا نشۂ کامرانی تجسس کی آنکھوں میں ڈورے سے آئے
قدم چومنے برق و باد آب و آتش بصد شوق دوڑے، بصد عجز آئے
مگر برق و آتش کے سایہ میں اے دل
یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
یہ صدیوں کے پربستہ برباد طائر
یہ ہیں آج بھی مضمحل، دل گرفتہ
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے
ارے او نئی شان کے میرے سورج تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے؟
انھیں پنجۂ تیز سے جو بچائے
انھیں جو نئے بال و پر آ کے بخشے
انھیں جو نئے سر سے اڑنا سکھائے

۱۵ اگست

سحر قریب ... سہی شب کا آخری لمحہ

جلو میں اپنے لیے ہے ... زار ظلمات منہاج الدین

دھوئیں کی گود میں سوتا ہے اب بھی رقصِ شباب
ہوس نے سازِ جوانی پہ گیت گائے ہیں
دعائے نیم شبی، یہ طلسم آہوں کا
ابھی تو ذہن پہ تاریکیوں کے سائے ہیں

فروغِ حسن وہ صہبائے آتشیں کا گداز
ضیائے ماہ میں اب بھی نزولِ شبنم ہے
اگرچہ دیدنی ہے گیسوؤں کی آرائش
مگر ابھی تو مری کائنات برہم ہے

مسرتوں کو نیا آئینہ دکھانا ہے
ابھی جہاں میں لہو کے چراغ جلنے دو
انہیں آنسوؤں ہی سے نکھرے گی شاہراہِ حیات
ابھی تو تند ہے طوفاں مجھے سنبھلنے دو

ذوقِ نظر کی زد میں ہیں دونوں جہاں کی ظلمتیں
گل نہ کرو چراغ ابھی اپنے حریمِ ناز کا

(آرزو)

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض، چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

۲

کون آزاد ہوا ؟
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی ؟
میرے سینہ میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

ہم کہاں جائیں کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں غلامی کے گنہگار ہیں ہم

طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینہ میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو
اب بھی زندانِ غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

۳

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور جوانوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سرخ پرچم افق صبح پہ لہراتے ہیں

اور اس بار بھڑکتے ہیں فضا میں شعلے
شور و ہنگامہ ہے برپا افق عالم پر
ہم نفس! مقتلِ ہستی کو ذرا غور سے دیکھ
جس کو بیکار سمجھتا ہے زمانہ وہ کہیں

دیکھنا! ہم نفسو، یہ کوئی گلزار نہ ہو
یہ کسی طائر فردوس کی چہکار نہ ہو
کہیں اس پردۂ خوں میں کوئی گلکار نہ ہو
لیلیٰ امن کا دہکا ہوا رخسار نہ ہو

یہ قیامت سی اٹھاتی ہوئی دنیا کی روش
کسی معشوقۂ طناز کی رفتار نہ ہو

اختر انصاری

س، ج

فریب آزادی

ناگہاں شور ہوا
لو شب تارِ غلامی کی سحر ہوتی ہے
بجلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے۔
راہزن ہار گئے
راہرو جیت گئے

قافلے دور تھے، منزل سے بہت دور، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے۔
چن لیا راہ کے روڑوں کو خزف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہزن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہم نشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبر قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگئ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے
درو دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں، امنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خون میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنہیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو! راہزنو!!
اپنے ایوانِ حکومت میں سجا لو، ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگا لو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی

قاضی عبدالودود

مقالات

غالب کی راست گفتاری

غالب کے دوست ہوں یا دشمن اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ غالب نے خودستائی میں بخل سے کام نہیں لیا۔ صوری اور معنوی محاسن میں سے کم ایسے ہیں جن کا وہ اپنی ذات کو جامع نہ سمجھتے ہوں اپنی جن خوبیوں کو انھوں نے اجاگر کر کے دکھایا ہے ان میں راست گفتاری بھی ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں کبھی جھوٹ نہیں بولتا" (اردو[1] صفحہ ۳۷)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

راست گفتارم و یزداں نہ پسند دجز راست   حرف ناراست سرودن روش اہرمن است (نظم صفحہ ۲۴۸)

اپنے متعلق غالب کے اس دعوی کو ان کے کل سیرت نگاروں نے بہ استثنائے بعض قبول کر لیا ہے حالی غلام رسول مہر اور امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے اقوال ملاحظہ ہوں:

"حالانکہ ایشیائی شاعری جس کی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے مرزا کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی باوجود اس کے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے" (یادگار غالب مطبوعہ انوار احمدی الہ آباد صفحہ ۹۶)

"واللہ الحمد کہ سادہ دل و راست گفتارم آفریدہ اند ہر چہ در دل داشتم بہ زبان بازگفتم" ان چند لفظوں میں ان کے اخلاق کی پوری تصویر آگئی ہے" (غالب مصنفہ مہر اشاعت ثانی صفحہ ۳۴۶)

---

[1] اس مقالہ میں رموز ذیل مستعمل ہوئے ہیں: اردو = معلی مطبع کریمی لاہور = اردو، عود ہندی طبع انوار احمدی الہ آباد = عود، کلیات نثر فارسی طبع اول = نثر، کلیات نظم فارسی طبع سوم لکھنؤ = نظم، غیاث اللغات = غیاث، تیغ تیز مصنفہ غالب = تیغ، موید برہان = موید، فرہنگ جہانگیری فرہنگ، درفش کاویانی = درفش، قاطع برہان کی اشاعت اول = قاطع، برہان قاطع مطبع طبی کلکتہ = برہان

جگرمرادآبادی

آجکل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

سازِ حیات ساز شکستہ ہے ان دنوں
بزمِ خیال جنبـ[illegible] ویراں ہے آجکل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سایہ سے بھی گریزاں ہے آجکل

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنجِ [illegible]اں ہے آجکل

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

جس کا ہے نام زیست وہ مشکل ہے ان دنوں
کہتے ہیں جس کو موت وہ آساں ہے آجکل

دہلی و دہرہ دون و نواکھالی و بہار
انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آجکل

جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں؟
فسطائیت حقیقتِ عریاں ہے آجکل

اخلاق ایک فن ہے جو عصرِ جدید میں
اندازِ حسن بن کے نمایاں ہے آجکل

سونی پڑی ہے روحِ صداقت کی انجمن
چہرہ منافقت کا گلستاں ہے آجکل

کیسا خلوص، کس کی محبت کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آجکل

جو تھا زبان پر وہ ہوا بن کے اڑ گیا
جو دل میں تھا حقیقتِ عریاں ہے آجکل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آجکل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی
انسان کے لباس میں شیطاں ہے آجکل

کچھ رہبرانِ خاص جو مخلص ہیں واقعی
اُن کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آجکل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آجکل

ہے اس سے ان کی گمنامی اور رئیس کا روشناس اور اکابر شہر کا آشنا نہ ہونے کی سراسر تکذیب ہوتی ہے رام پور میں غالب کو یہ باتیں کسی سے معلوم ہوئی ہوں صد درجہ مستبعد ہے:

"عزت تخلص مولوی غیاث الدین صاحب قدس سرہ خلف الرشید مولوی جلال الدین صاحب اپنے والد کے شاگرد رشید تھے مولوی غلام جیلانی رفعت سے مستفید تھے تصنیفات سے شوق تھا... غیاث اللغات منتخب العلوم جس میں چالیس رسالے چالیس علم میں ہیں خلاصۃ الانشا، رسالۂ عروض و قافیہ، افسانۂ باغ و بہار، شرح مثنوی غنیمت شرح سکندر نامہ شرح ابوالفضل، شرح گل کشتی شرح بدر چاچ، مجربات غیاثی، جواہر التحقیق، ازالۂ اغلاط عربی و فارسی ہیں، خواص الادویہ یہ سب ریختۂ کلک جواہر سلک موجود ہیں اور سوا ان کے اور بھی منشآت تھے کہ دستیاب نہیں ہوتے.... نواب محمد یوسف علی خاں بہادر اور بندگان دارا دربان[۳] .... کو ان سے تلمذ ہے فن طب کے بھی خوب ماہر، ورع و تقویٰ ان کا کالشمس فی رابعۃ النہار ظاہر طب میں مولوی نور الاسلام کے شاگرد رشید ایسی ذات مستجمع الصفات نہ دیدہ نہ شنیدہ عنبر شاہ اور کبیر خاں سے بھی کچھ استفادہ فرمایا ہے بہت سے استادان کامل سے فیض اٹھایا ہے بائیسویں ماہ ذی حجہ کو بارہ سو اڑسٹھ ہجری میں.... انتقال فرمایا" صفحہ ۲۲۶

غیاث کو میں نے باستیعاب نہیں دیکھا کہ اس کے متعلق اظہار رائے کر سکوں لیکن یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ایران کے مسلم الثبوت محقق قزوینی نے المعجم فی معاییر اشعار العجم[۴] کے دیباچے میں اسے "فرہنگ نفیس" کہا ہے غالب کی عداوت کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ صاحب غیاث کے ہم عصروں[۵] میں بہت سے لوگ انھیں فارسی داں سمجھتے تھے اور فارسی دانی کے متعلق غالب کا خیال تھا کہ

"این آیہ خاص است کہ بر من شدہ نازل"

(۲) غالب اور غلام امام شہید میں شناسائی تھی۔ فارسی کے ایک خط میں جس کے مکتوب الیہ سراج الدین احمد ہیں، اور جو بظاہر اس زمانہ کا ہے جب غالب کا دیوان اردو پہلی یا دوسری بار چھپا تھا، ان کا نام بڑے ادب

---

[۳] نواب کلب علی خاں مراد ہیں [۴] المعجم فی معاییر اشعار العجم اور اس کا دیباچہ ابھی حال میں میری نظر سے گزرا ہے اس سے پہلے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب سے میں نے سنا تھا کہ قزوینی نے غیاث کی تعریف کی ہے۔

[۵] تفتہ جو غالب کے خاص تلامذہ میں تھے صاحب غیاث کے معتقد تھے (اردو صفحہ ۲۶۲)

"لغو گوئی سے پرہیز... جھوٹ اور تکلف سے نفرت... اُن کا شعار تھا" (دیباچہ مکاتیب غالب نوشتہ عرشی، اشاعت ثانی صفحہ ۳۱)

میں یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتا کہ انسان کے لیے ہر حال میں سچ بولنا ضروری ہے یا نہیں میری غرض صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب کا یہ دعویٰ کہ "کبھی جھوٹ نہیں بولتا" کہاں تک صحیح ہے۔

(۱) آغا احمد علی نے مؤید میں (صفحہ ۱۱) غالب پر ایک اعتراض کے سلسلے میں لکھ دیا تھا کہ "غالب عربی داں را غیاث گم کردہ باشد" غالب تیغ (صفحہ ۱۶) میں جو مؤید کا جواب ہے صاحب غیاث کی نسبت رقم طراز ہیں:

"اگر غالب جامع غیاث اللغات کو آدمی جانتا ہو تو وہ خود آدمی نہیں ایک بار... اس کتاب کو سراسر دیکھ لیا جب دیکھا کہ ماخذ اس کا فن لغت میں چار شرحیں[۲] اور نہر الفصاحت ہے کتاب پر اور مؤلف پر لعنت بھیجی مدرس جی اتنا نہ سمجھے کہ جو میاں[۳] انجو کو نہ مانے گا وہ میاں جی غیاث الدین کو کیا جانے گا۔ بارے جب رام پور جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے صاحبزادگان عالی تبار اور رؤسائے نامدار سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں تو اس شخص کا حال یہ معلوم (کذا)، کہ ایک ملائے مکتب ارتقانہ رئیس کا روشناس اور نہ اکابر شہر کا آشنا ایک گمنام ملا مکتب دار چند صاحب مقدور لڑکے اس کے مکتب میں پڑھتے تھے انھوں نے صرفِ زر میں اس کو مدد دی، غل بندر کے کہ جس نے نجار کی تقلید کی تھی ایک فرہنگ لکھ کر چھپوائی ہے۔"

انتخاب یادگار امیر مینائی نے نواب کلب علی خاں کے حکم سے لکھی تھی اس کا "مادّہ تالیف" بقول امیر مینائی خود نواب کا مہیا کردہ ہے یہ بات انھوں نے اس کے دیباچے ہی میں نہیں لکھی (صفحہ ۵) ان کے ایک مطبوعہ خط سے بھی جو ثاقب[۴] کے مرتبہ مجموعے میں ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے صاحب غیاث کا ترجمہ جو اس کتاب میں

---

[۲] یہ کتابیں قتیل کی ہیں جس سے غالب کو بغض للّٰہی ہے

[۳] عضد الدولہ جمال الدین حسین انجو صاحب فرہنگ جہانگیری سے مراد ہے

[۴] یہ کتاب اس وقت پیشِ نظر نہیں

(۲) مولوی غلام غوث خاں بے خبر مخلص خالص الاخلاص ہیں، ہرگز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں البتہ اس کو خوشگو جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں .... باطل است آنچہ مدعی گوید۔ مدعی اپنے زعم میں مجھ کو اپنا ہم فن جان کر حسد کرتا ہے میں امیر علی شہر جیسا محتسب اور مولوی جامی جیسا مفتی کہاں سے لاؤں جو نیاؤ کرے اور کاذب کو سزا دے شکر ہے خدا کا کہ تم سخن ور اور سخن داں ہو اور یقین ہے کہ قلمرو ہند میں اور بھی ایسے آدمی ہوں گے کہ میرے اور مدعی کے رتبے کو ممیز ہو سکیں گے مصرع:

عید است بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

خاک بفرقش، فلک ظرف اور آفتاب مظروف ہے یہ شخص ظرف کو مظروف اور مظروف کو ظرف ٹھہراتا ہے ... اس سے بڑھ کر ایک اور خدشہ ہے یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ شرط ہے آفتاب و ساغر میں تدویر وجہ شبہ ہے، شراب اور فلک میں وجہ تشبیہ کہاں؟ (اردو صفحہ ۳۷۹)

پہلا خط ۱۸۶۳ء کا ہے اور دوسرا ۱۳ صفر سال غفر یعنی ۱۲۸۰ھ کا ہے چونکہ بے خبر کو غالب نے یہ لکھا ہے کہ اس وقت ذکا کے تلمذ کو تین چار برس ہوئے ہیں اور انھوں نے ۱۲۷۹ھ میں تلمذ اختیار کیا تھا قریب بہ یقین ہے کہ ۱۲۸۰ھ کے خط کی شکایت ہوئی ہوگی اس میں شہید کا نام نہیں آیا لیکن مدعی سے وہی مراد ہیں۔ شہید نے کلب علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو اُن کے کلیات (طبع اول صفحہ ۱۲۰) میں موجود ہے غالب نے مطلع کے پہلے مصرع پر اعتراض کیا ہے جو دراصل یوں ہے۔

عید است و شیشہ شد فلک و ساغر آفتاب

اس کا دوسرا مصرع یہ ہے؛

از بادہ آفتاب تراود در آفتاب

غالب نے 'شیشہ' کی جگہ 'بادہ' لکھا ہے ممکن ہے کہ انھوں نے اسی طرح سنا ہو۔ یا بعد کو شہید نے مصرع میں اصلاح کرلی ہو مجھے حیرت اس پر ہے کہ ان خطوں کے لکھنے کے بعد غالب نے توہین آمیز الفاظ کے استعمال سے قطعی انکار کس طرح کیا۔ یہ خط اس کے بعد اردوئے معلی کے حصہ دوم میں چھپے ہیں اور اس وقت محفوظ ہوں گے شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ذکا آخر شاگرد ہیں یہ خط ان کے خلاف بہ طور ثبوت نہ پیش کیے جاسکیں گے اس کا

سے لیا ہے" بندگان والاشان مخدوم مکرم و مطاع معظم حضرت مولوی غلام امام شہید مدظلہ العالی" (نثر صفحہ ۵،
۱۲۷۳ھ میں ذکا غالب کے شاگرد ہوئے (نثر صفحہ ۱۱۹)، غالب نے اپنے بعض خطوں میں ذکا کو شہید سے متعلق توہین آمیز
الفاظ لکھے۔ بے خبر کو جو غالب اور شہید دونوں کے دوست تھے اس کا علم ہوا تو بظاہر انھوں نے غالب سے اس
کی شکایت کی۔ غالب صاف مکر گئے؛

"مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات ہوئی تھی جب وہ دلی آئے تھے .... روز ملاقات سے اس دن
تک کہ حضرت دکن روانہ ہوں کوئی امر ایسا کہ باعث ناخوشی کا ہو درمیان نہیں آیا .... اگر خدانخواستہ....
رنج پیدا ہوتا آپ بہت جلد اصلاح بین الذاتین کی طرف متوجہ ہوتے اب سنیئے حال منشی حبیب اللہ کا۔
میں نے ان کو دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ تین چار برس ہوئے کہ ناگاہ ایک خط حیدرآباد سے آیا.... کہ میں
تلمذ اختیار کرتا ہوں .... بریلی اور لکھنؤ اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم و نثر.... بھیجتے رہتے ہیں۔
ہر ایک کا پایہ.... فن شعر میں معلوم ہو جاتا ہے، عادات و عندیات عدم ملاقات ظاہری کے سبب میں کیا جانوں؟
ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا بعد وارد ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل ان کی
آئی اور انھوں نے یہ لکھا کہ... شہید اکبرآبادی کی غزل پر غزل لکھ کر بھیجتا ہوں۔ میں نے لکھا کہ مولانا شہید
اکبرآباد کے نہیں، لکھنؤ اور الہ آباد کے ہیں اس سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی اس سے توہین کے
معنی مستنبط ہوں تو میں اس کا مستہین سہی اب میں نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا
اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا" (عود صفحہ ۱۶۷، اردو صفحہ ۲۱۲)۔ ذکا کے نام کے مطبوعہ خطوں میں
کوئی ایسا نہیں جس میں شہید کے وطن کی بحث ہو، گو یہ ممکن ہے کہ غالب نے ذکا کو کسی خط میں اس بات کے
متعلق لکھا ہو اور وہ خط نہ چھپا ہو۔ قابل اعتراض خط وہ ہیں جن کی ضروری عبارتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں

"اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد تھیل وہاں کو میں انا ولا غیری بجا رہے ہیں اور
سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں.... ایک شخص مجھ سے کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا، مگر
محی الدولہ نے چار سو روپے مہینا سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے (اردو صفحہ ۳۷۵)

لہ کلیات شہید مطبوعہ کا دیباچہ بے خبر نے لکھا ہے

غزلیات کے تحت اشعار ذیل پائے جاتے ہیں:

۱	اے دریغا کاسہ سر شد بہ فسوس	از بسبب ناشاندہ داد بہ بوس
۲	ساقیا گلشن از نسیم بہار	گشت آراستہ چو روئے عروس
۳	در قدح کن ز حلق بط خونے	ہم چو روئے تیغ و خون خروس
۴	رزم بر بزم اختیار مکن	مست ما را بخواں عشرت از فسوس
۵	ہرگز ابن یمین عوض نہ کند	نغمہ چنگ را بہ نغمۂ کوس

فرہنگ (جلد ۲ صفحہ ۴۹۲) میں شعر سوم و چہارم موجود ہے اس میں شعر سوم کا دوسرا مصرع یوں ہے "ہم چو رومی عذر چشم خروس" اور شعر چہارم اسی طرح ہے جس طرح محرق قاطع سے غالب نے نقل کیا ہے۔ غالب نے ایسا کوئی قطعہ جس کے قوافی فوس، فردوس اور ہوس (بہ فتحہ واو) ہیں نہیں دیکھا لیکن اپنے اس دعوی کو کہ ہوس بفتحۂ واو ہے مضبوط بنانے کے لیے انھیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہوا۔

(۴) لفظ "ہوس" کے متعلق لطائف غیبی کی جو عبارت (۲) میں نقل ہوئی ہے اس کے بعد یہ عبارت ہے "اور اسی قبیل سے یہ مصرع "درخانہ بجز شعلۂ آتیش نہ دارم" کہ جامع فرہنگ جہانگیری اس کو بہ تائے قرشت مکسور جانتا ہے معروف سمجھ کر تحتانی کو مشبع جانتا ہے۔ یہ مصرع استاد کے قطعے کا ہے جس کے قوافی عیش وطیش وحیش ہیں"۔

فرہنگ میں آتیش کوئی لغت نہیں اور نہ یہ مصرع لغت آدیش کے ذیل میں جہاں اس کے ہونے کا احتمال تھا موجود ہے صاحب موید نے البتہ آدیش کی بحث میں لکھا ہے:

"ازیں جاست کہ آتیش بہ یائے اشباع نیز آمدہ ہم چنیں از شعرائے متقدمین نظم کردہ:

وازبس کہ تنم سوختہ شد ز آتش فرقت درخرقہ بجز شعلۂ آتیش نہ دارم" (صفحہ ۴۳)

مابہ النزاع یہ ہے کہ آتش صرف فتحۂ تا سے ہے یا کسرۂ تا سے بھی ہے۔ غالب کو اصرار ہے کہ صرف فتحے سے صحیح ہے ان کے مخالف دونوں طرح صحیح مانتے ہیں۔ مخالفین کا دعوی ہے کہ اگر تا کا کسرہ صحیح نہیں تو اشباع کسرہ سے آتیش کیونکر پیدا ہوا غالب کو اس کے ابطال کا آسان طریقہ یہ نظر آیا کہ آتیش آتیش قرار پائے

بھی امکان ہے کہ غالب نے یہ خیال کیا ہو کہ بے خبر غالب کے انکار سے مطمئن ہو جائیں گے اور اس معاملے میں زیادہ چھان بین نہ کریں گے۔

(۳۴) غالب لطائف غیبی میں [illegible] کے قلم سے نکلا ہے ہوس کے متعلق لکھتے ہیں:

"... دکنی نے یہ واو مجہول لکھ کر جو [illegible] لوس لکھا ہے اس کا حمق ہے ... معنی [illegible] ... ایک شعر ابن یمین [illegible] ہ بہ طریق سند لکھتے ہیں:

[illegible] اختیار مکن　　　　[illegible] ما را بہ خوب ہنراں ہوس

... فرہنگ لکھنے والوں نے یہ شعر مصنف کی زبانی نہیں سنا دوسرا شعر بھی قطعے کا مرقوم نہیں جو ہم قطعے پر تصحیح اور تصدیق کی بنا رکھیں ... ابن یمین کا تین شعر کا قطعہ ہے فقیر نے دیکھا ہے مگر اب حافظے میں موجود نہیں اس میں ہوس بہ سکون واو ہے مگر مختہ ہائے ہوز بدستور بحال ... رہا اوپر کے دو شعروں میں قوس اور فردوس قافیہ ہے ہوس بر وزن کوس ہرگز نہیں (لطائف غیبی)

قاطع کی دوسری اشاعت میں کتاب کو درفش کاویانی کا خطاب دیا گیا ہے اس میں ہوس کے متعلق جو عبارت بڑھائی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں:

"شعر ابن یمین قطع نیست [illegible] است از قطعہ و قوافی این قطعہ قوس و فردوس است" (ص۴۷)

ایسا کوئی قطعہ نہ کلیات ابن یمین مخطوطہ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور کے قلمی نسخے میں ہے جو تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے اور نہ مطبوعہ کلیات مجلد اول میں ہے جو ایران سے شائع ہوا ہے اور جسے احتیاط کے ساتھ ایران کے ایک مشہور فاضل نے مرتب کیا ہے۔ مجلد اول قطعات، مثنویات اور رباعیات کے لیے مخصوص ہے اور اصناف سخن دوسرے مجلدات میں ہوں گے۔ قلمی نسخے میں ہر صنف سخن الگ الگ عنوانات کے تحت ہے اس میں

---

[۱] سعادت علی مصنف محرق قاطع برہان مراد ہیں [۲] مطبوعہ نسخہ اب تک میں نے نہیں دیکھا، اس کی ایک نقل سید وزیر الحسن کی دی ہوئی البتہ میرے پاس موجود ہے [۳] کلیات کی صرف پہلی جلد میں نے دیکھی ہے اور وہ بھی اس وقت میرے پیش نظر نہیں۔ باقی جلدوں کے متعلق مجھے علم نہیں کہ چھپیں یا نہیں جلد اول میں غزل و قصائد قطعاً نہیں۔ رباعیات کے بارے میں مجھے ٹھیک یاد نہیں۔

تھا ایسی بُری بات کو چرانا اور اپنا قول بنانا چوری اور سرزوری خیرہ رائی اور بے حیائی ہو یا نہیں؟ مصرع: "اے اہلِ عقل کوئی تو بولو خدا لگی" جواب کا بہ ابرام طالب غالبؔ

"عبارت کا مطلب مسروقہ بتایا جاتا ہے وہ صاحب موئید کی نہیں صاحب فرہنگ کی ہے اور اس میں لفظ آدیش کے تحت واقع ہے (فرہنگ جلد ا صفحہ ۳۵) آغا احمد علی نے اس کے متعلق فرہنگ کی مکمل عبارت نقل کرنے سے پہلے یہ لکھ دیا ہے "صاحب جہانگیری شیرازی چناں افادہ فرمودہ کہ" اور اس کے خاتمہ پر یہ الفاظ ہیں "تم افاضتہ" سرقے کا الزام، خواہ وہ فرہنگ سے ہو یا قاطع سے آغا پر کسی طرح عائد نہیں ہو سکتا۔

(۷) یہ بھی اسی کتاب میں ہے:

"درفش کاویانی کے ۵ اصفحے میں تحت تتبنہ دربارہ لغت آہنگ جو کچھ لکھا ہے خلاصہ اس کا یوں لکھا ہوں: "آہنگ را ماضی کشیدن قرار داد و برعایت توضیح معنی کشیدبراں افزود و پس درفعل آہنگیدن آورد و گفت مصدر آہنگ ست کہ بمعنی کشیدن باشد بعد نقل عبارت برہان میں نے لکھا ہے کہ قاعدہ دانان حسبتہ للہ چون قاعدہ استخراج ماضی برافکندن نونِ مصدر است ہر آئینہ ماضی آہنگید خواہد بود نہ آہنگ مولوی جہانگیر نگری نے مؤید برہان کے ۳۴ اور ۴۸ صفحے کو سیاہی سے لیپ دیا ہے بارہ معنی آہنگ کے لکھے اور ہر معنی کی سند میں ایک شعر۔۔۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مولوی نے سب فرہنگوں کو دیکھ کر دس بارہ شعر نقل کیے ہیں یہ تو سب کچھ ہوا لیکن میرے اس فقرے کا جواب کہاں ہے کہ ہر آئینہ ماضی آہنگید خواہد بود نہ آہنگ؟ سوال کا جواب نہیں اور خرافات ہزار در ہزار" صفحہ ۱۵ +

غالب کا یہ کہنا کہ آغا نے خارج از بحث باتیں بہت لکھی ہیں اور اصل اعتراض کا جواب نہیں دیا صحت سے بہت دور ہے غالب نے قاطع میں صراحتہً لکھا تھا کہ آہنگ کے جو معانی برہان میں دیے ہیں ان میں سے بیشتر محتاج بہ سند ہیں، عبارت کا یہ ٹکڑا غالب نے تیغ میں نقل نہیں کیا اور یہ دیانت کے خلاف ہے آغا سند کے اشعار پیش کرنے میں بالکل حق بہ جانب تھے۔ رہا "آہنگ" کا ماضی ہونا اس کی نسبت ان کا یہ اعتراف مؤید صفحہ ۹۴ میں

ھ؎ یہاں درفش سے اشاعت اول مراد ہے اور اسی کے صفحے کا شمار دیا ہے۔

ایسا کوئی قطعہ جس کے قوافی آنیش، جیش، اور عیش ہوں موجود نہیں یہ بات سوچنے کی ہے کہ اگر اشباع فتحہ ہوتا تو آتاش ہوتا آتیش ہونے کی کیا وجہ؟ فتحہ الف سے بدلتا ہے ی سے نہیں۔

(۵) غالب تیغ میں (ص۱۱) مصنف مؤید پر بڑی شد و مد سے اعتراض کرتے ہیں:

"مؤید کے پانچویں صفحے میں... مولوی جی... ایک فقرہ لکھتے ہیں: 'غم گفتار پارسی زبان خورد' بھلا غم گفتار پارسی زبان خورد کے کیا معنی؟ غم مترتب ہوتا ہے ہلاک پر، فوت پر، گفتار کا غم کیا؟ پھر گفتار بھی، زبان بھی، یہاں مولوی کی فارسی دانی اور سخن رانی کی ٹھیک نکل گئی"۔

مصنف مؤید کے قلم سے ہرگز یہ فقرہ نہیں نکلا، یہ ان پر تہمت ہے انھوں نے "غم تباہی گفتار پارسی خورد" لکھا ہے جس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ غالب شاید یہ سوچے ہوں گے کہ اصل کتاب سے مقابلے کی زحمت کون گوارا کرے گا اور تردید ہوئی تو کیا ضرور ہے کہ تیغ کے کل پڑھنے والوں کی نظر سے گزرے ان کی غرض مخالف کی تذلیل تھی اور وہ حاصل ہو گئی۔

(۶) غالب اسی کتاب میں (ص۱۱+) مصنف مؤید پر سرقۂ مضمون بہ تغیر الفاظ کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں:

"فقیرنے درفش کاویانی کے ۱۲ صفحے میں عبارت لکھی ہے 'آئے وبیران پارس راقاعدہ چناں بود کہ برسر دال ابجد نقطہ نہادندے چوں دریں اندیشہ وجود دال بے نقط از میاں می رفت و ہمہ دال منقوط می ماند اکابر عرب[۲۱] قاعدہ قرار دادند و لتفرقۂ دال و ذال را برآں قاعدہ اساس نہادند' منصفین ملاحظہ کریں کہ مولوی عربی خواں فارسی داں مؤید کے ۲۴ صفحے میں یہ عبارت یوں لکھتا ہے: 'بہ خاطر فاتر چنیں[۲۲] می رسد کہ چوں درزمان قدیم و عہد باستاں بزر بر دال نقطہ می نہادہ اند متاخرین کہ ازیں قاعدہ آگاہ نیند آں را خیال ذال منقوطہ کردہ اند' حضرات کو میں اس امر خاص میں بہت تکلیف دوں گا اور داد طلبی میں اصرار و ابرام کروں گا۔ فرہنگہائے پیشیں میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھا دے تو میں گنہگار اور یہ مولوی اٹھائی گیرا یہ راز مجھ سے شستہ ہے گر مرد ہم مولانا و اولنا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمۃ نے کہا ہے۔ کوئی دوسرا اس کو نہیں جانتا ہوگا"

[۲۱] فارسی کے قواعد سے اکابر عرب کو کیا سروکار؟ صرف اتنی بات نئی ہے ورنہ اور جو کچھ لکھا ہے غالب سے پہلے کہا جا چکا ہے[۲۲] فاتر کے بعد سو دا

ایں اوراق؟ جو غالب نے حذف کر دیا ہے ساری عبارت مؤید کے ۲۴ پر ہے ص۲۴ پر نہیں[۲۳] اگر ایسی پرانی کتابیں موجود ہیں جن میں دال کو بالالتزام نقطے کے ساتھ لکھا جاتا ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ عبدالصمد کے سوا کوئی دوسرا اس کو نہیں جان سکتا تھا؟

تیغ تیز کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ ان لغات کے برہان اور ملحقات دونوں میں موجود ہونے پر اعتراض قاطع ہی میں ہوا تھا اور آغا نے اس کا جواب مؤید میں نہ دیا یہ واقعہ کے خلاف ہے یہ اعتراض پہلی بار درفش ص۱۲۶ میں ہوا اور اس کا اعادہ تیغ میں کیا گیا۔ مؤید میں صراحتاً اس کا سال تصنیف ۱۲۸۰ھ درج ہے (ص۲۴۷ وغیرہ) درفش کا سال انطباع ۱۲۸۲ھ ہے (ص۱۵۲) آغا مؤید میں درفش کے اعتراض کا جواب کس طرح دے سکتے تھے؟

غالب کا یہ قول کہ آغا نے اس لغت کے باب میں پورا ایک صفحہ (۲۰۴) سیاہ کیا ہے۔ بالکل غلط ہے اس صفحے کی صرف دو سطریں اس سے متعلق ہیں۔ غالب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ مولوی جی .. نظائر وغیرہ کا حوالہ دے کر ہفت کشور وغیرہ کی صحت میں غلو کرتے ہیں" اور اس کی صحت کے گواہ گزرانتے ہیں مؤید میں اس کے باب میں صرف یہ عبارت ہے "ویک صد و چند لغت کہ دانائے تبریز بہ ترکیب ہفت آوردہ وعروس بیاں را بہ ہفت کردہ ہمہ معقول است و قول معترض نامقبول"

یہ لکھنے کے بعد کہ "کمتر معقول و بیشتر نامعقول" یہ کہنا کہ "غالب نے ان الفاظ کو غلط کب کہا ہے" غالب کا حصہ ہے۔ کل نہیں تو "بیشتر" الفاظ کو انھوں نے نامعقول ضرور کہا ہے اور یہ "غلط" سے کم نہیں۔

غالب کا یہ بیان کہ "یک صد و چند لغت برہان اور ملحقات دونوں میں ہیں" ایک فیصدی بھی صحیح نہیں جیسا کہ آغا نے شمشیر تیزتر (ص۳۴) میں لکھا ہے ان میں سے ایک بھی ملحقات میں نہیں۔ ملحقات میں ایسی ترکیبیں جن کا جزو اول ہفت ہے صرف دو ہیں (ہفت خم اور ہفت کہنہ) اور یہ برہان میں نہیں۔ مؤید میں آغا نے صراحتاً لکھا تھا (ص۲۰۴) کہ ملحقات کا کوئی سروکار صاحب برہان سے نہیں۔ غالب کو چاہیے تھا کہ تیغ میں یا تو اسے تسلیم کر لیتے یا اس کا ثبوت دیتے کہ ملحقات صاحب برہان کے قلم سے ہے۔

(۹) غالب تیغ میں (ص۱۰) "دیدۂ عیب ساز" پر اس طرح اعتراض کرتے ہیں کہ گویا یہ الفاظ آغا کے ہیں حالاں کہ وہ عبارت جس میں یہ الفاظ آئے ہیں مؤید میں صراحتاً (ص۲۰۹) مرقوم ہے کہ برہان سے منقول ہیں

(۱۰) درفش کاویانی کے دیباچۂ جدید میں قاطع پر جو اعتراض ہوئے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم" (ص۵)

حالانکہ دو لفظوں کے متعلق نامۂ غالب میں خود انھوں نے اقرار کیا ہے کہ مجھ سے سہو ہوا ہے اور خود

موجود ہے۔" و ماضی کنیدن یعنی کشید اگر از جامع است البتہ خطا کردہ است کہ کشندہ[۱۱] را کہ معنی ہفتم جہانگیری ست،
کشندہ بہ یای تحتانی خواندہ۔ از حق نتواں گذشت کہ صیغۂ امر کہ ہماں آہنگ است بہ نوعے بمقام افادۂ معنی
مصدری و اسم فاعل و اسم مفعول و بہ معنی ماضی" غالب غلط گوئی سے آغا کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔

(۸) اس کتاب میں اسی نوع کا ایک اعتراض ہے:-

ہفت[۱۲]۔۔ بالفتح ایک لفظ ہے ثنائی اس میں سے ایک سو کئی لغت پیدا ہوئے ہیں مزا یہ ہے کہ برہان قاطع میں بھی لکھے اور سواد لحقات میں بھی رقم فرمائے۔ مولوی صفحہ ۴۲ میں اس لفظ کے باب میں ایک صفحہ پورا سیاہ کرتے ہیں میرا اعتراض یہ ہے۔۔۔ یک صد و چند لغت از ہفت،۔۔ مرکب ساخت سراسر کنایہ از ہفت سپہر و ہفت سیارہ و ہفت کشور و ہفت پردہ چشم۔ مولوی جی۔ نظائر ذخیرہ کا حوالہ دے کر ہفت کشور وغیرہ کی صحت میں غلو کرتے ہیں، کوئی پوچھے کہ غالب نے ان الفاظ کو غلط کب کہا ہے جو تم اس کی صحت کے گواہ گزرانتے ہو۔ ایک لغت کو سو لغت بنانے کا عذر کہاں؟ بس خالصۃً عبارت میں لکھ دیا کہ عبارت دانائے تبریزی معقول است و قول معترض نامقبول
اس عذر نہ کرنے کو میں نے معاف کیا دوبارہ لحقات میں انھیں سو لغت کے لکھنے کا تو [illegible] جی جواب میں
غالب نے قاطع میں ہفت کی نسبت صرف یہ لکھا ہے:-

"و باقی یک صد و چند لغت ہمہ از ہفت کہ عددے است معروف مرکب ساخت و از مرہم قلم در مضمار بیاں شور رستخیز انداخت، سراسر کنایہ از ہفت سپہر و ہفت سیارہ و ہفت پردۂ چشم و ہم کشور کمتر معقول و بیشتر نامعقول گوئی ایں رسالہ مستورہ بود و ناز پرورد کہ ایں دکنی آزاد را بہ جمشید انگشت فرمود، نظر بازاں بدیں گونہ ہر ہفت کردہ در نظرہا جلوہ داد و بردیدہ و دل مردان طریقت منت نہاد۔ دانم کہ ہنگام فراز آوردن ایں الفاظ بر فراوانی دستگاہ خویش نازمی کرد۔ شدہ دکنیاں دگر ہمی گفتہ باشند مصرع، ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

---

۱۱ فرہنگ میں آہنگ کے معنی ہفتم یہ ہیں: "ہفتم بمعنی کشیدہ بود و آہنگیدن بمعنی کشیدن بود" معلوم ہوتا ہے کہ کسی قلمی نسخے میں کشیدہ کی جگہ کشندہ ہے۔

۱۲ "ہف" نہیں "ہفت" چاہیے اور ثنائی نہیں ثلاثی کا مقام ہے۔ یہ کاتب نہیں غالب کا سہو قلم ہے۔

" دیوان کا چھاپا کیا؛ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین... آدمی نہیں، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگتا ہوں اور وہ نہیں دیتا" اردو ص۱۲

اس سے معلوم ہوتا ہے دیوان واپس لینے کا کچھ اور سبب تھا شیو نرائن کی دلجوئی مقصود نہ تھی۔

(۱۴) ۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء والے خط میں یہ عبارت بھی ہے؛

"رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا.. تمھارا مال ہے۔"

اس خط میں یہ لکھا کہ دیوان رام پور سے صرف شیو نرائن کے واسطے لائے تھے اور ۱۸۶۱ء میں شیو نرائن کو اصل حقیقت بتا چکے تھے کہ دیوان ضیاء الدین احمد خاں کے لیے لکھوایا اور انھیں رام پور سے دہلی بھیجا گیا تھا۔

" اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا میں نے کاتب سے لکھوا کر.. ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا.. اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھ سے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آ کر.... دیوان بھیج دیا اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟" اردو ص۳۸

(۱۵) غالب کا ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی مدح میں ہے جس میں ضمناً روشن الدولہ وزیر اودھ کی بھی تعریف کی ہے، اس کا مطلع یہ ہے؛

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں نرسم ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں نرسم نظم ص۵۵

اس قصیدہ کی نسبت تفتہ کو اگست ۱۸۶۱ء کے خط میں لکھتے ہیں؛

" بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلا دیا، داغ کہنہ حسرت کو چمکا دیا، یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا

درفش سے بھی اس کا پتا چلتا ہے ص۲۵ و ص۹۴

"آویزہ اور افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے" (عود ص۱۸۱)

(۱۱) غالب غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"ہاں بھائی میں از روئے مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں اب جو شخص تم سے پوچھا کرے صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے" (اردو ص۱۴۱)

غالب کو خود اعتراف ہے کہ مصلحت ہو تو غلط گوئی جائز ہے۔

(۱۲) غالب ۲۰ر نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں، روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت" (اردو ص۸۰)

غالب نے صراحتہً یہ نہیں کہا کہ اس وقت تک کچھ نقد نہیں ملا، لیکن کنایتہً وہ اس سے انکار کرتے ہیں باوجود اس کے کہ اصل رقم جو ملنے والی تھی وہ ۳۰ر اکتوبر ہی کو مل چکی تھی اور رخصت کے وقت ایک مختصر رقم بطور زاد راہ ملی تھی عرشی صاحب دیباچہ مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں:

"نواب خلد آشیاں ۳۰ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپیہ عطا فرما چکے تھے تاہم ۲۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو دو سو روپے بوجہ زاد راہ مرحمت فرما کر مرزا صاحب کی۔۔ آرزو کی تکمیل کر دی ص۱۱۶"

تفتہ سے حقیقت کا اخفا اس لیے تھا کہ کہیں انھیں کچھ دینا نہ پڑے وہ زردار آدمی نہ تھے اور اس کے باوجود آڑے وقتوں میں غالب کے کام آئے تھے۔

(۱۳) غالب شیو نرائن کو ۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں دیوان کے متعلق لکھتے ہیں:

"غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا، اور میں نے نظر تمھاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا" (اردو ص۲۹۴)

سیاح کو ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں اسی کی نسبت یوں تحریر کرتے ہیں:

اس عبارت سے صاف ظاہر ہی کہ قصیدہ ممدوح تک نہ پہنچا صلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

متفرقات غالب میں جو ابھی حال میں شائع ہوا ہی غالب کا ایک خط ناسخ کے نام ہی اس کا مرکز قصیدہ مذکور بالا سے تعلق ہی۔ اس کے ضروری عبارات ملاحظہ ہوں:

"مشکیں رقم صحیفہ مشام آرزو را غالیہ سا ... آمد، خامۂ ممدوح بہ گلبانگ التفات پردۂ چند از پرسش رودادِ سخن را در دو مقام نشست ہمدمی بخشید۔ نخست در معرض استفسار کمیت زر ڈگری و آن گاہ بر مضمونی سفر دکن نہفتہ مباد آنچہ کہ در عبودیت نامۂ پیشیں ازیں عالم گفتہ شدہ بود سراپا بیان داشت، ورنہ مرا کہ باکش تقاضا خو کردہ ... ام، ازیں ہنگامہ بر دل بندے و گزندے [illegible] ت و خود ایں مایہ زر کہ از من بہ اقتضا خواستہ می شود، بداں بہ می ارزد کہ خاطرم را پراگندگی دہد ... انچہ کہ مرا می باید داد از چہل ہزار افزون تر و از پنجاہ ہزار کمتر است۔ حاشا کہ [illegible] وجہ آرزوے امر اگر دل گرو دیا خود مناسب عالم [illegible] دہ باشد مگر ایں قدر از دست بہم دہد تا بہ نشیم و مشت مشت بر مہ عیاں فشانم و خود را ازیں ہلاکہ دنیا ... نامند بر کران کشیدہ قلندر گردم ... ایں کہ لختے از شعر تلف نمودم و مدح شاہ اودھ سرودم آرائش لباط ایں تمنا بود ... چوں کار ساختہ نہ شد و زمزمۂ من بدل ہاے سخت شاہی فرو دنیامد روے گردانم و بر خود دریغ خوردم۔ اکنوں من کجا و سفر دکن کجا! ..." [ص ۱۰۲]

غالب نے یہ خط ظاہر ہی کہ نصیر الدین حیدر کی موت سے پہلے لکھا ہی اس میں بادشاہ کے صلہ دینے اور روشن الدولہ اور منشی محمد حسن کی خیا[illegible] کی طرف اشارہ بھی نہیں یہ حکایت کہ انعام ملا لیکن غالب تک نہ پہنچ سکا اختراعی ہی۔

(۱۶) ۱۲۷۶ھ میں جب قاطع تمام ہوئی ہی تو دنیا کو پہلی بار اس کا علم ہوا کہ غالب کا ایک استاد عبدالصمد بھی تھا[16]۔ اس سے بہت پہلے جب ان کی عمر ۴۴ برس کی تھی وہ ایک فارسی خط میں تحریر لکھ چکے تھے کہ،

"در سخن از پرورش یافتگان مبدء فیاضم و سواد معنی را بہ فروغ گوہر خویش روشن کردہ ام از ہیچ آفریدہ حق آموزیم بہ گردن نہ و بار منت رہنمائیم بر دوش نیست"

اسی دن پانچ ہزار روپیہ بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ[۱۸] مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کرکے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے تین روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ کر بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ[۱۹] کیا کرے (اردو ص ۲۰۲)

یہ قصیدہ علاوہ اور نسخوں کے کلیات کے دو ایسے نسخوں میں بھی موجود ہے جو غالب کی زندگی میں لکھے گئے ہیں، ایک کی کتابت ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ میں اور دوسرے کی ذیقعدہ ۱۲۵۷ھ میں تمام ہوئی ہے اور یہ دونوں نسخے کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور کی ملک ہیں۔ اس قصیدے کا عنوان ان دونوں میں یہ ہے:

"گزارش خیال بہ لکھنؤ بہ سروبرگ ذریعۂ این قصیدہ ونگارش پذیرفتن مدح شاہ اودھ در جریدہ وبہ رونق یادگار ماندن مدح بہ ممدوح نارسیدہ از عالم مستی بہ بوے بادۂ ناکشیدہ"

---

۱۸ غالب کا ایک فارسی خط نوروز علی خاں بہادر کے نام غالباً اسی زمانے کا ہے اس میں مظفر الدولہ کے لکھنؤ سے آنے کا ذکر ہے۔ اس خط میں منشی محمد حسن لکھنوی کا نام بھی آیا ہے غالب اور ان کے تعلقات بدستور رہیں اگر مظفر الدولہ نے لکھنؤ سے آکر ان کی خیانت کا حال بیان کیا ہوتا تو تعلقات میں فرق ضرور آتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشی محمد حسن اور منشی محمد حسن خاں دو مختلف شخص ہیں یا یہ کہ مظفر الدولہ لکھنؤ [آتے] جاتے رہتے تھے یہ واپسی اس واپسی سے مختلف ہے جس کا ذکر تفتہ کے خط میں ہے۔ خط کے لیے نثر ص ۱۴۳ +

۱۹ کیا ناسخ کو عزل معتمد الدولہ کے بعد اتنا رسوخ حاصل تھا کہ روشن الدولہ کی علانیہ مخالفت کی جرات کر سکتے؟

یوسف حسین خاں

اُردو غزل میں رمزیت

شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے لیکن شعر کی روح چونکہ رمز و ایہام میں پوشیدہ ہے اس لیے لفظوں کے معنی میں تشبیہ اور استعارہ اور کنایہ سے وسعت پیدا کی جاتی ہے تشبیہ میں وہ قوت اور تاثیر نہیں ہوتی جو استعارہ اور کنایہ میں پائی جاتی ہے اس لیے کہ اس میں رمز و ایہام کا ایمائی عنصر نسبتاً کم ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے ایک حد تک مطالب میں وضاحت آ جاتی ہے اگر استعارہ اور کنایہ بالاستعارہ کا استعمال اس لیے کیا جائے کہ معنی واضح ہوں تو وہ بھی تشبیہ کے مثل ہو جائیں گے اور ان کی قوت و تاثیر میں کمی آ جانی لازمی ہے استعارہ سے حقیقت کی تصویر کشی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو ظاہر کرنا۔ عالم فطرت کی وسعت، کثرت تنوع اس کی بلندیاں اور پستیاں زمان و مکان کی کہیں نہ ختم ہونے والی پہنائیاں ذہن کی شعوری اور غیر شعوری کیفیات دقیق اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں جن کی طرف شاعر متوجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ الجھی ہوئی حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور اس کے جذباتی حقائق ہیں جنھیں حرف و صوت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے استعارہ دوہرا مطلب رکھتا ہے ایک کی جگہ دو تصورات ذہن کے سامنے آتے ہیں لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ ہوتی ہے استعارہ اور کنایہ کی مدد سے جذباتی حقائق کی بوقلمونی ایک لمحہ میں دل نشین ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طرز میں کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں لیکن اصل بات کا پتہ نہ چلے۔

استعارہ ایک طرح کا پس منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غزل میں استعارہ کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو اس لیے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمون کو سامع کے دل نشین کرنا اور اول الذکر رمز و ایما کے ذریعہ تحیر میں اضافہ کرنا۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے اس کے ذریعہ معمولی سی بات کو کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے مثلاً غالب اس مضمون کو استعارہ کی زبان میں کیا خوب بیان کرتا ہے

حالی اس اعتراف کے باوجود کہ "کبھی [illegible] مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے" اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی" (یادگار صفحہ ۱۴)، عبدالصمد اگر فرضی نام ہے تو جھوٹ ظاہر ہے، اگر واقعی اس نام کے کسی شخص سے فارسی سیکھی تھی تو انکار راست گفتار آدمی کا کام نہیں

(۱۷) غالب کا یہ بیان کہ نواب یوسف علی [illegible] نے دو سو روپے قاطع کے چھپوانے کے لیے دئیے تھے (اردو [illegible] ص ۱۲) میری رائے میں حقیقت کے خلاف ہے۔ اس واسطے نہیں کہ رام پور سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی (دیباچہ مکاتیب ص ۱۲۸) نہ اس لیے کہ قاطع کی تقریظ پر غالب کا لفظ ہی میسر نہیں، [illegible] غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میں اسے خلاف واقعہ تقریظ کی اس عبارت کی بنا پر سمجھتا ہوں جو نول کشور سے متعلق ہے۔ ریاست کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں، غالب روپے پاکر یہ ہرگز نہیں لکھ سکتے تھے کہ "اگر ایں جواں مرد.... بستن شیرازۂ اوراق پریشاں پرداختے، کاغذ مسودات قاطع برہان را.... سرمہ فروش خریدے تا چکہ ہا ساختے"

(۱۸) غالب کے اسی بیان میں جس کا ابھی ذکر ہوا یہ بھی ہے کہ درفش کے چھاپے کے لیے یوسف علی خاں نے دو سو دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ایفا سے قبل ہی مر گئے وعدے کی "از روئے دفتر" تصدیق نہیں ہو سکتی اس لیے اس کا امکان کہ ان کے جانشین سے یہ روپے وصول ہوں کم ہے، غالب کو یہ علم کیونکر ہوا کہ نواب نے دفتر کو اس کی اطلاع دی تھی اور وہاں اس کے متعلق کوئی تحریر موجود نہیں؟ یہ بھی بنائی ہوئی بات ہے

غالب کے یہاں بالارادہ حقیقت سے انحراف کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں، لیکن اس مقالہ کا خاتمہ غالب کے ایک بیا[illegible] پر کیا جاتا ہے جس میں دروغ گوئی کا اعترا[illegible] تو موجود ہے، لیکن یہ دروغ گوئی ایک دوست کی بھ[illegible]ئی کے لیے ہے [illegible] مرز[illegible] ـتے ہیں:

"[illegible] ابھی .... تمہارا قرض خواہ آیا تھا، کچھ سچ کچھ جھوٹ کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپے تم کو بھیج دے" (اردو صفحہ ۲۲۱)

(۱۵ فروری ۱۹۴۵ء)

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے — یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے

اس غزل میں محض رعایت لفظی سے جو معنی آفرینی کی کوشش کی ہے وہ کس قدر بھدّی ہے کہتے ہیں

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا — کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

ذوق کے ہاں اس رعایت لفظی کی کثرت سے طرز ادا کی کوئی ندرت یا حسن پیدا نہ ہو سکا محمد حسین آزاد انھیں چاہے کچھ سمجھتے رہے ہوں لیکن تغزل میں اُن کا کوئی مرتبہ بلند نہیں اور غالب کی تو وہ گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔

طرز ادا کا انحصار الفاظ اور معنی دونوں پر ہے جو کلام کے اجزائے لاینفک ہیں اگرچہ معانی شعر کی جان ہوتے ہیں لیکن انھیں الفاظ کی جو خارجی قبا زیب تن کرائی جاتی ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے شعر کے اور خاص طور پر شعر غزل کی خارجی ہئیت و اثر کا مدار الفاظ کے صحیح اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے الفاظ کو شعر کا جسم اور معانی کو روح سمجھا جائے تو ضرور ہے کہ حسین و لطیف روح کا خارجی قالب بھی کشش اور لطافت رکھتا ہو۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کو نہایت ہی پر اسرار طور پر متاثر کرتے ہیں۔ انسانی روح کے احوال بڑی حد تک مادی جسم میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں اس طرح مادی جسمانی کیفیات روح پر اپنا گہرا چھاپ لگائے بغیر نہیں رہتیں۔ بالکل یہی حال الفاظ اور معانی کا ہے۔ اگر کوئی لفظ موقع محل اور مقتضائے حال کے مناسب ہو تو اس کی تاثیر اس لفظ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی جو یونہی بدسلیقگی اور بے تکے پن سے استعمال کر دیا گیا ہو چاہے آپ کے معانی کتنے ہی بلند اور گہرے کیوں نہ ہوں اگر اُن کی خارجی صورت غیر جاذب نظر اور دل نشینی سے معرا ہے تو خود معانی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور تاثیر تو نام کو بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر غزل کی رمزی اور ایمائی کیفیت اس وقت باقی ہے جب الفاظ و معانی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے سب مطالبوں کو پورا کرتے ہوں اس سے طرز ادا کی دلنشینی عبارت ہے۔

الفاظ میں تصورات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر مخصوص گرد و پیش میں لے جاتا ہے غزل گو شاعر بعض دفعہ تلمیحات کے ذریعہ جو دراصل ایمائی حیثیت رکھتی ہیں ہمیں ایک خاص فضا کی سیر کرا دیتا ہے۔ موسیٰ اور طور، شیریں و فرہاد، لیلیٰ اور مجنوں، محمود اور ایاز کی تلمیحیں تلازم خیالات

کہ انسان کی عمر گذری چلی جاتی ہے اور اس پر اس کو کوئی قابو نہیں یہ شعر رمزی محاکات کا کمال ظاہر کرتا ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر ہم آغوش ہیں۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

استعارہ نے معنی کو چار چاند لگا دیئے اور معنی کی بلندی اور خوبی نے لفظوں کے چناؤ میں شاعر کو مدد دی یہی حسن ادا ہے جس کی مثالوں سے غالب کا کلام بھرا پڑا ہے انسانی ہستی بے ثبات کی تصویر استعارہ اور تمثیل میں دوسری جگہ یوں پیش کی ہے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبات کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے کے لیے کبھی معانی کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتا ہے اور کبھی الفاظ کے لیے معنی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت معین ہوتی ہے اور لفظوں کے برمحل استعمال سے خود معانی کا تعین عمل میں آتا ہے۔ شاعر کا خیال زبان اور معانی دونوں میں قدرِ مشترکہ ہوتا ہے اور دونوں میں رشتہ اور ربط قائم کرتا ہے۔ الفاظ اور معانی کے صحیح ربط سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آسکتی علم و نظر کی وسعت سے معنی آفرینی کے میدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے کبھی بعض مخصوص شعری علامات یا تلمیحات کا آسرا لیا جاتا ہے لیکن صنائع و بدائع سے شعر کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غزل میں حسن ادا کہاں سے آتا ہے۔ اس کے قواعد وضوابط مقرر کرنا ممکن نہیں ایک مطلب کو ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے کہ لطف آجاتا ہے اور دوسرا وہی بات کہتا ہے اور سننے والے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ امتیاز ذوقی چیز ہے عشق کے پامال مضمون پر غالب کا ایک شعر ہے اور ذوق کا ایک شعر، دونوں شعروں کے فرق سے دونوں کی شخصیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

ذوق اپنے علم و نظر کے مطابق عشق کو تیرہ خاکدان کے لیے چراغ قرار دیتے ہیں معانی اچھے ہیں لیکن لفظوں کی نشست سے اس مضمون کی بلندی کی طرف ذہن راغب نہیں ہوتا بلکہ معمولی اور ہلکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جذبات کے لیے طرز و اسلوب کی بلندی لازمی ہے ورنہ کلام بے اثر رہے گا۔ ان کا شعر ہے

رمل مثمن مخبون محذوف

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا　عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے　غالب

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں　کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں　صہبا لکھنوی

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا　غالب

رمل مسدس مخبون محذوف

نہ کچھ آشفتہ سری نے مارا　کہ مجھے چارہ گری نے مارا　مومن

اہل تدبیر کی واماندگیاں　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں　غالب

ہجر کے غم سے نہ گھبرا جرات　اتنا حیران نہیں رہنے کا　جرات

یوں تو رو دیتے ہیں گر لوگوں سے　پوچھتے حال ہیں اکثر میرا　نظام رامپوری

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں　دو قدم کوچۂ رسوائی ہے　جلیل

بحر اور ردیف قافیہ کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر خاص طور پر ایسے الفاظ برتتا ہے جس کے ساتھ شعری تصورات صدیوں سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ان سے ایک خاص قسم کی ایمائی فضا کی تخلیق ممکن ہے۔ طرز ادا اور حسن ادا اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ میں اس جگہ صرف چند اس قسم کے علامتی لفظوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں مثلاً جنوں، گریباں، زنجیر، موج، نقاب آشیان قفس اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے الفاظ ہیں گریبان کے چاک ہونے میں خاص رمزی اور ایمائی کیفیات پنہاں ہیں جنھیں ہمارے شعرا نے محسوس کیا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں

جنوں و گریبان

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی　اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا　میر

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں　میر

دست جنوں کے جائیے صدقے کہ چین سے　پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں　مومن

تب چاک گریباں کا مزہ ہے دل نالاں　جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے　غالب

کی بازآفرینی کے لیے زبردست محرکات شعری بن جاتی ہیں اور یہ صرف تلمیحات ہی تک محدود نہیں۔ ہر لفظ میں قوت اور توانائی کا خزانہ مخفی ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا برتنے والا اس کے استعمال کا ڈھب جانتا ہو بقول غالب

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ہر لفظ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے چنانچہ کسی ایک لفظ سے جو خیالی تلازمات اور ذہنی متعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے مرادف الفاظ سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کے شعر کا دوسری زبان میں جیسا ترجمہ ہونا چاہیے ویسا نہیں ہوسکتا۔ بعض دفعہ ایک لفظ میں ایک جہان معنی پنہاں ہوتا ہے اور ذہن کو ایک خاص فضا میں لے جاتا ہے چنانچہ شعر غزل میں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی کا جو ایک لطیف ربط قائم ہو جاتا ہے اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا بحر اور قافیہ اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں کی جوہری انفرادیت اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انھیں سن کر تحت الشعور کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے بعض وقت خواب کی حالت میں گزشتہ واقعات اپنی جیتی جاگتی شکل میں نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ خواب کی کیفیت بھی دراصل اشارہ اور کنایہ کی کیفیت ہوتی ہے جن کی تفصیلی خلا کو حافظہ بعد میں پر کرلیتا ہے

غزل کی ہر بحر اپنے اندر ایک قسم کا رمز اور ایما رکھتی ہے مثلاً بحر رمل جو سرعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اردو غزل نگاروں کے ہاں اپنی سماعی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں اس بحر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوئی جتنی کہ اردو میں۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بحر ہندی بحروں سے نسبتاً قریب ہے اس بحر کے اشعار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رمل مسدس مجنون مقصور

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — چھیڑیو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں (مصحفی)

ناصحو آپ میں جرأت نہ رہا — اب سمجھ کر اُسے سمجھائیے گا (جرأت)

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ   پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

غالب نے محبوب کی رفتار کی شگوفہ طرازی کے ذکر میں موج کے دل نشین استعارہ سے کیا خوب کام لیا ہے۔

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا   موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

جب کہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب   وادیٔ حیرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے   کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے   ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

جگرؔ کے یہاں ایک موجِ مے خانہ کو بہالے جاتی ہے۔ کہتے ہیں

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں   آج اک موج بہالے گئی مے خانہ کو

جگرؔ کے یہاں لفظ موج کی ایمائی جھلکیاں جا بہ جا دکھائی دیتی ہیں

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا   بادہ کوثر کی بھی اک موج پیمانہ میں ہے

ترے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں   کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

ساقی کی فیضِ مست نگاہی کے میں نثار   ایک ایک موجِ مے کو رگِ جاں بنادیا (جگرؔ)

کیا قطرہ کیا دریا، کس کا طوفاں کس کی موج   تو جو چاہے تو ڈبودے خشکیٔ ساحل مجھے

"موجِ ہوائے دردِ دل" کی ترکیب اور اس کی معنویت قابل ملاحظہ ہے

جس طرف وہ شوخ نظریں اٹھ گئیں   لے اڑی موجِ ہوائے دردِ دل

نقاب خود رمز و ابہام کی کیفیت پیدا کرنے والی چیز ہے چنانچہ غزل کی رمز نگاری کو یہ لفظ اور اس کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہے وہ خاص مناسبت رکھتا ہے اردو غزل گو شاعروں کے دیوان لفظ نقاب کی مضمون آفرینیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں

ویسے ظاہر کا لطف ہے جیسا   کم تماشہ نہیں یہ پردہ کچھ   میرؔ

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی   غالبؔ

بے کاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل | جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی | غالب
نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہوا گر اس نے شدت کی | ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر | غالب
گر یہی بہار کی شورش تو ناصحا | مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط | جعفر علی حسرت
جوش جنوں سے کچھ نہ چلی ضبط عشق کی | سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا | جگر
نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہار انکی | بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی | بیخود دہلوی
کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی | شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی | میر
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد | ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا | غالب
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں | ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا | "
رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے | مژدہ خار دشت پھر تلوہ مرا کھجلائے ہے | ذوق

موج کی حرکت اور بے تابی تغزل کی رمز نگاری میں مختلف پیرایوں میں ملتی ہے کہیں موج رنگ کہیں موج گل کہیں موج شراب اور کہیں خالی موج محرک شعری بنی ہے غالب کے یہاں خاص کر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ گل میں موج رنگ کی شوخی فریفتہ ہونے کی چیز نہیں رنگ تو اصل میں گل کی خونیں نوائی کا نتیجہ ہے حسن توجیہہ ملاحظہ ہو

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا | اے وائے نالہ لب خونیں نوائے گل | غالب

ایک پوری موج شراب والی غزل اسی رنگ میں ہے اور برسات کے موسم کی مناسبت سے موج کی رمزی اور ایمائی کیفیت میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب | دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر | موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو | موج گل موج شفق موج صبا موج شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال | ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل | موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موج شراب

فصلِ گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا فصلِ گل میں اجڑا تھا شاید آشیاں اپنا فانی

ہماری شاعری میں اس طرح کے بیسیوں علامتی الفاظ ہیں جو باوجود بیش پا افتادہ اور بظاہر فرسودہ ہونے کے حسن استعمال کے باعث ایمائی اثر کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل کسی زبان کا کوئی لفظ بھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا نئے لفظ اور نئی بندشیں بیکار ہیں اگر ان میں ایمائی اثر آفرینی نہ ہو۔ اور اگر شاعر ایمائی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ پرانے اور رسمی لفظوں میں جان ڈال دے گا۔ مثلاً چند رسمی لفظ یہ ہیں رہرو اور منزل، کشتی اور ساحل، شمع اور پروانہ، جلوہ، تماشہ وغیرہ ان کی مثالیں دینے میں بڑی طوالت ہوگی ان سب لفظوں کو ہمارے شاعر دو سو برس سے برت رہے ہیں لیکن آج بھی ہمیں ان میں عجیب و غریب لطف ملتا ہے۔ اعجاز ہر قادر الکلامی کا قادر الکلام شاعر لفظوں کو فاتحانہ انداز میں برتتا ہے وہ اگر کسی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کا کوئی پیشرو پہلے برت چکا ہے تو باوجود اس کے وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اس میں تازگی اور ندرت پیدا کردے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے کی وجہ سے فرسودہ نہیں ہو جاتا۔ اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک سکتا ہے کہ غزل گو شاعر کے لیے لفظ محض علامتیں ہیں ذہن کو حقیقت کے بجائے مجاز کی طرف منتقل کرنے کی۔ تغزل کا یہی طلسم یا اعجاز ہے جو اس صنف سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا اور جو شاعر اس قسم کا جادو چلا سکے گا اس کو استادی کا فخر نصیب ہوگا۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ وہ اسی کا ہو جاتا ہے جو اسے اچھی طرح برت سکے۔ اس باب میں تقدم و تاخر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے اسی کو کچھ عرصہ بعد باندھا اور اپنے پیشرو کے مضمون کے مقابلے میں اس کو زیادہ بلند کر دیا تو مضمون اسی کا ہو جائے گا نظیری کا مشہور شعر ہے

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا نے تھوڑے تصرف سے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مومن خاں کا شعر ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہی غالب

منہ نہ کھلنے پر وہ ہی عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا "

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں جلوہ نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں شیفتہ

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے وہ تو چھوڑ دیا ہی نقاب کرکے مجھے وفا رامپوری

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی ورنہ چیز ہی کیا ہی گوشۂ نقاب ان کا جگر

اس سے دل کا ہر اک نقش جلوۂ بے تاب ہوا مری نظر نہ ہوئی آپ کا حجاب ہوا "

قفس اور آشیانہ کی تمثیل میں اردو غزل گو شاعروں نے جدت ادا کا حق ادا کیا ہی یہ محض جدت ادا اور حسن تخیل ہی جس کی وجہ سے فرسودہ مضمون میں بھی تازگی اور شگفتگی آجاتی ہی لفظ کے معمولی معنی سے زیادہ اہمیت اس بات کو ہی کہ اس کے برتنے والے کے ذوق و وجدان میں اس کا کیا مفہوم ہی۔ قفس اور آشیانے کے علامتی الفاظ کو دیکھئے کس طرح ہمارے شاعروں نے برتا ہی

جب کوندتی ہی بجلی تب جانب گلستاں رکھتی ہی چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے میر

کیسا کیسا قفس سے سر مارا موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے "

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو غالب

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہی جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا مومن

خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سیکڑوں پرّے نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوار گلشن تک (نسیم دہلوی)

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا اصغر

سو بار جلا ہی تو یہ سو بار بنا ہی ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہی "

گلچیں برا کیا جو یہ تنکے جلا دئے تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا ثاقب لکھنوی

بجلی کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر! آشیاں کے ساتھ آنچ آئی مری حسرت پہ بھی "

شاید میں درخور نگہ گرم بھی نہیں بجلی تڑپ رہی ہی مرے آشیاں سے دور فانی

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی

بعض مخصوص طریقوں سے پیدا ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ایک طرح کا طلسم ہے غزل نگار شاعر اس طلسم کے بھیدوں کو جانتا ہے اس کو لفظوں کے استعمال کے ذریعہ ایسی قوتیں عطا کی گئی ہیں جن میں دوسرے اس کے شریک نہیں شاعرانہ لفظ انسانی ذہن کو اس کی بندھنوں سے رہا کرتے ہیں اس سے بڑھ کر اثر آفرینی کا کوئی ذریعہ نہیں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے رمزی کیفیت کی اثر آفرینی ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہے مثلاً وہ جن سے رنگ و بو کے شعری محرکات کی تخلیق ہوتی ہے اور وہ غزل میں خاص تاثیر رکھتے ہیں رنگ اور بو دونوں میں بے پناہ ایمائی خاصیت موجود ہے چنانچہ اردو غزل گو شاعروں نے اس لطیف حقیقت کو ہر زمانہ میں محسوس کیا جدید شاعروں میں حسرت کے یہاں اس محرک شعری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں بعض دوسروں کے یہاں بھی یہ احساس ملتا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو

دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپ کے سے رہ جاویں نہ کیوں
منھ بولے ہے یارو گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی (میر)

خشک عنبر طبلہ طبلہ[1] کیوں نہ ہو کیا کام ہم دماغ آشفتہ ہیں زلف معنبر کے تری
گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک ہے کس مرتبہ میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ

جرأت کے اشعار ہیں

بو محبت کی نسیم آہ سے کھلتی ہے واں گرچہ سو پردوں میں جوں غنچہ چھپالی جائے
سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے چتون میں رہو دگی یہ کسی عطر کی بھی بو میں نہیں
ٹک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے جوں بوئے گل کرے ہے زخود رفتہ بو مجھے

غالب کے خیال میں پھول رنگ کے نشہ سے مست ہو کر اپنی بند قبا حسینوں کی طرح کھول دیتا ہے حسن تعلیل لاجواب ہے

نشۂ رنگ سے ہے واشدۂ گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں
میں نے جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

ظفر کا شعر ہے

[1] عطار کا صندوقچہ

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

غالب نے اسی مضمون کو دوسری طرح سے پیش کیا ہے اور اس کو اور زیادہ بلند کر دیا

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت وہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سودا کا شعر ہے

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

غالب نے اسی مضمون میں کیا طرفہ کاری دکھائی ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

غالب کا شعر ہے

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

ذوق نے اسی مضمون کو زیادہ بلیغ انداز میں ادا کیا ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ حضور یار میں انسان ہی نہیں غیر جاندار اشیا بھی رعب حسن سے متاثر ہوتی ہیں

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

داغ نے اسی مضمون کو اپنی شوخ بیانی سے چار چاند لگا دئے کیا خوب کہا ہے

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

غالب نے شوق پا بوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا شعر کہا ہے

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائیگا

حسرت نے اسی مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا ہے شعر ملاحظہ ہو

وہ خواب ناز میں تھے اور نہ تھے لے شوق پا بوسی نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطف ایما کو

اگرچہ طرز ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے لیکن اس کی تاثیر لفظی استعمال کے

اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ رنگ حیا، خوشبوئے حیا، خوشبوئے حسن، خوشبوئے آرزو، بوئے وفا اور خوشبوئے دلبری کے استعاروں اور رمزی علامتوں میں بلا کی ایمائی قوت ہے جس سے حسرت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے

بس گئی جس سے مشام آرزو میں بوئے دوست | جان فزا تھی کس قدر یارب ہوائے کوئے دوست
آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردۂ گیسوئے دوست | ہو چکی اب ہم گرفتاران فرقت کو نصیب

اس پوری غزل میں بو کے محرک شعری کی لپٹیں موجود ہیں

جس نے سونگھی ہو تری زلف سیہ کار کی بو | کیا پسند آئے اسے نافۂ تاتار کی بو
آج تک جس سے معطر ہے محبت کا مشام | آہ کیا چیز تھی وہ پیرہن یار کی بو
بے پیے مست کئے دیتی ہے اے پیر مغاں | مے پرستوں کو ترے ساغر سرشار کی بو
ہوس انگیز تمنا ہے لب یار کا رنگ | روشنی بخش نظر ہے گلنار کی بو
دل دہی سے بھی تری بڑھ کے ہے کچھ روز افزوں | دلنوازی میں ترے نامۂ دلدار کی بو —
لبریز نور ہے دل حسرت زہے نصیب | اک حسن مشک فام کے شوق تمام کا
آشنا ہو کے بوئے یار سے ہم | سخت بیزار ہیں قرار سے ہم
میں اس طرۂ زلف مشکیں کو حسرت | پئے غارت جان دوتا چاہتا ہوں
گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی مراد | آہ وہ نکہت برباد کہ برباد نہیں
رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں | اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
رنگ سونے میں چمکتا ہے طرحداری کا | طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
یاد شہ رو کوئے یار آنے لگی | آرزو کو بوئے یار آنے لگی
شوق مخمور ہوس ہونے لگا | نکہت گیسوئے یار آنے لگی
پیراہن کوئی اتارا نہ انھوں نے حسرت | وہ کہ خوشبوئے محبت سے ہم آغوش نہ تھا
خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے | تجھ تک نہ ہوا تھا جو گذر باد صبا کا
سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں | اب تک یہی اس بوئے گریباں کا نشاں ہے

شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی چمک پھر ویسی ہی
جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہی

رند کہتا ہی

خال عارض پہ گماں عنبر اشہب کا ہوا سونگھ کر زلف کی بو مشک ختن یاد آیا

محرک بو کا مضمون نسیم لکھنوی کے یہاں ملاحظہ ہو

چارہ گر سودا ہی بوئے زلف برہم کا مجھے قید کر زنجیر موج نکہت بر باد میں

برق کے یہاں یہ مضمون اس طرح ہی

ملتا ہی بوئے گل سے نشاں بوئے یار کا نقشہ ہی بوئے گل میں گل روئے یار کا
موج نسیم سے نہ پریشاں ہو کیوں دماغ دیوانہ ہوں میں نکہت گیسوئے یار کا
بڑھ گیا اور جنوں بو جو تمہاری آئی بن کے زنجیر بلا باد بہاری آئی
ممکن نہیں کہ رنگ جمے آفتاب کا رنگ بہار عارض زیبا کے سامنے

داغ کا شعر ہی

کیا صبا کوچۂ دلدار سے لوٹ آتی ہے مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بو آتی ہی

جلال نے بھی اسی مضمون کے شعر کہے ہیں

زلف یار کا تصور جنون شوق کے لیے کس طرح سامان بہار مہیا کرتا ہی

مژدہ اے جنوں تیری بہار آنے کو ہی ہوش تجھے جانے کو بوئے زلف یار آنے کو ہی

جلال نے اس شعر میں بو کو محرک شعری کے طور پر عجب پیرایہ میں برتا ہی

وحشی وہ ہیں کہ ہم کو لگا لائی بوئے گل پوچھی بہار میں نہ کسی سے چمن کی راہ

ایک دوسرے شعر میں گل داغ عشق میں رنگ و بو کے محرک کو بڑی خوبی سے نکھارا ہی

کیا پھول ہی جلال گل داغ عشق بھی کہ اس کی بو سے مست ہوں رنگ پر غش ہوں

حسرت نے رنگ و بو کے رومانی اور ایمائی اثر کو جس خوبی سے اپنے عاشقانہ کلام میں استعمال کیا ہی

جلیل کے شعر ہیں

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے ۔ کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلف مشک بو ۔ کیا کیا ملا رہا ہوں نسیم سحر کو میں

چمن کے پھول بھی ترے ہی خوشہ چیں نکلے ۔ کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

جگر کے کلام میں رنگ و بو کے محرکات نسبتاً کم ملتے ہیں چند مثالیں یہ ہیں

جا بھی اے ناصح ناداں نہ کر اس کو بدنام ۔ ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

خرام رنگیں نظام رنگیں کلام رنگیں پیام رنگیں ۔ قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں ۔ تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

شعر غزل میں حسن ادا کا انحصار لفظوں کے خاص استعمال پر ہوتا ہے مثلاً بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسن ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "کائنات سخن" میں جمع کے استعمال کو محاسن سخن میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۶۲) لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لیے رمزی اور ابہامی کیفیت ضروری ہے صیغۂ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی صورت پیدا ہوتی ہے اور یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاعر نفس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے رمزی اور ایمائی اثرات پیدا کرنا ہوتا ہے صیغۂ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لیے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے خود حسرت کی غزلیں ملاحظہ کیجیے جمع کے حسن استعمال نے اس کو کس قدر بلند کر دیا ہے

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں ۔ دل کی بے اعتباریاں نہ گئیں

عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا ۔ شوق کی بے قراریاں نہ گئیں

تھے جو ہر رنگ نازاں کے ستم ۔ دل کی امیدواریاں نہ گئیں

حسن جب تک رہا نظارہ فروش ۔ صبر کی شرمساریاں نہ گئیں

مر کے بھی خاک راہ یار ہوئے ۔ اپنی الفت شعاریاں نہ گئیں

کیا کیجئے بیاں اس تن نازک کی حقیقت ... 　 خوشبو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہے سب رنگ

پائی ہے جگہ پاکئ دامانِ نظر میں 　 خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر

اک بار بس گیا جو کہیں ان کی باس میں 　 خوشبوئے حسن برسوں رہی اس لباس میں

رفتہ رفتہ مٹ رہی ہے صرصرِ بیداد سے 　 رنگ میں بوئے وفا میں نکہت برباد کے

جلال کے یہاں بھی بوئے وفا کا مضمون ملتا ہے

ترے وعدوں نے بدلیں صورتیں بے اعتباری کی 　 کبھی بوئے وفا ٹھہرے کبھی رنگ حنا ٹھہرے

حسرت کے چند اور شعر سنئے

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار 　 خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

محبوبی و رنگینی ہیں جسم و بدن تیری 　 سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں 　 یا عکس مے سے ہے شیشہ گلابی

کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو 　 آنکھیں جب اپنی ملتے ہیں ان کی ردا سے ہم

کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت 　 گھیر لیتی ہے انھیں زلف معنبر کیا خوب

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں 　 شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

وصل میں بوئے جسم یار کو آج 　 شوق سے پردۂ قبا نہ رہے

مشک و عنبر ہیں یہ تفریح کے سامان کہاں 　 پیرہن ان سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا

دامن حسن ترا خون شہادت نے میرے 　 عطر خوشبوئے محبت میں بسا کر دیکھا

رنگ و بو کے محرکات دوسرے شاعروں کے بیان میں بھی ملتے ہیں ثابت کے اشعار ملاحظہ ہوں

طرۂ گیسوئے جاناں تری نکہت کی قسم 　 میں نے دیکھا تھا مگر مشک ختن یاد نہیں

جذب شمیم زلف ہے دانہ و دام سے سوا 　 سیکڑوں دل کھنچ آئے ہیں گیسوئے مشک بار میں

شاد عظیم آبادی کہتے ہیں

کاکل جاں فزا کی بو سونگھ چکی ہے اے صبا! 　 کچھ تو سمجھ کے ذکر کر عنبر و مشک و عود کا

صبر ے زاہد نافہم نہ مے خواروں کا بخشنے والا بھی دیکھا ہو گنہ گاروں کا
سرشوریدہ کو تسکین وہیں ہوتی ہے مجھ پہ احسان ہو اس کوچہ کی دیواروں کا
دوش پہ اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

نقل قول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمز و ابہام پیدا کرنا مقصود ہوتا ہو حالانکہ نثر میں اس کے بالکل خلاف ہو نثر میں نقل قول مطالب کی صفائی اور تعین کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہو غزل میں اس سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہو مثلاً

کہنے تو ہو "یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا" کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا میر
دل جلے جوں روکر شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے "
ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کرکے تم کو تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے "
پڑے ہو بزم میں جس شخص پر نگاہ تری وہ منھ پھیر کے کہتا ہو "اف پناہ تری" جرأت
کہے کوئی گر اس سے ملئے کہ جرأت تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہو وہ از رہ طعن ہاں جی یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے "
جتاؤں درد محبت تو کس ادا سے کہے کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی "
اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا جادو برحق ہو کرنے والا کافر "
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو کہتے ہیں کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں غالب
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں "
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں "
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال کہ یہ کہے کہ سر رہ گذر ہو کیا کہیئے "
رشک کہتا ہو کہ "اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہو کہ وہ بے مہر کس کا آشنا "
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں مجھے تو خو ہو کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے "
نقش پائے رفتگاں سے آرہی ہے یہ صدا دو قدم میں راہ طے ہو شوق منزل چاہیئے آتش

حسن کی دلفریبیاں نہ گئیں عشق کی [illegible] کاریاں نہ گئیں
سب نے چھوڑا مجھے مگر حسرت درد کی غمگساریاں نہ گئیں

ہم پہ بھی مثل غیر ہیں کیوں مہربانیاں اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں
حسرت ہو یادگار زمان جنوں ہنوز باقی ہیں شوق یار کی اب تک نشانیاں

خاموشیوں کا راز محبت وہ پا گئے گو ہم سے عرض حال کی جرأت نہ ہو سکی

اللہ رے چشم یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
نشو و نمائے سبزہ و گل سے بہار میں شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

میری مجبوریاں شوق جفا سے باز رکھیں گی تیرا شوق ستم ظالم خیال امتحاں تک ہے
رنگینیوں کی جان ہے وہ پائے نازنیں اپنی نگاہ شوق جہاں سر کے بل گئی

جمع کا حسن استعمال ہر دور کے شاعر کے ہاں ملتا ہے قدماء میں خاص طور پر میر صاحب کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں مثلاً

جب تک مری جلاسی جفائیں تھیں اٹھ سکیں کرنے لگے ہو اتنے ستم گاریاں بہت
یہ بے قراریاں نہ کبھو ان نے دیکھیاں جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں
کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

مومن کے اشعار ملاحظہ ہوں

الجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم کرتے ہیں اس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم
ظاہر ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گناہ رشک حیران ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مر گئے صبح شب فراق کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

داغ کے چند شعر ملاحظہ ہوں

تکرار الفاظ بالعموم نثر اور شعر دونوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور الٹ پھیر ایک خاص سلیقہ سے کی جائے جو رمزی احساس کو بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حسن میں اضافہ ہوگا مثلاً

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے پارہ پارہ دل ہے جس میں تو وہ تو وہ حسرت ہے درد

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی غالب

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں "

کس تجاہل سے وہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو تیرے کوچہ میں ستم گار تیرے کوچہ میں شیفتہ

ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے

نہیں ہے وعدہ میں ان گلوں کے وفا کی بو اتیا زکا رنگ جلال لکھنوی

دعا سے کچھ نہ ہوا التجا سے کچھ نہ ہوا بتوں کے عشق میں یا خدا سے کچھ نہ ہوا

بھری تو تھی مگر اپنے اثر کو لا نہ سکی گئی تو تھی مگر آہ رسا سے کچھ نہ ہوا مضطر

کہاں گلوں کے وہ تختہ وہ لالہ زار کہاں بہار میں تو نظر لگ گئی بہار کہاں شاد

کوئی ان کی بزم جمال سے کہ اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا

جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اس طرف نگراں اٹھا حسرت

تازگی بیان اور ندرت مضمون کا بعض دفعہ یہ اقتضاء ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظوں کو حذف کر دیا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سامع کا ذہن خود بخود اس کمی کو پورا کر دے مثلاً

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم حال خوش اس کے خستہ حالوں کا میر

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا مومن

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا سو مرے خاک میں ملانے کو

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی امیر مینائی

کہاں کہاں دل مشتاق دید نے یہ کہا وہ چمکی برق تجلی وہ کوہ طور آیا داغ

نگاہ ناز یہ کہتی ہے تیرا افگن کی کہیں ہوں دل کے لیے تیر ہے گلو کے لیے جلیل

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے "

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں دو قدم کو چۂ رسوائی ہے "

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم شاد

مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم "

محبت کیوں کرو گر ہو نہیں سکتی وفا مجھ سے یہ تم نے کیا کہا مجھ سے یہ تم نے کیا کیا مجھ سے حسرت

دیکھے نہ ہمیں کوئی محبت کی نظر سے کیا خوب یہ انداز تحکم ہے تمہارا "

وہ بات بات چھیڑ کے کہتے ہیں میرے غم نے تجھے نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے "

حال دل سے انہیں آگاہ کیے دیتے ہیں اب کبھی ہم کو خبر کیا تھی نہ کہنا دیکھو "

یہ کہہ کر دیا اس نے درد محبت جہاں ہم رہیں گے یہ سامان ہوگا جگر

کہتی ہے یہ اب وسعت دیوانگی شوق منزل بھی جو آ جائے تو منزل نہ سمجھنا "

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے "

تلمیح بھی کنایہ اور استعارہ کی طرح رمز و ایما کو نکھارتی ہے اس میں بھی کنایہ کی طرح لازم و ملزوم میں واسطہ برقرار رہتا ہے جس کی لطافت کا یہ اقتضا ہے کہ تعقید کی تازگی کا متوقع رہتا ہے مثلاً

بے ستوں کیا ہے کوہکن کیسا عشق کی زور آزمائی ہے میر

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر کیا دوانے نے موت پائی ہے "

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد "

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا غالب

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں "

اب کے جو تیرے کوچہ میں جاؤں گا تو سنیو پھرتے جی اس رہ وہ بدنام نہ آیا میر
کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے ذوق
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہی تم نے کیوں سونپی ہی اپنے در کی دربانی مجھے غالب
عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی تم سے کہ کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا انشاء
ترے در سے اب ہم سفر کر چلے جیو تم کہ اب ہم گذر کر چلے میر سوز
فصل بہار آئی پیو مومنو شراب بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے آتش
پھنس گئے تم نہ سنی حضرت دل بات میری بندگی آپ کو اے قبلہ حاجات میری امیر
ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں میرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے داغ

تخیل کبھی معمول کے خلاف مستقبل کے معنی ماضی کے ساتھ ساتھ وابستہ کر دیتا ہی تاکہ ایہام و رمز پیدا ہو، مثلاً

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا تو نے داغ

ایک ہی شعر میں مفرد اور جمع کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی نے نکات سخن میں لکھا ہی کہ انھوں نے اپنے استاد منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی کو ابتدائی مشق کے زمانہ میں اپنی ایک غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی جس کا مطلع یہ تھا

ملتے ہیں اس طرح سے کہ گویا خفا نہیں کیا آپ کی نگاہ سے ہم آشنا نہیں

منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرعہ بدل کر یوں کر دیا "ملتے ہو اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں" اور دوسرا مصرع جیسا تھا ویسا رہنے دیا۔ گویا ان کے نزدیک تم کے ساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا اگرچہ حسرت کا خیال ہی کہ تم اور آپ اور تو اور تم کا اجتماع قابل احتراز ہی لیکن واقعہ یہ ہی کہ اس باب میں ان کے استاد کا مسلک غزل کی ٹکنک کے نقطۂ نظر سے بہتر اور صحیح معلوم ہوتا ہی۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کے اجتماع سے شعر کی رمزی کیفیت بڑھ جاتی ہی اور کسی قسم کی تعقید نہیں پیدا ہوتی۔ مطلب میں تعین کے بجائے ایک قسم کا ایہام

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے غالب
دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی دنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے فانی

بعض اوقات حذف کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول دیا جاتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر حاصل ہوتا ہے اس لیے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً غالب کو یہ کہنا ہے کہ فلک کے ظلم معشوق کے ستم سے کم نہیں اس مضمون کے لیے یہ انداز اختیار کرتے ہیں

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اسی مضمون کا صبا لکھنوی کا یہ شعر ہے جو کسی طرح غالب کے شعر سے کم نہیں

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مومن خاں جذبۂ رشک کے تحت اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر سے سرگوشیاں نہ کیجیے بلکہ میری طرف التفات فرمائیے لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ غیر کی طرف پہلے متوجہ ہو لیجیے حالانکہ ان کا مدعا اس کے بالکل برخلاف ہے

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

مقصود صرف اپنے گریبان کے چاک کی وسعت بتانا ہے لیکن اس ضمن میں دست جنوں کے صدقے جاتے ہیں اور یہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں

دست جنوں کے جائیے صدقے کہ چین سے پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر بعض وقت ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی تکلم سے غیبت کی طرف کبھی غیبت سے تکلم کی طرف کبھی خطاب سے تکلم کی طرف اور کبھی خطاب سے غیبت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے کبھی مفرد اور جمع کے صیغے ایک ہی شعر میں برتے جاتے ہیں دراصل یہ سب رمزی طلسم کے کرشمے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ نثر میں یہ سب باتیں عیب ہیں اور غزل میں انھیں حسن ادا کی سند حاصل ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں

پوری قدرت نہ ہو اس وقت تک طرز ادا میں جدت اور دلکشی نہیں آسکتی حسن ادا کے لیے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں وہی معمولی باتیں ہیں جنھیں سب کہتے ہیں ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

قطرۂ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے لیکن غالب نے اس مضمون میں ندرت اور نزاکت کی رنگا رنگی سمو دی ہے وہ کہتا ہے کہ قطرۂ اشک کی قدر و قیمت گہر سے زیادہ ہے اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے پہلے یہ دعویٰ پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہوگی یہ قطرہ کی پست ہمتی ہے کہ وہ گہر بننے پر قناعت کرتا ہے۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رتبہ کی معراج ہوتی شعر میں دعوی سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہتا ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں حسن ادا کے لیے جو قدر مشترک ہے وہ رمزی اثر آفرینی ہے چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلتے ہوں یا خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنے فکری اور جذباتی محسوسات کی صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہوگیا ہے تو ضرور ہے کہ وہ ایمائی اثر پیدا کرسکے گا۔ محسوسات کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے ضروری ہے کہ وہ انھیں حقیقت سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنایہ کی طرف لے جانا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے شعری بلاغت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا اہتمام بھی ہونا چاہیئے کہ رمزی اور مجازی معنی حقیقت سے بالکل منقطع تو نہیں ہوسکتے۔ مجاز اور رمز کی دنیا میں جس سے غزل عبارت ہے امر عق میں تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسن ادا جلوہ گر ہو غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوسکتے اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے۔

میر صاحب ہوں یا غالب، مومن ہوں یا ذوق حسرت ہوں یا جگر ان سبھوں میں تغزل کے بعض مشترک اجزا ملتے ہیں وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربوں کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ طویل ہو

اور پھیلاؤ آجاتا ہے جس سے شعری احساس لطف اندوز ہوتا ہے لیکن رمزی علامتوں کو برتنے میں اگر خاص قرینے سے کام نہیں لیا گیا تو لطف سخن حاصل ہونا تو کجا وہی بات ذوق پر گراں گذرے گی۔

یہی حال رعایت لفظی کا ہے اگر اس سے شعر کی رمزی اور ایمائی کیفیت بلا کسی تکلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا ورنہ اگر یہ احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہوگی مندرجہ ذیل لفظی رعایتیں اس قسم کی ہیں

سنگدل ہم نے بنایا ہے یہ مرمر شیشہ	توڑ دل کا نہ میرے مار کے پتھر شیشہ	شاہ نصیر
بڑی محنت سے میں نے یہ ثمر جاڑے میں پالا ہے	کیا ہے تازہ نخل غم کو آہیں سرد بھر بھر کر	امانت
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا	دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا	ناسخ

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایت لفظی جدت ادا میں جان ڈال دیتی ہے اور [illegible]ر کا معنوی اور رمزی اثر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

رکھ کے شیشہ کہے ہے یا اُستاد	[illegible]رے سنگِ مزار پر فرہاد	میر
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم	گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم	"
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا	بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا	غالب
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی	عمر ہر چند کہ ہے برق خرام	"
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں	"
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے	اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا	"
تمہارے آئیو ائے طرہ ہائے خم بہ خم آگے	یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے	"

اس قسم کی مثالوں سے غالب کا دیوان بھرا پڑا ہے اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایت لفظی سے کلام کی شگفتگی بلندی اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح حسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی اسی طرح شعر کے حسن ادا کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی جو صورتیں جمع ہوتی ہیں ان کے اظہار پر جب تک

خورشیدالاسلام

امراؤ جان ادا

پریم چند بجائے خود ایک ادارہ ہیں اور ان کی ناول نگاری ایک معنی میں ادبی، سیاسی اور لسانی تحریک ہے ان کی مقبولیت ایک ایسا دائرہ ہے جس کا مرکز دریافت کرنا آسان بات نہیں ان کے ناولوں کے نام سبھی جانتے ہیں مگر ہماری زبان میں ایک ناول ایسا بھی ہے جو فن کے اعتبار سے خاصہ کی چیز سمجھا جاتا ہے پھر بھی اس کے نام سے کم لوگ واقف ہیں، اس ناول کا نام "امراؤ جان ادا" ہے آپ چاہیں تو اسے "خانم" بھی کہہ سکتے ہیں، "یاد ایام" بھی کہہ سکتے ہیں اس کتاب کا نام "رسوائیاں" بھی ہو سکتا ہے۔ نام اکثر ستم ظریف ہوتے ہیں اور ان سے کبھی دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ اس کا نام امراؤ جان ہے لیکن امراؤ جان کہانی نہیں ہے امراؤ جان اس ناول کا ایک کردار ہے مگر وہ کوئی ایسا کردار نہیں ہے جس کے شہر اس زندگی کے تمام دائروں اور گوشوں پر حاوی ہوں جو فن کار کے جادو سے اس کتاب میں نظر بند ہو گئی ہے وہ دیکھنے والی آنکھ ہے، مبصر ہے، وہ خود تماشہ بھی ہے اور تماشائی بھی مگر وہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے ناول کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے ورنہ فن اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے موضوع اپنی وسعتیں رکھتا ہے اپنے حدود بھی رکھتا ہے وہ اپنا ساز و سامان بھی رکھتا ہے اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ان تقاضوں کو پورا کرنا وقت کی نبض شناسی کا لحاظ رکھنا اور فطرت کی ان لہروں کو بہتے ہوئے دکھانا جو گرد و پیش مزاج اور واقعات کی ساخت و پرداخت کرتی ہیں یہی فن کار کا کام ہے موضوع سے واقفیت حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے زندگی اور فن کے مطالبوں کو پا گئے ہیں ان کی کسوٹی پر ہم تصویر، تفصیل، تصادم اور ترجمانی کو پرکھ سکتے ہیں سوال یہ ہے کہ اس ناول کا موضوع کیا ہے؟

رسوا ابتدا ہی میں ہمارا تعارف امراؤ جان سے اس طرح کراتے ہیں "اسی کمرہ کے برابر

ایک لمحہ کا تجربہ زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو کچھ زیادہ عرصہ تک محسوس کیا گیا ہو۔ اور غیبی جذب کا نتیجہ ہو۔ غزل کا ایک شعر ایک خاص تجربہ کا اظہار ہے۔ تغزل کے لیے تو وہ تجربے زیادہ قدر و قیمت رکھتے ہیں جو حسن و عشق کی دنیا میں پیش آئیں کہ اس کے یہی ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کرنا چاہیے۔ چونکہ اثر آفرینی میں ابہام مقصود ہوتا ہے اس لیے تغزل میں رمز و ایما کا اسلوب برتا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ مبہم کیفیت اندرونی تجربے پر مبنی ہوتی ہے اس واسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ بعض غزل گو شاعروں کے ہاں دوسروں کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے جیسے مصحفی اور جرأت وغیرہ ان دونوں کا تغزل اعلیٰ پایہ کا ہے لیکن ان کو وہ رتبہ کبھی نہیں ملا جو میر یا غالب کو نصیب ہوا۔ خارجیت لازمی طور پر بیان کی صفائی اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے جو تغزل کے لیے سازگار نہیں جس کا خمیر رمز و ابہام سے بنا ہے۔

غزل گو شاعر کے دل کو رموز و ابہام اس لیے عزیز ہیں کہ وہ جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انھیں سے ممکن ہے۔ دن کی روشنی کے مقابلے میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول فرانسیسی مفکر گوئیو اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت۔ خارجی عالم کی اشیاء چھلکی ہوئی چاندنی میں عجیب و غریب پراسرار کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کے خد و خال ہی بدل جاتے ہیں وہ شخص جو مکان کی پیمائش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کی لمبائی جو اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو چاہیے کہ دن کی روشنی میں انھیں دیکھے لیکن وہ شخص جسکو یہ مطلوب نہیں وہ چاندنی رات میں مکانوں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا لذت اندوز ہوگا اتنا دن کی روشنی میں نہیں ہو سکتا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے دھوپ چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری مبہم صورت جو دل کے تاروں کو چھیڑے اہل نظر کو محبوب ہوتی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے شفقی دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں دل کیوں پراسرار کیفیت محسوس کرتا ہے؟ صبح اور شام کی مبہم کیفیت روحانی تزکیہ کے لیے موزوں خیال کی جاتی ہے دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے لیے عبادتیں رکھی گئی ہیں فطرت کا ابہام جذبات میں تحیر کی آمیزش کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ حسن و عشق کی رنگینیوں اور کیفیتوں کی تکمیل کے لیے سوا اس فضا کے کوئی اور دوسری سازگار نہیں ہو سکتی۔

تغزل کے ابہام کی بھی یہی توجیہہ ہے۔ ابہام اس کا عیب نہیں ہنر ہے۔ (۲۰ر جنوری ۱۹۳۶ء)

نوکر تھے....... ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے
میں کمر سے لپٹ گئی بھائی ابا ابا کرکے دوڑا دامن میں چھپ گیا ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھل
جاتی ہیں ...... دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا ہوا ڈکیتوں سے
ملا ہوا تھا..... ابا سے سخت عداوت تھی۔

ان اقتباسات سے ہمیں امراؤ جان کے آغاز اور انجام دونوں سے متعلق چند ضروری خبریں
مل جاتی ہیں پیدائش کے بعد اور موت سے پہلے وہ کیا ہے؟ کس ماحول میں اس نے اپنی آنکھیں کھولیں؟
اور اب کس منزل پر آن ٹھہر گئی یہی نہیں بلکہ ہمیں خفیف سا اندازہ ان بھول بھلیوں کا بھی ہوتا
ہے جس سے امراؤ جان کو گذرنا پڑا ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی نرم نرم کہانیوں کا بھی جن کا
تانا بانا ایک خوش مذاق طوائف کے گرد بنا جاسکتا ہے گویا مرزا صاحب قصہ کے ترمیمی منظر اور اس
کی باقاعدہ تمہید ہی میں ہمیں امراؤ جان ادا سے اس طرح متعارف کرا دیتے ہیں کہ اس کی زندگی
میں کوئی راز باقی نہیں رہتا نہ ہمارے دل و دماغ میں تجسس کی کوئی اونچی لہر اٹھتی ہے اور نہ ہمیں کوئی
اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ آئندہ چل کر اس کی زندگی میں کچھ ایسے انکشافات آئیں گے جو ہماری
تسکین کا باعث اور تحیر کا سامان ہوں گے اوپر دئے ہوئے چند ٹکڑوں کی مدد سے ہم کئی منزلیں طے
کرجاتے ہیں امراؤ جان ایک طوائف تھی اب تائب ہو چکی ہے شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہے ادب کے چند
اصناف سے واقف ہے خود شاعرہ ہے۔ بچپن ایک شریف متوسط گھرانے میں گذرا۔ یہاں اس کا نام
امراؤ جان نہیں کچھ اور ہوگا دلاور خاں کی اس کے باپ سے دشمنی تھی اس نے اس معصوم گھر کی چہار دیواری
سے نکال کر ایک ایسی دنیا میں پھینک دیا جہاں دوزخ مہکتے ہیں اور فردوس خاموش ہیں۔

اس خاکہ پر ہماری آنکھیں جم نہیں جاتیں اور ہم اس کی تہوں کو کھولنے اور اس کے بھید کو
ٹٹولنے کی بجائے ادھر ادھر دیکھنا شروع کرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس تلاش پر آمادہ ہوں
اور اپنی نگاہ کے دامن کو دور تک پھیلائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں
ایک مقام اور دیکھتے چلیں البتہ اس کے لیے جست لگانا ضروری ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں کہانی

ایک کمرہ تھا اس میں ایک طوائف رہتی تھی بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا نہ کمرہ پر
کسی نے سرِ راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی دروازوں پر دن رات پردے پڑے رہتے تھے
چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل تعفل رہتا تھا گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا اسی سے نوکر چاکر
آتے جاتے تھے اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرہ میں کوئی رہتا
بھی ہے کہ نہیں جس کمرہ میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی مگر اس میں کپڑا
پڑا ہوا تھا ..... اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا اس کھڑکی کی طرف سے واہ کی آواز آئی میں چپ
ہو گیا..... منشی محمد حسین نے پکار کر کہا غائبانہ تعارف ٹھیک نہیں ..... ابھی قصہ شروع نہیں ہوا
ہے نہ مرزا نے مشاعرہ کی محفل جاتی ہے ہم امراؤ جان کے ہمسایہ میں لے جائے گئے اتنے میں رسوا ہمیں
پاس آنے کا اشارہ کرتے ہیں ہم رسوا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دراز سے جھانکتے ہیں اور ہمیں امراؤ جان
کے بارے میں چند ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں وہ ایک طوائف ہے اس کی بود و باش پردہ وا لیوں
کی سی ہے، موسیقی سے لگاؤ رکھتی ہے اس کے بعد امراؤ جان مشاعرے میں آتی ہیں یا ترغیب دے کر
لائی جاتی ہیں اور اپنی غزل پیش کرتی ہیں

منشی صاحب "اچھا وہ مطلع کیا تھا"؟

امراؤ ۔ "میں عرض کئے دیتی ہوں"

کعبہ میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب ۔ خوب کہا ہے!

خاں صاحب ۔ اچھا مطلع کہا ہے مگر "بھول گیا" کیوں ؟

امراؤ جان ۔ تو خاں صاحب! کیا میں ریختی کہتی ہوں؟

اب وہ عبارت دیکھئے جہاں اصل قصہ کا آغاز ہوتا ہے "ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد
میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا میرا مکان پختہ تھا آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھونپڑے
کچھ کھپریلیں رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے ...... میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرہ پر

پہلی ۔ "تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟"

میں ۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں"

پہلی ۔ "تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟"

میں ۔ "(آنکھوں سے آنسو جاری تھے بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں"

دوسری۔ "کیا تم ذات کی پتریا ہو؟"

میں ۔ " ذات کی پتریا تو نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پوری کرتی ہوں"

پہلی ۔ (خود رو کر) "اچھا تو روتی کیوں ہو آخر کہو تم کون ہو؟"

میں (آنسو پونچھ کر) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔"

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کر کی تھیں اب بالکل تاب ضبط نہ تھی۔ سینہ میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کر کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا دوسری کو دکھایا اور کہا "کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے"
دوسری۔ "ہائے میری امیرن" کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کر رونے لگیں ہچکیاں بندھ گئیں۔

دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے، سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر آیا میں نے حقہ بھروا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے۔ ماما کو چپکے سے بلا کے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرہ میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان ۔ "کل تمہیں مجرے کو گئی تھیں؟" یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔

میں ۔ "ہاں" اتنا کہہ کر اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

تین چوتھائی ہو چکی ہے امراؤ فیض آباد میں ہے صدیوں بعد زمانہ نے ایک ایسی کروٹ لی ہے کہ سخت و سست ہموار ہو گئے ہیں غدر کی آگ دب ہو چکی ہے مگر کہیں کہیں چنگاریاں اٹھتی دکھائی دیتی ہیں امراؤ جان زندگی کی گردان کئے جا رہی ہے اپنے وطن میں ہے مگر سب کے لیے بیگانہ ہے اب یہ اقتباس دیکھئے " دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا اس کی تیاری کرنے لگی جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں کئی محلہ کا نام یاد نہیں مکان کے پاس بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا اسی کے نیچے تم گیرتا نا گیا تھا ...... اس مقام کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی دل اندا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی ...... ایک مکان کے دروازہ کو غور سے دیکھا کہ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں ماں کے قدموں پر گردوں وہ گلے لگالیں گی مگر جرات نہ ہوتی تھی .... پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے تڑپ رہی ہوں ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکر پوچھا " تمہیں لکھنؤ سے آئی ہو ؟"

میں ۔ "ہاں" اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا۔

عورت ۔ "اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمہیں کوئی بلاتا ہے"

میں ۔ "اچھا" کہہ کر اس کے ساتھ چلی ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا ...... وہ عورت اس مکان کے دروازہ پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکر کھڑی ہوئیں۔

ایک ۔ "لکھنؤ سے تمہیں آئی ہو؟"

میں ۔ "جی ہاں"!

دوسری ۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

میں ۔ ابھی میں تو آیا کہہ دوں امیرن مگر پھر دل کو تھام کے، "امراؤ جان"

اور دیواروں کو گرانے کا حوصلہ کرتا ہوا، خود سے دور، دوسروں سے متصادم ہوتا ہوا اپنی شکست کا احساس کرتا اور آنسوؤں میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نوجوان عبائی سے امراؤ کا سامنا ایک میزان ہے جس میں قدرت اس کے اعمال تولتی ہے۔ وہ نوجوان امراؤ کا ماضی ہے تازہ، شاداب، زندگی کی پاکیوں سے چور، بے فکر جس کا ہر عمل برگزیدہ ہے کیونکہ وہ گناہ کے تصور سے آشنا نہیں مگر یہ ماضی تنگ بھی ہے اس میں زندگی کی وسعتیں نہیں امراؤ جان کا نفس اس کا حال ہے جو گھائل ہے بھی اور نہیں بھی جس میں سرشاریاں ہیں بھی اور نہیں بھی جس میں جیت بھی ہوتی ہے اور ہار بھی ہوتی ہے جس میں عمل کا میدان بہت وسیع ہے مگر ہر سانس میں گناہ کا احساس ہوتا ہے اس تباین یا تصادم میں امراؤ اپنے نفس کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نظر آتی ہے اس کے گلے پر چھری رکھ دی جاتی ہے اور وہ اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کیفیت وقتی ہے، عارضی ہے اس میں قلب ماہیت کی قوت نہیں امراؤ جان کی زندگی پھر ایک نرم سیر دریا کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اس میں نہ کوئی انقلاب آتا ہے، نہ اسے کوئی نئی منزل دکھائی دیتی ہے نہ وہ اپنے آپ سے فرار کرتی ہے، نہ اس کے دماغ کا آہن پگھل کر آئینہ بنتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ واقعہ نہ کسی راز کا انکشاف کرتا ہے نہ ان واقعات کو ان حدود تک پہنچاتا ہے جہاں وہ خود بہ خود حل ہوتے ہوئے نظر آئیں نہ وہ کہانی میں، یا امراؤ جان کی زندگی میں کوئی زبردست یا معمولی تبدیلی پیدا کرتا ہے نہ اس کے بعد کہانی ختم ہوتی ہے نہ اس کا ختم ہونا یا ختم کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ واقعہ کہانی کا یا امراؤ جان کی زندگی کا نقطۂ عروج نہیں ہے اگر یہ واقعہ کہانی کا نقطۂ عروج ہوتا تو یہ کہانی امراؤ جان کی کہانی ہوتی اور اگر یہ امراؤ جان کی محدود واقعاتی زندگی کا نقطۂ عروج ہوتا تو اس کی زندگی اور ہو جاتی خودکشی اور خانقاہ کے علاوہ بھی کچھ مقامات ہیں اور ہمیں امراؤ جان ان مقامات پر کہیں نہ کہیں دکھائی دیتی زندگی کا دھارا کس رفتار سے اور کن صحراؤں اور وادیوں سے گزرتا اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں وقت کی خوبی یہی ہے کہ گزر جاتا ہے اس مسئلہ پر اس قدر تفصیل کی ضرورت نہ ہوتی اگر بعض ناقدوں نے اس ناول کو امراؤ جان کی کہانی سے تعبیر نہ کیا ہوتا مثال کے طور پر علی عباس حسینی اپنی کتاب "ناول کی تاریخ و تنقید" میں لکھتے ہیں "یہ ایک رنڈی کی کہانی اسی کی زبانی ہے"

جوان ۔ سر نیچا کرکے، "خوب گھرانے کا نام روشن کیا"!

میں ۔ (اب سمجھی یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان ۔ "ہم سمجھے تھے کہ تم مرگئیں تم اب تک زندہ ہو"۔

میں ۔ "بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے"

جوان "بے شک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا کچھ کھا کر سو رہی ہوتیں"۔

میں ۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔ اب سہی"۔

جوان ۔ "اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو تمہیں اس محلہ میں مجرے کو آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں"۔

میں ۔ "ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا"۔

جوان ۔ "اچھا اب تو معلوم ہو گیا"۔

میں ۔ "اب کیا ہوتا ہے"۔

جوان (بہت ہی غصہ ہوکر) اب کیا ہوتا ہے، اب کیا ہوتا ہے! اب ۔ (چھری کمر سے نکال کے مجھ پہ جھپٹا دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پہ چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے! اتنے میں ماما بازار سے پان لے کر آئی اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے ۔ ارے دوڑو۔ بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے!!

جوان (چھری گلے سے ہٹا کر ہاتھ چھوڑ دئے) "عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی......"
اتنا کہہ کر ڈاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

یہ اقتباس خاصہ طویل ہے لیکن اس کا حوالہ بہت ضروری تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ٹکڑے میں ڈرامہ کی توانائی ہے، یہ سنسنی خیز بھی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں امراؤ جان کی پچھلی زندگی کا سارا خون کھنچ آیا ہے۔ اس ڈرامائی ٹکڑے میں امراؤ جان کے دل و دماغ کی ہلچل نظر آتی ہے۔ دماغ خود ایک کردار کی حیثیت سے کام کرتا ہے وہ ہمیں جھجکتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑھ کر پیچھے ہٹتا ہوا پردوں کو چیرتا

عیش باغ کے میلے کی ہماہمی ان طوائفوں کی بدولت ہے اور نہ ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔ ڈاکوؤں کے جرگے صرف سنسنی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہیں پھر وہ مولوی صاحب جو نیم کے درخت پر چڑھائے جاتے ہیں اتنی سی بات پر کہ انھوں نے دھنتو (بسم اللہ جان کی بندریا) کو لاٹھی دکھا کر ڈرا دیا تھا۔ وہی جن سے بسم اللہ کہتی ہیں "چڑھ جاؤ" مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے۔ عبا شریف کو تختوں کے چوکے پر چھوڑا نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا اس نے اک ذرا چیں بہ چیں ہو کر کہا۔ ہوں۔ آخر درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے اور وہ نوجوان مولوی جو کانپور کی مسجد میں رہتے ہیں امراؤ جان سے پارسائی جتاتے ہیں جن کے منھ پر جوتی پن سا ہے مگر آدمی کام کے ہیں ہر بات پر لاحول پڑھتے ہیں اور پوچھتے ہیں "آپ کا مطلب" شاید ان کے جون میں شیطان ہے مگر وہ بڑی بی "گوری سی، منھ پر جھریاں پڑی ہوئی ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں۔ ہانپتی کانپتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ پان لے کے کھایا بولیں" بارے ہمارے شہر کی تمیز داری" ان کے علاوہ لڈن کی ماں جو دنیا بھر کو اپنی سوت سمجھتی ہیں کسی کی دبیل نہیں جن کا انداز یہ ہے، دیکھیں تو تم ہمارا کیا بناتی ہو" منھ بناؤ جوتیاں مارنے کی بڑی بیچاری امراؤ جان سے ارشاد کرتی ہیں" مجھ سے تو کچھ نہ بولنا مال زادی تجھے تو کچا ہی کھا جاؤں گی" پھر لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہیں پھر حسین علی اور اس کی جورو منے اور اس کی ماں پٹھانی کلثن، جو بڑے مشہوروں میں تھی پھر بیبیاں سعادت جن کی" والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا" مکان کے پاس ایک تکیہ تھا وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں، پھر رجب کی نوچندی اور درگاہ کی زیارت غرض یہ تو ایب، مولوی، ڈاکو اور کٹنیاں، مختار اور سگین، مشاعرے اور میلے، مکھیاں بھنکتے ہوئے گھر اور مرغیوں سے آباد تکیے، دکانیں، سرائے اور محلات، شاعر اور ان کے شاگرد، فقیر فقرا اور ضعیف الاعتقادی کے کرشمے یہ سب چند طوائفوں کی سیرتیں بنانے، بگاڑنے ابھارنے اور مٹانے کے لیے وجود میں نہیں آتے ان کا اپنا اپنا مصرف، اور اپنی میزان ہے انھیں ہم طوائفوں کی قدر و قیمت کے پیمانہ سے نہیں جانچتے، وہ خود اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں امراؤ جان یا کوئی اور طوائف ان کرداروں اور ان نظاروں

اتنی باتیں کہہ چکنے اور اتنا راستہ طے کر جانے کے باوجود ہم تقریباً وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے آخر اس ناول کا موضوع کیا ہے؟ امراؤ جان نہیں ہرگز نہیں۔ ممکن ہے اس کا موضوع طوائفوں کی زندگی ہو۔ علی عباس حسینی اس کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم دیا مادی پٹ) کو یاد کرتے ہیں اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ خانم بوا حسینی خورشید اور بسم اللہ ہمیں بھولتی نہیں رسوانے یہ فانوس روشن کئے ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں ان کی روشنی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے یہ فانوس اپنی اپنی قدر و قیمت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چھوٹے موٹے جہان ہیں جو خانم کے آسمان تلے گردش کرتے ہیں اور ہم کچھ ان کے ارد گرد دیکھتے ہیں وہ انہی کے دم سے انہی کو اجاگر کرنے کے لیے انہی کی گردش تیز کرنے اور انہی کو فروغ دینے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے؟ دوسرے یہ کہ ان کی زندگیاں بھرپور اور مکمل ہیں۔ کیا مولوی صاحب اس کہانی میں اس لیے تماشہ کرتے ہیں کہ وہ بسم اللہ جان اور امراؤ جان کی زندگی کو آگے بڑھائیں اور ان کی سیرتوں کو روشن اور منور کریں۔ کیا راشد اس میدان میں اس لیے آتے ہیں کہ وہ امراؤ جان کی دکان لگانے میں مدد کریں اور چلے جائیں۔

فیضو ستارے کی طرح ٹوٹتے دم بھر چمکتے اپنی قوت کا احساس دلانے اور غائب ہو جاتے ہیں محض اس لیے کہ وہ امراؤ جان کو لکھنؤ کی گلیوں سے نکال کر کانپور کے ویران کوچوں میں پھینک دیں؟ نواب سلطان" جن کے لیے ہوئے تھے "تخلئے کا جلسہ آپس میں چہلیں، بے تکلفی کی باتیں امراؤ جان کو تڑپاتی ہیں نواب چھبن جن کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب خانم کہتی ہیں" حضور کو معلوم نہیں کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہیں کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو ہے، لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا۔ یوں آیئے آپ کا گھر ہے۔ میں منع نہیں کرتی مگر آپ کو اپنی عزت کا آپ خیال چاہئے" اور ہاں وہ نواب جن کا نام بھول سکتا ہے مگر سیرت نہیں بھولتی نواب جعفر علی خاں سن شریف کوئی ستر برس کے قریب بوڑھے ہو گئے تھے مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی کھلائی آکے زبردستی اٹھالے جاتی تھی" کیا یہ محض گاہک ہیں؟ ان کا کام یہ ہے کہ خانم کی نوچیوں کو گلستان سعدی کا باب پنجم پڑھائیں اور بس! پھر یہ طویل مشاعرہ کیوں؟

والیوں تک ہوتی ہے جن کا اخلاق فوری ضرورتوں کا پابند ہے۔ کان پور کے مولوی صاحب ہیں ایک خاص طبقہ تک پہنچاتے ہیں جن کے بارے میں حالی نے کہا ہے "وہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت" ہم ان میں سے جس کسی کو دیکھتے ہیں ناول کی دنیا میں دیکھتے ہیں اور ناول کی فضا میں یہ کردار ایک خاص زاویہ نظر کو چھپائے ہوئے آتے ہیں وہ زاویۂ نظر فن کی باریکیوں میں ڈوبنے سے ہاتھ آتا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں کردار مضحک خاکے ہیں تو دراصل ہم اس زاویۂ نظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان واقعات کی ترتیب میں چھپا ہوا ہے جن کی بدولت وہ فن کار کے ذہن سے کاغذی پیرہن میں منتقل ہوئے ہیں بہرحال امراؤ جان کے تقریباً سبھی کردار دو حیثیتیں رکھتے ہیں ہم ان میں سے جس کسی کو دیکھتے ہیں وہ پکار اٹھتا ہے "میں زندہ ہوں میں اپنی زندگی کا ثبوت بھی دے چکا ہوں یہ زندگی میری زندگی ہے یہ خود بڑھتی اور پھیلتی ہے لیکن میں ایک استعارہ بھی ہوں میں اس مخلوق کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو میرے اردگرد بکھری ہوئی ہے وہ میری طرح پندار میں گرفتار ہے مظلوم ہے فریب خوردہ ہے آلودگی یا آسودگی میں مبتلا ہے اس میں طاقت ہے مگر آپ اپنا شکار ہے وہ محروم ہے مگر اپنی محرومیوں کو مژدہ بنا کر پیش کرتی ہے وہ بظاہر کتنی بلند ہے لیکن اس کی تہ میں کچھ بھی نہیں وہ ضرب لگاتی ہے مگر خواب و خیال میں وہ شکست کھاتی ہے مگر تلملاتی نہیں وہ ہنستی بھی ہے اور روتی بھی ہے مگر اس کے ہنسنے میں تازگی ہے نہ رونے میں پیاس"۔

مختصر یہ کہ بیشتر کردار ایک وسیلہ ہیں جن کی مدد سے ہم چند طبقوں کو دیکھتے ہیں مگر ان طبقوں کی زندگی تو درکنار ان کرداروں کی زندگی بھی طوائفوں پر موقوف نہیں اور نہ بڑی حد تک ان کی معاون ہے ان میں سے ہر ایک طوائف کی کہانی چند جملوں میں سنائی جا سکتی ہے اور یہ کہانی دوسری طوائف کی کہانی سے بالکل آزاد ہوگی۔ ان سب کی مجموعی داستان بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ سب طوائفیں تھیں ناول نگار کی تمام صلاحیتیں بھی ان کی مصوری پر صرف نہیں ہوتیں اور ناول کا سارا مواد بھی ان کی نواؤں اور فضاؤں میں حل نہیں ہوتا میلے، مشاعرے، مجرے ہم یقیناً ایک طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں لیکن یہ آنکھ ہمیں بہت دور لے جاتی ہے۔ ان جلسوں میں ہمیں منچلے عاشق اور پیشہ ور عیاش ہی نہیں ان کے علاوہ کچھ اور بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کی تہ میں کوئی ایسی

پر غالب نہیں آتی البتہ ان سب کو ہم ایک تجربہ کار طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی خود وہ طوائف پس منظر میں غائب ہو جاتی ہے اور ہمارے سامنے ایک ڈرامائی ٹکڑا آتا ہے جہاں کسی کردار کا ذہن بے نقاب ہوتا ہے دو یا دو سے زیادہ ذہن متصادم ہوتے ہیں یا پلاٹ میں کسی غیر متوقع واقع سے سنسنی پیدا کی جاتی ہے ناول ایک بار پڑھنے کے بعد ہمیں خورشید بسم اللہ جان، خانم اور بوا حسینی یاد رہتی ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسوا نے ان خاکوں میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے ان کا دائرۂ عمل بہت محدود ہے یہ ایک حد تک اپنے لیے مگر بڑی حد تک دوسروں کے لیے زندہ ہیں ان کی افادیت اور زندگی اس پر موقوف ہے کہ یہ ایک وسیع منظر کا تعارف ہیں اور اسے ہمارے سامنے لا کر یا اس کے چند نقش و نگار دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک وقت پر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے مگر ان کے شعور کی لہریں سعی و عمل میں اپنا بھرپور اظہار نہیں کرتیں ان میں سے ایک کردار بھی "یا مادی پٹ" کی جینی سے لگا نہیں کھاتا ان کی زندگی کے واقعات ایک دوسرے کی زندگی کے واقعات سے گتھے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ان کو تحریک دیتے ہیں ان کی ذہنی کشمکش جذباتی ہیجان، کمزوریاں اور اچھائیاں، دوسروں پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتیں کہ ناول کا پلاٹ ان کی رمیدگی اور خرام کی ایک مسلسل رو میں تبدیل ہو جائے۔ ناول کی زندگی اس صندوق میں بند نہیں ہے جس کے چاند تارے خورشید اور بسم اللہ ہوں اور باقی کردار ان چاند تاروں کے اشاروں اور سہاروں سے منظر عام پر آئیں اور چلے جائیں دوسرے یہ کہ ان طوائفوں میں اور ان کے علاوہ جو کردار ہیں ان میں سے ہر ایک دو حیثیتیں رکھتا ہے۔ یہ رسوا کا کمال ہے کہ اس نے اپنے قلم کی چند جنبشوں سے انھیں مکمل شخصیت بنا دیا ہے ان میں سے ہر ایک اک فرد بھی ہے اور اک جماعت کا نمائندہ بھی ہے وہ ایک ذات بھی ہے اور جماعت کے کسی خاص پہلو کو آب و تاب کے ساتھ پیش بھی کرتا ہے وہ ایک شخص بھی ہے اور ایک وسیلہ بھی نواب سلطان ایک خاص پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں توازن ہے نواب چھبن ایک دوسرے پہلو کی ان میں جرأت ہے۔ راشد ایک اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مصنوعی پندار میں مبتلا ہے۔ فیض علی اپنے گروہ کا نمائندہ ہے جس کی قوتیں مناسب راہ نہیں پاتیں، مختار کے ذریعہ ہم ادنیٰ متوسط درجے کا تماشہ کرتے ہیں جو تقدیر پرست ہے۔ بی آبادی کے ذریعہ سے ہماری رسائی لقندریوں اور مرغیاں نہکانے

ان سب کو پائمال ہوتے ہوئے دیکھ لیا، امراؤ جان اس قسم کا ناول نہیں ہے وہ نہ امراؤ جان کی کہانی ہے نہ طوائفوں کی روئداد ہے نہ اس میں چند انسانوں کی شکست و کامرانی ہے جو دھیرے دھیرے عدم سے ابھرتی ہوئی نظر آئے اور ہمیں بار بار یقین دلائے "میں ایک تصویر ہوں۔ میں سچی ہوں ذرا میرا آب و رنگ تو دیکھو"۔

امراؤ جان کا موضوع زوال ہے یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے اور وہ معاشرت اودھ کے چند شہروں تک محدود ہے رسوا اس معاشرت کی تصویر دکھانا چاہتے تھے ان کے ذہن میں اس کا ایک تصور بھی تھا، ان کے چاروں طرف اس کا مواد بکھرا ہوا تھا اور یہ مواد آسانی سے گرفت میں لانا محال تھا ان میں اتنی قوت بھی تھی کہ اسے براہ راست استعمال کر سکیں اور جہاں سے چاہیں بنتے چلے جائیں۔ سرشار تو ایک دیوزاد تھا اتنے وسیع پلاٹ پر کام کرنا رسوا کے بس کی بات نہ تھی ان میں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ وہ ناممکن کو ممکن اور ممکن کو قطعی ثابت کر دکھائیں وہ ہر سچے فن کار کی طرح شرمیلے تھے اور انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ وہ ہر وقفہ کے بعد پکار کر کہیں "تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیئے میں تمہیں جو کچھ دکھا رہا ہوں وہ ایسا ہی ہے میں سب کچھ جانتا ہوں"۔

منزل تک پہنچنے میں کئی دشواریاں تھیں تصویر مختصر پلان پر بنائی جائے ادھوری نہ ہو، فن کار کی شخصیت نظروں سے اوجھل رہے۔ ہر پہلو اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے جگہ پائے، کوئی ایسا منظر ہو جہاں سے زندگی کا ہر گوشہ نظر آئے اور اس منظر کی بدولت ان سب کا مفہوم واضح ہو جائے ان شرائط کے ساتھ زوال پذیر معاشرت کا مطالعہ کرنے کے لیے خانم کے نگار خانے سے بہتر کوئی اور منظر نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ خانقاہ میں یہ پہلو نظر نہ آتے، نوابین کے ایوانوں اور شبستانوں میں چند جھلکیاں دکھائی دے جاتیں مگر تصویر ناتمام رہتی فیض آباد کے کسی محلہ میں نوابین اور بیگمات کا گذر نہ ہوتا نہ عیش باغ کے میلے اور لکھنؤ کے مشاعروں کی ہما ہمی دکھائی دیتی اس لیے رسوا نے خانم کی دکان تلاش کی اس دکان میں ہر قسم کا سامان تھا اور اس کے گاہک اس معاشرت میں دور و نزدیک پھیلے ہوئے تھے یہ گاہک ہر درجہ کے لوگ تھے ان کے اخلاقی معیار خاصے مختلف تھے ان میں فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے بھی تھے اور وحشی بھی مگر ان سب میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک قہوہ پی پی کر زندگی کا ثبوت دیتا تھا رفتہ رفتہ قہوہ زندگی کا مفہوم اختیار کر گیا اور زندگی کا اپنا کوئی مفہوم باقی نہ رہا بہر حال یہ منظر تھا

چیز نظر آتی ہے جس سے مختلف آوازوں میں زیر و بم اور مختلف اجزا میں معنوی ربط اور تسلسل اور آہنگ
پیدا ہوتا ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ طوائفوں کی زندگی اس ناول کا موضوع نہیں ہے اب ہم اپنے منطقی
نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کی اجازت سے غلط بحث ہی کی خاطر سہی میں ایک اور گریز کرنا چاہتا ہوں
کہیں اس ناول کا موضوع یہ تو نہیں کہ چند آدمی اپنی زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں؟ اس کے جواب میں
چند اشارے کافی ہیں ہم اگر چند انسانوں کو زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں انھیں اول سے
آخر تک دیکھنا ہوگا ہم انھیں جم کر اور استقلال کے ساتھ دیکھیں گے ان کا ماحول محدود ہونا چاہیے اور
انھیں اپنے ماحول میں اس طرح پیوست ہونا چاہیے کہ ہزار کوشش کے باوجود ہم انھیں اس زمین سے
دور نہ کر سکیں جس میں وہ گل و لالہ کی طرح پھوٹے ہیں ہمیں اس ماحول کی تفصیل اور ان انسانوں کی
تقدیر کی جزئیات سے واقف ہونا پڑے گا ان کے ایک ایک عمل کا مشاہدہ اس طرح کرنا ہوگا جیسے ہم
ان کو تحلیل کر رہے ہیں، ان کی کہانیوں میں گہرا ربط ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان سب کی کہانی ایک ہوگی
اور وہ کہانی ایک ایسا کل ہوگی جس کا ہر جزو دوسرے جزو سے دست و گریباں ہو یہی نہیں بلکہ ان
میں سے ہر ایک اس وقت تک ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوگا جب تک وہ اپنی تقدیر کے آخری سرے
پر نہ پہنچ جائے اور جب تک ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ اس کی زندگی کا دائرہ پورا ہو گیا ایسے ناول کے ہر کردار
کو مادام باوری کے چارلس کی طرح اس وقت تک زندہ رہنا پڑے گا جب تک وہ اپنی زندگی کے معنی
نہ سمجھ لے جب تک وہ اس راز کو نہ پا جائے کہ جس عورت کو میں نے اپنی زندگی کے بہترین راز سپرد
کئے ہیں وہ میری نہیں دوسروں کی راز دار تھی جب تک اس پر یہ انکشاف نہ ہو جائے کہ دنیا میں معمولی
سے معمولی بات اک ایسا انکشاف ہے جس کی قیمت انسان اپنی جان گنوا کر ہی ادا کر سکتا ہے اسے اپنی
خبر مل جانی چاہیے اور وہ نظر بھی جو خبر کو پا لیتی ہے اور جو آگہی کے باوجود محروم ہوتی ہے کس قدر ناکارہ
ہوں میں کہ میری ساری عمر ایک عورت کی ذہنی تصویر میں رنگ بھرتے گذر گئی اور جب وہ تصویر مٹ
گئی تو پتہ چلا کہ وہ خود ساری عمر دوسری تصویروں میں رنگ بھرتی رہی" یہاں پہنچ کر اس ناول کو
ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ مادام باوری، چارلس اور ناول تینوں کا فطری انجام ہے اور ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے

میں ۔ "اگر آپ کو شوق ہو تو وہیں تشریف لے چلیے"

تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحبہ کنگھی چوٹی کر کے کپڑے بدل کے آئیں ۔۔۔ بڑے لطف کا جلسہ ہوا ۔۔۔ امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں ۔۔۔۔۔"

یہ گویا تعارف کی ابتدا ہی ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ہم امراؤ جان کو ایک مدت سے جانتے ہیں، وہ ہمارے لیے اجنبی نہیں وہ بہت سادہ اور بے تکلف ہیں اور ہماری محفل میں ان کا گاہے گاہے چلا آنا لطف سے خالی نہیں وہ خاصی دلچسپ ہیں اور ان کی زندگی میں کچھ ایسے لطائف بھی ہیں جنھیں پا کر ہمیں خوشی ہوگی مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنی روح ان کے حوالے کریں ذرا اس محفل کے خد و خال بھی دیکھتے چلیں جس میں وہ لائی گئی ہیں یہ محفل بے تکلف دوستوں کی ہی یہ لوگ دن کی دھوپ میں کیا کرتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ان میں سے ہر ایک کو شعر و سخن کا ذوق ہی ان میں ہر قسم کے شاعر ہیں، یہ فلسفہ بھی کہتے ہیں اور مذاق بھی کرتے ہیں لیکن ان سب میں روحانیت کا فقدان ہی یہ اتنے کمزور ہیں کہ بندش کی چستی پر زور دیتے ہیں ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی اور اسی لیے یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں کر سکتے ہر ہر بات پر بزرگوں کی سند لاتے ہیں مگر خود مستند نہیں ہیں یہ طوفان کے خواب دیکھتے ہیں طوفان برپا نہیں کر سکتے ان میں مجتہدین کے قابل سب ہیں اجتہاد کا کوئی قابل نہیں، پردوں کے رنگ سب دیکھتے ہیں پر وہ چاک کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں ان میں کاریگر بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں یہ پہیلیاں بوجھتے ہیں، محاورے باندھتے ہیں گرہ لگاتے ہیں، مگر کیوں ؎

کوئی پوچھے تو مرنے والے آخر کس پہ مرتے ہیں

مگر پوچھے کون؟ آخر مظہر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اس وقت اتفاق سے وارد مشاعرہ ہیں یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں روش اہل فن پہ ہنستے ہیں، رنگ بزم سخن پہ ہنستے ہیں رسوا ان نو وارد کی مدد سے گریز کرتے ہیں اس نئے احساس کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نئی نسل میں پیدا ہو چلا تھا اور ساتھ ہی ہمارے تصور میں ایک خاص قسم کی تازگی پیدا کر دیتے ہیں، یہ مشاعرہ خاصہ طویل ہی یہ نقص اس کی تاثیر میں خلل انداز ہوتا ہی مگر ہم یہ کہہ کر اس کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے اس مشاعرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا ہی اور ہمیں اس کی داد دینا پڑے گی اس میں ہمیں اس معاشرت کی پہلی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور ہمیں اس کے ساز و سامان کو دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ

جہاں سے رسوا اس خرابہ کا نظارہ کر سکتے تھے اب یہ سوال تھا کہ رسوا ان نظاروں کو خود دکھائیں یا کسی اور کو وجود میں لائیں جو ان نظاروں کا مفہوم آہستہ آہستہ پائے اور جوں جوں پاتا جائے دکھاتا چلا جائے خانم اس فرض کو انجام نہ دے سکتی تھی وہ جہاں دیدہ ضرور تھی مگر انھوں نے محض ایک جہان دیکھا تھا وہی ان کے لیے سب کچھ تھا ان کی نظر اس کے جادو کا شکار تھی اور ان کے اغراض اس کی بساط کا پیوند تھے ان میں بے لوثی نہ تھی اور وہ چیزوں کو اپنے اصلی روپ میں دیکھنے کی صلاحیت سے محروم تھیں۔

لہٰذا رسوا نے ایک ایسے کردار کی تخلیق کی جو خانم کی محرومیوں سے پاک ہو یہ کردار امراؤ جان ہے امراؤ جان نے خانم کے نگار خانے میں آنکھیں نہیں کھولیں نہ وہ پیدائشی طوائف ہے اور نہ ریاست وا بارت کی زخم خوردہ، اس کے پاس وہ اخلاقی پیمانے بھی نہیں جن سے ہر چیز کو ناپ تول سکیں وہ محض ایک انسان ہے جس کا بہترین حربہ سلامت روی ہے اس کردار کی تخلیق میں رسوا کی فنی بصیرت پوری طرح نمایاں ہے امراؤ جان اس ماحول میں اس طور سے لائی جاتی ہے کہ ہمیں اس سے فوراً ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے وہ اس ماحول کو اسی نظر سے دیکھتی ہے جس نظر سے ہم دیکھتے یا دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں یہ ماحول ہمارے لیے قطعاً اجنبی ہے۔

وہ کوئی بندھا ٹکا اخلاقی معیار نہیں رکھتی اور اسی لیے اس کی نظر ہر گوشہ پر پڑتی ہے وہ ہر مزاج کے قاری کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ زندگی کی خاصی واقفیت رکھتی ہے اسی لیے اس کا ہر فیصلہ ہمارے لیے قابل قبول ہوتا ہے اس میں انسانی ہمدردی ہے اس ہمدردی سے ایک خاص زاویہ نظر پیدا ہوتا ہے اور وہ زاویہ نظر کردار کو ایک خاص روشنی میں پیش کرتا ہے اور اس سے رمزیہ طنز پیدا ہوتا ہے۔

اب ہمارا روحانی سفر شروع ہوتا ہے "جا کے جو دیکھا، معلوم ہوا" آہا! امراؤ جان صاحب تشریف رکھتی ہیں"

امراؤ جان۔ (دیکھتے ہی) "اللہ مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے"

میں۔ "یہ معلوم کس کو تھا کہ آپ کس کوہ قاف میں تشریف رکھتی ہیں"

امراؤ جان۔ ..... آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا.... ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجئے"

یہ تو ہم دیکھ آئے ہیں کہ وہ خانم کی دکان میں پہنچ گئی ہیں یہ دکان کیسی ہے یہاں کون لوگ آتے ہیں کون رہتے ہیں اس کی زد میں زمانہ کی کتنی گردشیں ہیں یہ تماشا مختلف صورتوں میں ظاہر ہوگا کہیں محض تصویر کے ذریعہ سے جس پر رسوا کو پوری قدرت ہے کہیں ڈرامہ کی صورت میں جو کہیں کہیں شورش انگیز ہو جاتا ہے اور کہیں خود اور مشاہدہ نفس کے انداز میں جس کی قدر وقیمت اور رعنائی کا اندازہ ان خاص مقامات پر ہوتا ہے جہاں گذرے ہوئے زمانہ کی تلخیص کی گئی ہے اور جہاں کردار کے حیات و کیفیات میں نوک خار کی سی تیزی دکھانا مقصود ہے۔

یوں تو کردار بیان سے ابھرتے ہیں اور بیان کرداروں سے بنتا ہے یعنی یہ سب کچھ لہروں کا کھیل ہے مگر ان لہروں کا ساتھ دینا مشکل ہے اور ہمیں مجبوراً ٹھہر کر دیکھنا ہوگا آئیے اب ذرا خانم کی تصویر، نوچیوں کے مرقعے اور خانم کے نگار خانے کی آن بان دیکھتے چلیں" خانم کا سن قریب پچاس برس کے تھا کیا شاندار بڑھیا تھی رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی، بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں، ململ کا دوپٹہ سفید کیا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید، اودے مشروع کا پاجامہ بڑے بڑے پائینچے، ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے، کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کانوں میں سادی دو انٹیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں..... پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں کنول روشن ہے سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے"

اس کردار میں قوت کا احساس ہوتا ہے دیکھیں کاروبار میں خانم کے تیور کیا ہوتے ہیں،

خانم جان۔ "یہی چھوکری ہے؟" (مراد امراؤ جان سے ہے)

دلاور خان۔ "جی ہاں"

خانم جان نے مجھے پاس بلایا چمکار کے بٹھایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی

خانم جان۔ "اچھا پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے موجود ہے اور وہ دوسری چھوکری کیا ہوئی؟"

پیر بخش۔ "اس کا تو معاملہ ہوگیا"

خانم۔ "کتنے پر؟"

پیر بخش۔ "دو سو پر"

کہنا پڑتا ہے" اس چلمن کے پیچھے کوئی نہیں" گرمیوں کے دن تھے مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے اس پر دری بچھا کر اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چن دی گئی تھیں ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں، ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا ڈیڑھ حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دئے تھے چاندنی رات تھی اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک سفید کنول دو دے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا، اجلی چاندنی بالو کے آبخورے، سفید کنول یہ سب چیزیں کیسی سوگوار معلوم ہوتی ہیں تو جہاں کی بیوگی میں بھی یہ بات نہ ہوگی اس نظارہ میں درد و گداز ہے اس محفل کے ظاہری حسن پر ہم جتنی دیر نگاہ جمائے رکھتے ہیں اتنا ہی ہمیں اس کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے آغا صاحب کا ایک شعر اور اس کی تفسیر سنتے چلئے تو ممکن ہے کچھ انشراح صدر ہو جائے۔

تری نازک کمر کے باب میں چہلک بنا دیں گے وہ کیا سمجھے یہ باریکی ہے جس کی گتھی ہو

خاں صاحب۔ "برائے خدا اس چہلک کے معنی سمجھا دیجئے"۔

آغا صاحب۔ "خیر خاطر ہے سن لیجئے محاسب لوگ خانہ پری کے بجائے ندارد کے یہ نشان (×) بنا دیا کرتے ہیں اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے دوسرے ایک خانے بیچوں بیچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی ہے اور پھر جڑی ہوتی بھی ہے"

خاں صاحب۔ "یہ کیوں کر؟"

آغا صاحب۔ "اس باریکی کو نہ پوچھئے خیر حضرت واضح ہو کہ چہلک علم ریاضی میں علامت جمع کی ہے لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی" اس معاشرت پر اس سے بہتر اور کیا طنز ہو سکتا ہے، علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی آپ نے اس پہیلی کو بوجھیں شاید اس پہیلی کو بوجھنے میں امراؤ جان ہمارے کام آئیں۔"

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا "بیوی یہ چھوکری تو مجھے دے دیجئے میں پالوں گی دل آپ کا ہر خدمت میں کروں گی"۔

خانم۔ "تمہیں پالو"۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئیں اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں۔ منھ ہاتھ دھویا اپنے پاس سلا رکھا۔

اس تصویر میں ہم نے خانم کی شخصیت ان کے سوچنے کا انداز اور کاروبار کا ڈھنگ، بوا حسینی کے معتقدات اور ان کے مزاج کی کیفیت دیکھی خانم میں جمال کم ہے اور جلال زیادہ ان کی عقل شاطر ہے وہ اپنے ماحول اور زمانہ کی نبض سے واقف ہیں مگر اس کا درد محسوس نہیں کرتیں اس سے فائدہ اٹھاتی اور اپنے لئے پتا مرکب بناتی ہیں ان میں زبردست قوت ارادی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ضبط اور توازن بھی ہے وہ دوسروں کی مسکینی سے خوش ہوتی ہیں کیونکہ خود ان میں اس کی بڑی کمی ہے انکا بہتر نفس بہت جلد مطمئن ہو جاتا ہے وہ کاروبار میں کبھی نہیں چوکتیں وہ چند روایتی باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ مگر اس اعتقاد میں جان نہیں ہے البتہ اس سے انھیں اپنے کاروبار میں مدد ملتی ہے وہ چند روایتی باتوں کو دہرا کر اپنے گناہوں کی تلافی کر لیتی ہیں اور اس طرح ان میں اور ان کے خدا میں مفاہمت ہو جاتی ہے، بوا حسینی ان کا بہتر نفس ہیں ان کی اپنی کوئی شخصیت نہیں وہ خانم کے جاندار نفس کی تابع ہیں وہ خالص عورت ہیں اسی لیے محکوم ہونے میں اور خدمت کرنے میں خوش رہتی ہیں ان میں پرستش کرنے کی امنگ ہے توڑنے کی ہمت نہیں مگر یہ پرستش بھی گہرے جذبہ کی ممنون نہیں مگر اہ قسم کی دضعداری ہے وہ ذہنی اور روحانی طور پر کاہل ہیں اس لیے ایک ہی راستہ پر چلے جاتی ہیں جزا اور سزا پر ایمان رکھتی ہیں مگر اس ایمان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اعصاب میں سستی ہوئی تو پان کھا لیا، دل میں ابال آیا تو اس پر چھینٹا دے دیا خانم اور بوا حسینی دونوں فریب خوردہ ہیں فرق یہ ہے کہ ایک بوڑھوں کو فریب دے سکتی ہے اور دوسری بچوں کی طرح فریب کھا جاتی ہے۔

اس ماحول کو ہم کس نظر سے دیکھیں رسوا کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ وہ اس ماحول سے لذت حاصل نہیں کرتے نہ وہ محض تاثر پرست ہیں۔ پھر بھی وہ ہمیں ایک زاویۂ نظر دیتے ہیں یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے جو ظاہری بھی ہے

خانم جان۔ "صورت شکل کی اچھی ہے اتنے ہم بھی دے [illegible] لیکن تم نے جلدی کی"

دلاور خاں۔ "صورت تو اس کی بھی اچھی ہے آگے آپ کی پسند"

خانم ۔ "خیر آدمی کا بچہ ہے"

دلاور خاں۔ "اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے موجود ہے"

خانم ۔ "اچھا تمہاری ہی ضد سہی" (یہ کہہ کے حسینی کو آواز دی)

حسینی گدبدی سے سانولی ادھیڑ عمر کی عورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

خانم "حسینی!"

حسینی "خانم صاحب"

خانم "صندوقچہ لاؤ"

حسینی گئی صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دیے سودا چکا دیا گیا۔ اب خانم کے سوچنے کا انداز اور بوا حسینی کا کردار دیکھئے۔

خانم ۔ (بوا حسینی سے) "حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی"

حسینی "مہنگی، میں کہتی ہوں سستی"

خانم ۔ "خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں ذرا بھی خوف خدا نہیں۔

بوا حسینی "ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں عذاب تو انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے ہم سے کیا یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی"

حسینی ۔ "خانم صاحب یہاں پھر اچھی رہے گی آپ نے سنا نہیں بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں"

خانم ۔ "سنا کیوں نہیں لے ابھی اس دن کا ذکر ہے سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا سیخچوں سے داغ کے مار ڈالا۔

حسینی ۔ دنیا میں جو چاہیں کرلیں، قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا"

خانم "منہ کالا ہوگا جہنم کے کندے پڑیں گے"......

اور اسی طرح شے شے سے اور شخص سے کیا تعلق رکھتی ہے کہاں ایک ہی چیز پر بھرپور روشنی ڈالی جائے کہاں کئی چیزوں پر باری باری اور کہاں تمام چیزوں پر بیک وقت کس زاویہ سے کتنی دیر تک کتنے فاصلے سے رسوا کے فن میں یہ باتیں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں وہ جزئیات پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے انتخاب میں بڑے اختصار سے کام لیتے ہیں عام طور سے وہ اشیاء کی تفصیل اس وقت پیش کرتے ہیں جب انھیں کردار یا زمانہ کی داخلی زندگی کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے جنھیں کامیابی کے ساتھ اور سہولت سے کسی اور صورت میں سامنے لانا ممکن یا مناسب نہ ہو، بوا حسینی کی کوٹھری میں وہ ہمیں دو چار چیزیں گنا کر روٹھ جاتے ہیں مگر اس انداز سے کہ بوا حسینی کی شخصیت کے ہزار پرتو دفعتاً ہماری نگاہوں میں کوند جاتے ہیں مندرجہ بالا اقتباس میں وہ ہمیں ایک وسیع دالان میں لے گئے ہیں جس میں بے شمار کمرے ہیں ان میں خانم کی نوچیاں رہتی ہیں یوں تو خانم اور ان کی نوچیاں اس معاشرت کی انجیل ہیں لیکن اس خاص موقع پر رسوا ہمیں ان سے دو چار نہیں کرتے وہ ان میں سے چند ایک کے نام گنا دیتے ہیں باقی کو جھٹ پٹے میں چھوڑ دیتے ہیں ہمیں ان کی موجودگی کا احساس تو ہوتا ہے مگر اس طرح پر گویا پس منظر میں چند موہوم نقطے یا منحنی خطوط ہیں جنھیں دیکھا نہ دیکھا ایک سا ہے نہ ایک میں عزت ہے نہ دوسرے میں محرومی ان کے مقابلہ میں رسوا اپنی ساری توجہ جزئیات پر صرف کرتے ہیں وہ ساز و سامان کو چھوتے چکھتے اور چھیڑتے ہیں اور بڑے چاؤ سے ایک اک چیز کو دکھاتے ہیں جو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں انگلیوں سے ان کی سطح کو چمکارتے ہیں اور پلکوں سے ان میں شگاف پیدا کرتے ہیں، ایسا کیوں اس لیے کہ یہ ساز و سامان محض ساز و سامان نہیں ہے اس کی تہ میں چند قدریں ہیں یہ قدریں بے جان ہیں ان سے زندگی کی تخلیق نہیں ہوتی مگر یہ زندگی کو تقسیم ہونے سے بچا لیتی ہیں ان میں رس نہیں ہے مگر یہ بظاہر آب و تاب رکھتی ہیں یہ شیرازہ بند نہیں ہیں مگر ان سے ایک قسم کی یکسانیت پیدا ہوتی ہے جو معاشرت کے ریزوں کو جمع کر کے ایک کل کی صورت میں پیش کرتی ہے وہ انھیں ایک کل میں تبدیل نہیں کر سکتی اس میں انقلاب کی کوئی صلاحیت نہیں بہرحال جزئیات کے اس بیان سے چند باتیں کھل جاتی ہیں۔

(۱) اس معاشرت میں شخص کی وقعت اور وزن بہت کم ہے

(۲) بے جان چیزیں منزل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۳) انسان کے اعصاب مردہ، افسردہ، اور بے کار ہو کر رہ گئے ہیں انھیں جگانے اور جلانے کے لیے حسین اور رنگین چیزوں کی یہ انجمن سجائی گئی ہے۔

اور اس موقعہ پر ناگزیر بھی ہے۔ اس سے دو عالتوں کا مقابلہ مقصود ہے اور اس مقابلہ میں وہ زاویۂ نظر چھپا ہوا ہے جس کی مدد سے ہمیں چیزوں کا مشاہدہ کرنا ہے "آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں، ماں باورچی خانہ میں ہیں اتنے میں ابا کو جو دیکھا تو دوڑ کے لپٹ گئی ..... خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں"۔

خانم اور بوا حسینی پختہ عمر کی عورتیں ہیں اس لیے ان کے کرداروں میں کسی زبردست تبدیلی کا امکان نہیں ان کی اچھائیاں اور برائیاں ہم پر پہلے ہی ظاہر ہو گئیں اب جوں جوں نئے واقعے ہمارے سامنے آتے جائیں گے ان کی خوبیاں اور خامیاں اور اجاگر ہوتی چلی جائیں گی لہذا سر دست ہم خانم کی نوچیوں سے دل بہلائیں اور ان کی شریعت کا مطالعہ کریں تو زیادہ مفید ہوگا۔ خانم کا مکان بہت وسیع تھا، اس میں بے شمار کمرے تھے ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں، بسم اللہ (خانم کی لڑکی)، خورشید میری ہم سنیں تھیں ان کی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں ہر ایک کا عملہ جدا تھا ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا ایک سے ایک خوبصورت تھی سب گہنے پاتے سے آراستہ ہر وقت بنی ٹھنی نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے، فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوئی بڑے بڑے نقشی پاندان حسن دان، خاصدان، اگالدان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے، دیوار پر جلی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، ادھر ادھر عمدہ ہانڈیاں سرِ شام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں دو دو مہریاں دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہیں خوبصورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر، چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی سامنے پان دان کھلا ہوا ہے ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں، چہلیں ہوتی جاتی ہیں، اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں چلتے ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں"

ہر اچھے ناول نگار کی طرح رسوا اپنی آستین میں روشنی کا ایک سیلاب رکھتے ہیں مگر وہ اسے بہت سلیقہ سے استعمال کرتے ہیں وہ ہر شخص کی قدر اور ہر چیز کی قیمت جانتے ہیں اور ان کی نمود پر محض اتنا وقت اور اتنی شعاعیں صرف کرتے ہیں جو ان کے مقصد کے لیے ضروری ہیں نیز وہ یہ جانتے ہیں کہ شخص کی قدر اور شے کی قیمت متعین کرنے کے لیے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انھیں ایک دوسرے سے کیا نسبت ہے یعنی شخص شخص سے اور شے سے کیا تعلق رکھتا ہے

زندگی کا آخری سانس ہی پیدائش سے لے کر موت تک اور موت کے بعد ہزاروں رسمیں منائی جاتی تھیں اور بیشتر رسموں میں مجرئی ایک ضروری جزو کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے طوائفیں اور ڈومنیاں شریف خواتین کی محفلوں کی جان اور ایمان بن گئی تھیں عزاداری جو ایک مذہبی فریضہ تھا اور جس میں حد درجہ سنجیدگی اور متانت واجب تھی اس میں بھی طوائفوں نے سوز خوانی کے کمال سے فائدہ اٹھا کر دخل حاصل کر لیا تھا اور اس طرح دنیا ہی نہیں آخرت بھی ان کے ہاتھ میں چلی گئی تھی

پانچویں اس زمانہ کی طوائفیں ایک وقت میں ایک شخص کے لیے وقف ہوتی تھیں سودا باقاعدگی سے ہوتا تھا مدت اور مشاہرہ متعین ہو جاتے تھے پھر یہ ممکن نہ تھا کہ ہر کس و ناکس کی ان تک رسائی ہو، یہی وجہ تھی کہ ان کی محفلوں میں نفاست اور خوش مذاقی قائم رہ سکتی تھی اور بعض قومی روایتوں کا احترام ملحوظ رہتا تھا۔

چھٹے، عام طور سے ان طوائفوں کے ڈیرے اور مشترکہ خاندان ہوتے تھے جن کی اپنی مخصوص خوبیاں اور صفات ہوتے تھے کاروبار کا خالص تجارتی انداز نہ تھا یا یوں کہیئے کہ ان کی تجارت میں بھی ایک سلیقہ تھا ان میں سے بعض گانے والیاں ہوتی تھیں بعض محض ناچنے کا پیشہ کرتی تھیں اور بعض محض حسن صورت کے دام لیتی تھیں امراء کی آمدنی میں ان کے لیے ایک خاص مد تھی اور ان میں سے کافی تعداد کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوتی تھی ایک شخص اور ایک دربار سے علاقہ ختم ہوتا تو کسی اور شخص اور کسی دوسرے دربار سے منسلک ہو جاتی تھیں۔

ساتویں زوال کے اثر اور ان کی مخصوص افادیت کی بنا پر ان کی صحبت سے مولوی، رند، امیر اور غریب کسی کو عار نہ تھا گو یا طوائفیں بھی ان کے روزمرہ میں داخل تھیں وہ ایک فصیح محاورہ تھیں جنھیں ہر شخص استعمال کر سکتا تھا وہ ایک ایسی تلمیح تھیں جس نے قومی روایتوں اور افسانوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہو، سیر و شکار میں، میدان جنگ میں، نجی محفلوں میں، مذہبی رسموں میں ان کا ہونا ضروری تھا۔ یہ اس زمانہ کا مکتب، اس کا میکدہ اور اس کی محفل تھیں خانم کے یہاں ہمیں ان کی پکی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، پڑھانے کے لیے مولوی ہیں، موسیقی سکھانے کے لیے بہترین استاد ہیں خانم خود موسیقی کی بڑی اچھی ماہر ہیں اور فن کی باریکیوں کا احترام کرتی ہیں، بیگا جان گانے والیوں میں سے ہیں خورشید ناچنے کا فن جانتی ہیں امراؤ جان ناچنے اور گانے دونوں میں ماہر ہیں بسم اللہ جان اپنی صورت کی قیمت لیتی ہیں مردہ احساسات کو چھیڑ چھیڑ کر جلانے اور جھلملاتے ہوئے چراغوں کی لو کو اکسانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے ان کے ماحول کی جزئیات ان کی نجی رسمیات اور ان کی بود و باش کو دیکھ کر ہم آسانی سے اس زمانہ پر ایک حکم لگا سکتے ہیں یہ لوگ نہ جانے کن دور و دراز

(۴) ان چیزوں کی ترتیب میں بھی کوئی نیا پہلو نہیں ہے ان کا وجود ایک قسم کا اعادہ¹ ہے جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور جس انداز سے ہوتا چلا آیا ہے وہ از خود ہوتا چلا جائے گا کیونکہ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔

(۵) یہ باطنی حسن کا اظہار نہیں کرتیں محض حسن کا فریب² پیدا کرتی ہیں

ان کے بیان سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں وہ باطنی تناسب³ ہاتھ آ جاتا ہے جس کی روشنی میں آگے بڑھنا ہے لکھنؤ میں طوائفیں ایک مفید مستقل اور ضروری ادارہ تھیں ان میں اور ہمارے زمانہ کی کسبیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ہمارے زمانہ میں فنون لطیفہ کے مذاق کی تسکین کے بے شمار سامان موجود ہیں رقص اور موسیقی دونوں محبت میں جائز ہیں اس زمانہ میں خواتین کے لیے ان کا سیکھنا گناہ تھا یہی وجہ تھی کہ فنون لطیفہ کا مذاق رکھنے والے طوائفوں کی طرف رجوع کرتے تھے اور انھیں اس کی آزادی بھی تھی کیونکہ یہ مذاق اس دور کی معاشرت میں رچا ہوا تھا اور اس کی تشفی بہرطور ضروری تھی طوائفیں ان فنون میں کمال حاصل کرتی تھیں کشمیری طائفے بھی جو شہروں شہروں مارے پھرتے تھے اور عام طور سے بدن کی لذتیں فراہم کرتے اور اپنی قیمت وصول کرتے تھے ان فنون کو جاننا ضروری سمجھتے تھے دوسرے اس زمانہ میں خاص و عام کی تفریح کا کوئی ایسا نظام ایجاد نہ ہوا تھا جو ہمارے دور کی تفریح گاہوں کلب اور انجمنوں میں اپنی معراج کو پہنچ چکا ہے۔ لکھنؤ میں اس ضرورت کی کفیل بھی یہی مادر پیلی تھیں جن کے نگار خانوں میں احباب جمع ہوتے ادبی مباحث چھڑتے شعر و سخن کے کمال دکھائے جاتے اور داد و صول کی جاتی تھی جام و مینا سے سرگوشیاں ہوتیں شہر کی اچھی بری خبریں اور اپنے اور دوسروں کے کارنامے بے تکلفی سے سنائے جاتے تھے شام کا وقت لطف سے گذرتا اور فطری کمزوریوں اور خواہشوں کے سامان آسانی سے مہیا ہو جاتے تھے تیسرے اس زمانہ میں متوسط اور شریف گھرانوں کی عورتوں میں تعلیم کا رواج نہ تھا طوائفیں اپنی دکان لگانے اور بھاری قیمت وصول کرنے کے لیے اس کمی کو بھی پورا کرتی تھیں موسیقی کے علاوہ صرف و نحو، منطق اور فارسی نظم و نثر کی تحصیل پر خاص زور دیا جاتا تھا طوائفیں شستہ زبان بولتیں لب و لہجہ کی نزاکتوں میں طاق ہوتیں انسانوں کے مرتبہ، منزلت اور مذاق کو پہچانتیں اور نوابین کے بچوں کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہوتا تھا اس معاشرت میں بھی اگرچہ وہ محترم نہ تھیں مگر مفید ہونے کے باعث ان کی آؤ بھگت ہوتی تھی اور انھیں خواتین و بیگمات بھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔

چوتھے اس دور کے انسانی اعمال چند رسموں کی پابندی تک محدود تھے عورتیں رسمیں اس طرح مناتی تھیں گویا ہر رسم

1. Repetition 2. Illusion. 3 Perspective.

ذہن میں ان کی شخصیت کے مظاہروں کی کوئی بہت واضح تصویر نہ آئے پھر بھی ایسا یقین ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بس اپنی چند سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں جو ان کے مشاہدے نے ہمارے دماغ میں پہلے سے تیار کر دئے ہیں ان اشخاص میں سے بعض کردار ہیں بعض خاکے اور بعض وہ خاکے ہیں جو مضحک ہیں یا جن کے پردوں میں رمز یہ طنز چھپا ہوا ہے لیکن اس قسم کی تقسیم عام طور سے مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں مطلق المعانی کی جھلک پائی جاتی ہے امراؤ جان میں اصطلاحی معنوں میں کردار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں پھر وہ شخص ہیں جن کی گرفت ان خاص موقعوں پر کی گئی ہے جہاں ان کی شخصیت خود بخود بے ارادہ اور خالص فطری انداز میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ پھوٹ پڑتی ہے بعض خاکے وہ ہیں جنھیں کسی خاص موقع پر محصور نہیں کیا گیا ہے یہ رسوا کے قلم کا کمال ہے کہ ان خاکوں میں زندگی کی تڑپ آگئی ہے لطف یہ ہے کہ ہم ان میں سے کسی کو بھول نہیں سکتے ان میں فن کارانہ اعتماد ہے وثوق ہے اور اتنی گہری واقفیت ہے کہ ان کی صداقت میں شک نہیں ہو سکتا اس ناول کے کردار جادو نہیں کرتے وہ آپ اپنی مثال ہیں وہ کسی جادوگر کے پنجے میں اس طور سے گرفتار بھی نہیں کہ چل پھر نہ سکیں وہ بظاہر ایک دوسرے سے اس طرح پیوست بھی نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر دیں تو قصہ خبط ہو جائے۔ وہ مخصوص ہیں، زندہ ہیں وہ کہیں کہیں خانہ پری کے لیے آتے ہیں مگر وہ بجائے خود اہم نہیں ہیں ان کی قدر و قیمت اس میں ہے کہ وہ ہمیں ایک زندہ طلسمات کی سیر کراتے ہیں۔

ان سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس معاشرت کا آسیب ہیں ان پر قابو حاصل کرنے کا اور ان سے رہائی پانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم ان میں سے ایک ایک کا تعاقب کریں ان کی روح کو علم کے شکنجے میں کس لیں اور حقیقت کے شیشہ میں اتار لیں۔ سب سے پہلے ہمیں گوہر مرزا دکھائی دیتا ہے اس کی پیدائش ایک حادثہ ہے اس حادثہ کی بدولت اس میں زندگی بھی ہے اور غیر ارادی طور پر زندگی سے انتقام لینے کا جذبہ بھی وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کا کوئی وطن نہیں، کوئی خاندان نہیں، جسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں جو کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں رکھتی جو عمل کرتی ہے مگر زندگی میں کوئی اضافہ نہیں کرتی جو بہروپ بھرتی ہے مگر عشق نہیں کرتی وہ ان نوابین کی بدولت وجود میں آئی ہے جو زندگی کے آخری سانس پورے کر رہے ہیں وہ ان ڈومنیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے جن کے بدن کا صرف ایک حصہ زندہ ہے اس لیے اس کے دل و دماغ میں کوئی صلاحیت نہیں البتہ اس کا جسم بیدار ہے وہ اپنے بدن کو قائم رکھنا چاہتی ہے مگر اس کے لیے اس کا بیدار رکھنا ضروری ہے اس کشمکش میں وہ اخلاق کی تمام قدروں کو ٹھکرا دیتی ہے وہ اور کر بھی کیا سکتی ہے وہ ایک ایسی نسل ہے جو بے مقصد پیدا ہوئی ہے اس کے لیے زندگی میں کوئی امکانات ہیں نہ سنجیدہ محرکات، روزی کا وسیلہ ہے نہ تربیت

گمنام گوشوں سے نکال کر لائی جاتی ہیں ان در و دیوار میں گھِر کر ان کی زندگی کے سانچے بنتے اور بدلتے ہیں، یہ جوان ہوتی ہیں، امیروں کے آغوش گرم کرتی ہیں زوال کا آلہ کار بنتی ہیں اسے اپنے نفس کا آلۂ کار بناتی ہیں ان کے جذبات میں ہیجان بھی ہوتا ہے ان کے دماغ میں کبھی کبھی طوفان بھی آتے ہیں لیکن بیشتر سپر ڈالتے ہی بنتی ہے، امیر جان، بیگا جان خورشید جان اور بسم اللہ جان میں صرف خورشید جان ایسی ہے جو ایک عرصہ تک زمانہ سے جنگ کرتی ہے باقی تو جھک کر ہی آسمان کے برابر ہوتی ہیں یہ عام طور سے روشنی اور ہوا سے محروم رہتی ہیں رسوا نے جس طور سے خانم کی نوچیوں کو دکھایا اور ان کے کمروں کو سجایا ہے پھر جس طور سے ان کے ملاقاتیوں کی آمد و رفت اور ان کے مجروں کی کیفیت بیان کی ہے اس کے تصور سے دم گھٹنے لگتا ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کمروں میں ہمیشہ رات ہی رہتی ہے۔ خاص خاص لوگ آتے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مجروں کی فضا بھی کشادہ نہیں معلوم ہوتی نغمہ کی الاپ سے آپ کسی نئی اور کھلی فضا میں پہنچ جائیں یہ اور بات ہے ورنہ ان کمروں میں اور ان جگہوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ کچھ ایسا خیال بندھتا ہے کہ یہ نوچیاں نہیں جادو کی پڑیاں ہیں جو ایک کمرہ سے نکال کر دوسرے کمرہ میں پہنچا دی گئی ہیں وہاں ساز کی آہنگ اور چہروں کی نمائش سے البتہ چند حواس آزاد ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تاہم سینہ میں کشادگی اور وجدان میں تازگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا وہی گھٹی گھٹی سی کیفیت اور جبر کا ذب کا سماں وہی در و دیوار ہر طرف سے یلغار کرتے ہوئے وہی قیمتی لباس جنھیں دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی ہیں، وہی آداب جو سزا کی صورت اختیار کر چکے ہیں وہ مردنی جو شراب پی پی کر زندگی کا بھرم رکھتی ہے ہمیں ملفوف کئے رہتے ہیں یہاں تک کہ ہماری طبیعت اکتا جاتی ہے ہم ان در و دیوار کے سائے سے بھاگنے لگتے ہیں مصنوعی مرد و عورت سرگوشیاں کرتے ہوئے اجیرن معلوم ہونے لگتے ہیں دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ کہیں انسانوں کا بہتا ہوا ہجوم نظر آئے کبھی تو سورج کی کرنیں ہمارے رخسار بھی چومیں اور ہم دعا کرتے ہیں کہ "اس دنیا کو تھوڑی کے لیے بھول جائیں مگر ہمیں اپنے چاروں طرف وہی گوہر مرزا، وہی نواب جعفر علی خاں اور وہی نواب چھبن دکھائی دیتے ہیں اس ناول میں اس قسم کے بے شمار اشخاص کی مصوری کی گئی ہے ان میں سے بعض کا دائرہ عمل دوسروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے بعض وہ ہیں جن کی ممتاز خوبیوں اور خامیوں کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ ہمیں منفرد، زندہ اور مختلف موقعوں اور زمانوں میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ موقعے اور ان کے اعمال ان کی خوبیوں اور خامیوں سے متعین ہو جاتے ہیں اور خواہ وہ ہمارے

یہ دعویٰ ذاتی اور خاندانی وجاہت کا ہو، علم و عرفان کا ہو، بدن اور نگاہ کی عصمت کا ہو یا کاروباری دیانت کا ہر حال میں اور ہر موقعہ پر گوہر مرزا اسے للکارتا ہے سامنے آکر نہیں چھپ کر کیونکہ اسے زندہ رہنا ہے۔

راشد علی کو خاندانی وجاہت کا دعویٰ ہے اسے اپنی لیاقت پر بھی ناز ہے یہ اس اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس نے دوسروں کی کمزوریوں سے قوت کے اسباب فراہم کئے ہیں یہ وہ طبقہ ہے جو ہمیشہ ان لوگوں کی طرف دیکھتا ہے جو مادی طور سے بلند ہیں یہ ان کی خدمات بجا لاتا ہے ان کی خاطر زیردستوں پر ظلم کرتا ہے جب تک ان کے بازوؤں میں دم رہتا ہے ان کے سامنے دم نہیں مارتا جب انہیں کمزور پاتا ہے سازشیں کرتا ہے مصلحت کو حق پر اور مفاہمت کو معرکہ پر ترجیح دیتا ہے بظاہر صلح پسند ہے مگر قانون اور اقتدار کی پناہ لے کر سب کچھ کر گزرتا ہے اخلاق پر ایمان نہیں رکھتا مگر دین و ایمان کے بارے میں بڑے اخلاق سے کام لیتا ہے انسان سے زیادہ خدا کا قائل ہوتا ہے کیونکہ خدا کبھی اس کی مصلحت میں دخیل نہیں ہوتا ہر آن بدلتا رہتا ہے اس کا نشو و نما بڑی تیزی کے ساتھ ہوتا ہے اور چند ہی روز میں خاندانی امارت کا سکہ رواں ہو جاتا ہے اس طبقہ کی اولاد عام طور سے خدا کو اعلیٰ ترین قدر مانتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہت دور ہے اور یہ کہ قدر اور قیمت میں امتیاز کرنا چاہیے اس دنیا میں قیمت لگانی اور وصول کر لینی چاہیے اعلیٰ ترین قدر سے معانقہ ہوتا رہے گا۔ یہ لوگ کوئی روایت نہیں رکھتے اپنے خاندان کو دنیا کی آخری روایت سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں جب تک جوان رہتے ہیں باپ دادا کی دولت بے دریغ لٹاتے ہیں اور داشتہ رکھتے ہیں جب قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں تو خود کسی کی داشتہ بن جاتے ہیں اور بزرگوں کے نام پر سوال کرتے ہیں یہ نو دولتے اپنے گرد ایک حلقہ بنائے رکھتے ہیں اور اپنے ظاہری اور باطنی حسن کی تعریف کرتے اور کراتے اور کبھی کبھی اس کا سودا بھی چکاتے ہیں ان کی اکثر باتیں مصنوعی ہوتی ہیں اور یہ فریب بھی وہاں کھاتے ہیں جہاں ان کے پندار کو تسکین ہوتی ہے۔ راشد بظاہر احمق معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے اس میں پندار ہے یہ پندار خلقی اور امیرانہ نہیں ہے اس لیے اسے زندہ رکھنے کے لیے نئے نئے انداز اختیار کرنے ضروری ہیں اپنی ذہانت کا منوانا اور ان تمام مشاغل میں پڑنا اور سبقت لے جانا بھی شرط ہے جو امیروں کا وظیفہ ہیں اس کے لیے شہرت علم کا بدل ہے وقت گذاری اس کا بہترین عمل ہے دولت اس کی سب سے بڑی پناہ ہے احباب کا حلقہ اس کے پندار کی بہترین غذا ہے قومی تر اس کے نزدیک بہتر ہے اور بہتر اس کے لیے مثال ہے

زندگی گذارنے کا حوصلہ اچھے گھرانوں میں اس کا گذر نہیں مگر کام و دہن کی لذتوں سے آشنا ہے اس لیے اس میں طرح طرح کے چونچلے ہیں۔ یہ نسل دور دور پھیلی ہوئی ہے شہروں میں بھی دیہات میں بھی لوا ب ان کی پالکت کرچکے مائیں بوڑھی ہو چکی ہیں فضائیں راگ و رنگ اور نشہ سے چور ہیں اس نسل کے نصیب میں بدن کی ٹوٹن ہے اور رگوں کی پیاس کرے تو کیا کرے آزادی کے تصور سے محروم ہو چکی ہے عزت کا احساس باقی نہیں محنت اس کے لیے ننگ ہے اور اس کے باوجود بدن کا ایک حصہ بیدار ہے اور اسے گدگدا گدگدا کر اکسا نا اور آنچ دے دے کر تپانا ضروری ہے یہ مرد ہیں مگر ان میں نسائیت ہے ڈومنیوں سے پیدا ہوئے ہیں ڈومنیوں میں رہتے ہیں وہی ان کی پناہ ہیں اور وہی ان کی زمین ہیں یہ طوائفوں کی وقت گذاری کا سامان ہیں نوابین کے دلال ہیں نوجیوں پر مرنے والوں کے رقیب ہیں مردوں میں عورت ہیں اور عورتوں میں مرد دن میں دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور رات کی سیاہی میں حملہ کرتے ہیں نہ انھیں کسی سے محبت ہے نہ نفرت ان کے دل مردہ ہیں ان میں احساس کی کوئی تازگی نہیں یہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں اس لیے شوخ معلوم ہوتے ہیں ان میں ایک ہی خواہش بیدار ہے اس کی تسکین یہ کسی نہ کسی طرح کر لیتے ہیں یہی ان کی زندگی کا راز ہے اور یہی ان کی حد نظر یہ خود طوائفوں اور نوابین کے درمیان حد اوسط ہیں اور معاشرت میں ان کی قدر و قیمت اسی پر منحصر ہے امراؤ جان کے الفاظ میں "...... دوست آشناؤں سے تعریف کرتے ہیں، جرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں محفل میں بیٹھ کر اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں ہر سم پر آ کرتے ہیں ہر تال پر واہ واہ کر رہے ہیں وہ بھاؤ بتا رہی ہے یہ شرح کر ترجمانی ہیں...... اگر کسی امیر رئیس سے ملاقات ہو گئی انھی کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے...... تماش بین ان سے دبتے رہتے ہیں اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی بہ حمایت کو مستعد شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں"

یہ الفاظ ان لوگوں کی تعریف میں ہیں جنھیں رنڈیاں اپنا بنائے رکھتی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ جملے اس مخصوص نسل پر بہترین تبصرہ ہیں اور یہ بھی یوں کہ رنڈیوں کو ایسے یگانے اس نسل کے علاوہ اور مل بھی کہاں سکتے ہیں۔ گو مرزا کی نسل اس معاشرت کے ہر دعوے کی زندہ نفی ہے۔

ہیں نہ خود کو بدلنے کی صلاحیت ہے، نہ وہ عوام سے زندگی مستعار لے سکتا ہے، نہ اس میں حملہ آوروں کے مقابلے کی ہمت ہے، اس کے دل اور دماغ میں کوئی ہل چل بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ہار مان چکا ہے، باہر سے ایک زندہ قوم نئے طمطراق کے ساتھ آئی ہے اور اس نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں، وہ ان کے قلعوں میں شگاف پیدا کر رہی ہے، اندر عوام بدل رہے ہیں ان میں بے چینی ہے اور ان کے دلوں سے ان کے اقتدار کا خوف نکل چکا ہے، خود ان میں کوئی اندرونی طاقت نہیں جس سے اس انقلاب کی حقیقت پر قابو پا سکیں وہ ذہنی اور روحانی طور پر کھوکھلے ہیں ماضی میں رہتے ہیں حال کو سمجھ نہیں پاتے، مستقبل کا کوئی آسرا نہیں، ان کے اخلاق و آداب ان قلعوں کی مثال ہیں جو طوفانی سمندر کی سطح پر دکھائی جائیں انھیں خود نہیں معلوم کہ وہ کیا ہیں اور یہ تصویریں جو چاروں طرف دکھائی دیتی ہیں زندہ ہیں یا محض فریب ہیں وہ جنسی تلذذ میں مبتلا ہیں اس لیے نہیں کہ انھیں اس میں کلاسیکی نغموں کا زیر و بم دکھائی دیتا ہے اور نہ اس لیے کہ وہ کوئی میدان سر کر کے آئے ہیں اور ان کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے بلکہ محض اس لیے کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہیں اور ان کا وقت آخر ہو اور کا سے کسی نہ کسی طور سے بہلانا ہے ان کے نزدیک دولت کی نمائش بھی اسی طرح ممکن ہے اور بزرگوں کی عیش پرستی کا احترام بھی اسی صورت سے ہو سکتا ہے وہ محض روایتیں ہیں شرافت اور جاہ و جلال فنون اور خانہ داری مصاحبین اور ماتم، کھیل اور کھانا پینا، مذاق اور فحاشی، نفاست، فاتحہ اور نماز، وہ خود روایت ہیں۔

اس روایت پر مردنی چھا گئی ہے مگر یہ ابھی قطعی طور پر مٹی نہیں ہے کچھ تو اس لیے کہ عوام بیدار نہیں کچھ اس لیے کہ اس میں کم از کم ظاہری شان و شوکت باقی ہے کچھ اس لیے کہ اس کا یک بیک مٹا دینا مغرب کی سیاسی مصلحت کے خلاف ہے اور کچھ اس لیے کہ بعض افراد میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور ان کے فیض سے کچھ شمعیں بھی فروزاں ہیں۔

رسوا نے اس طبقہ کے بعض مخصوص افراد کے خاکے دئے ہیں ان میں دو تین خاکے بہت جاندار ہیں نواب جعفر علی خاں کبھی نہیں بھولتے "سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا منھ میں ایک دانت نہ تھا نیت ختم ہو گئی تھی سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے ہائے وہ ان کا کیچلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ، لال نیفہ، مصالحہ دار ٹوپی، کا کلیں بٹی ہوئی"

"دو گھنٹے کے لیے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی اور تکلف سنئے نواب بوڑھے ہو گئے تھے مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی کھلائی آ کے زبردستی اٹھا لے جاتی تھی، نواب صاحب

تقلید میں وہ غلو کو برا نہیں سمجھتا، خواہ اس کی مونچھیں بقول رسوا کے "چوہیا کی دم" ہو جائیں۔ وضعداری کو اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے جس رنڈی سے ایک شب کے لیے واسطہ ہو گیا اس کی نائکہ کو مجمع عام میں "اماں جان" کہنے سے باک نہیں۔ شعر و شاعری میں اس درجہ کمال پہنچایا ہے کہ "ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام" پڑھا جاتا ہے۔ فراخدلی میں اپنی مثال نہیں رکھتا کیونکہ والد مرحوم شوہت نذر کے روپیہ سے ایک بڑا علاقہ اس کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ پھکڑپن سے بھی عار نہیں، ورنہ طبیعت کی رسائی کیا معنی؟ ذہنی اور جذباتی طور پر بھی خاصہ بلند ہے اس لیے یاروں کے کہنے سننے سے امراؤ جان کا خیال پیدا ہوتا ہے زندہ ہے اس لیے خیال ترقی کرتے کرتے "اشتیاق" تک پہنچ جاتا ہے مخلص ہے اس لیے آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو جاتا ہے دل میں نور ایمان رکھتا ہے اس لیے "دعا تعویذ کی تاثیر" سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوتا ہے۔

یہ داستہ نہیں ایک پورا طبقہ ہے جو مصنوعی اخلاق، مصنوعی پندار، مصنوعی عشق، مصنوعی شعر و شاعری میں کمال رکھتا ہے یہ اپنے کمالات سے شرمندہ نہیں، مردہ بھی نہیں کیونکہ قوی تر لوگوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عمل کرتا ہے ان کی تقلید میں خلوص برتتا ہے اس کے پاؤں تلے زمین ہے کیونکہ اس کے پاس بزرگوں کی دولت بھی ہے اور وجاہت خاندانی کا تمغہ بھی اس کے دامن میں اخلاقی قدریں نہیں مگر دعوے تو ہیں اسے چھپ کر وار کرنے کی ضرورت نہیں اس کی زندگی کوئی حادثہ نہیں۔

نواب جعفر علی خاں و نواب چھبن اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو آپ اپنے دام میں گرفتار ہے جو اس معاشرت کا خالق بھی ہے اور اس کی مخلوق بھی کبھی اس کے تحریر کی چومتی اور اپنا گریبان چاک کرکے اس کی تلوار کے قبضہ کو چومتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے صدیاں گزر گئی ہیں وہ زندہ اصول جنھوں نے زمین کے سینہ کو برما دیا تھا اب مردہ ہو چکے ہیں، ریاست کے وہ قوانین جو سماج کے اعلیٰ تصور سے پیدا ہوئے تھے اب ظلم کا آلہ کار بن گئے ہیں، وہ جمالیاتی قدریں جن سے فنون لطیفہ میں توازن و تناسب اور مردانگی پیدا ہوئی تھی اب محض صورت پرستی میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہیں دولت جو پہلے بڑی حد تک اشخاص کی محنت اور طبقوں کی افادیت کے مطابق تقسیم ہوتی تھی اب ایک مدت سے چند لوگوں کی میراث بن گئی ہے تقدیر پرستی عام ہے اور خدا کے تصور میں انقلاب کی کوئی قوت باقی نہیں یوں کہنا چاہیے کہ یہ قدریں ایک مدت سے اپنی افادیت کھو چکی تھیں اب ان کا جواب دعویٰ پیدا ہو گیا ہے جس میں مغرب کے سیلاب نے کاروبار حیات و کائنات کی کچھ اور قدریں بھی شامل کر دی ہیں وہ طبقہ ابھی موجود ہے جس نے اس تہذیب کو جنم دیا تھا اس کے ہاتھ میں دولت ہے اس کے پاس برائے نام طاقت بھی ہے مگر اس

مزاج زمین کے کس حصہ میں نشو و نما پا سکتا ہے اس طور سے زمین، پودے اور پھول پتیوں میں ایک قسم کی فطری استواری اور خاکے میں وثوق پیدا ہو جاتا ہے یوں تو عام طور سے ان خاکوں میں مزید طنز ہے مگر جہاں کہیں مولوی صاحبان کے خاکے دئے ہیں وہاں اس میں قیامت کا نکھار پیدا ہو گیا ہے ان خاکوں میں اندرونی تضاد، دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پیدا ہے چہرہ مہرہ وضع قطع اور بات چیت سے ایک دعویٰ ہوتا ہے اور فوری طور پر حرکات و سکنات سے اس کی نفی سرزد ہو جاتی ہے کھنچے ادھر ہیں کھنچ ادھر جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ تضاد ایک ہی لمحے میں اس تیزی کے ساتھ واقع ہوتا ہے کہ اس کی گرفت مشکل ہو جاتی ہے۔

ان صاحبوں میں کمزوری بھی ان کی طاقت کی مناسبت سے ہے یہ خدا اور انسان کے درمیان واسطہ ہیں مگر عام طور سے خدا کی بارگاہ میں بود و باش رکھتے ہیں اور انسانوں پر وحی و الہام کی طرح نازل ہوتے ہیں یہ جو بات کہتے ہیں آخری ہوتی ہے ان کے پاس جو صداقت ہے وہ مکمل ہے یہ انسان کو محض اس لیے کشتنی سمجھتے ہیں کہ اس میں الٰہی صفات نہیں ہیں۔ یہ ہر قسم کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں اور اگر آپ اس پر ایمان نہ لائیں تو آپ کو پیمبرانہ دعائیں دیتے ہیں زمین سے ان کا علاقہ نہیں مگر آکاس بیل کی طرح زمین کے تناور درختوں پر چھا جاتے ہیں اور صدیوں تک ان کا رس پی پی کر شاداب رہتے ہیں۔ چھا جانے اور چھائے رہنے کی پیاس پھر بھی نہیں بجھتی، انھیں علم کی ضرورت اور فائدہ کا احساس نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے یہ زندگی کو جامد سمجھتے ہیں اس لیے ان کا ہر قانون تمام انسانوں اور تمام زمانوں کے لیے ہوتا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک ایک ہی وقت میں کوئی بات سچی اور جھوٹی نہیں ہو سکتی اور جو بات کسی وقت سچی ثابت ہو چکی ہو، ہر وقت اور ہر موقعہ کے لیے ویسی ہی ہے، انسان ان کے خیال میں چیزوں کا پیمانہ نہیں ہے یہ خود چیزوں کا پیمانہ ہیں جن سے اپنے علاوہ ہر چیز ناپی جا سکتی ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی کمزوری ہے اور اسی باعث ان کے خیال اور عمل، دعوے اور دلیل میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ان بوڑھے مولوی صاحب کا ذکر تو ہم ابتدا ہی میں کر چکے ہیں جو زیتون کی تسبیح ہاتھ میں لیے پائنچے چڑھائے درخت کی پھننگ پر چڑھ گئے تھے اور "کبھی آسمان کو دیکھتے تھے اور کبھی بسم اللہ کو" اس خاکہ میں بسم اللہ کا کردار بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک اور خاکہ دیکھیے یہ مولوی صاحب کان پور کی ایک مسجد میں رہتے ہیں وہاں سوئے اتفاق سے امراؤ جان ہاری دکھیاری قسمت کی ماری پہنچ جاتی ہیں یہاں جو مکالمہ ہوتا ہے وہ توجہ کے لائق ہے۔

کی والدہ زندہ تھیں ان سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہے بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی بچپن میں شادی ہوئی تھی مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا فن موسیقی میں ان کو کمال تھا کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا سوز خوانی میں یکتا تھے"

نواب صاحب کی خوبیوں سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ ان کی انفرادی خوبیاں ہیں جن کی بدولت وہ دوسروں سے ممتاز ہیں "مگر سرکار سے ایک رنڈی کا رسم بندھا ہوا تھا" "دو گھنٹے کے لیئے مصاحبت کرکے چلی آتی تھی" "کھلائی آکے زبردستی اٹھالے جاتی" "بیوی سے علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا" یہ چار فقرے ان کی روایت ان کے عوائد رسمیہ ان کی نسائیت اور کمزوری پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے سفید بالوں کا احترام کرنے کے باوجود ہمیں ان پر زیر لب ہنسی آتی ہے۔

ان کے برعکس نواب چھبن ہیں ان میں حرارت و مردانگی ہے غالباً وہ زندگی کی یکسانیت سے اکتا گئے ہیں ان کے دل میں محبت کی گرمی بھی ہے اور وہ اس کی خاطر بن اور بگڑ بھی سکتے ہیں مگر وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو انعام کی ہوس میں ایک بار تو سب کچھ لٹا دیتے ہیں مگر انعام نہیں ملتا تو مایوس بھی جلد ہو جاتے ہیں اور پرانی روش سے بیزار ہو کر میانہ روی کا دامن تھام لیتے ہیں ان میں محبت ہے وہ خاندان سے بغاوت بھی کرتے ہیں خانم کی بے رخی اور بسم اللہ جان کی بے وفائی سے ان میں جینے کا حوصلہ نہیں رہتا وہ ڈوب کر جان دے دینا چاہتے ہیں مگر پھر ابھر آتے ہیں اور گومتی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ماضی سے مفاہمت کر لیتے ہیں ان پہلوؤں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی سچی تڑپ ان میں بھی نہ تھی بسم اللہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دینا بھی ایک اتفاقی لغزش تھی جس میں ان کے لیے عبرت کا کافی سامان تھا وہ اپنے گناہوں پر پچھتائے سب نے انھیں معاف کر دیا لیکن زندگی انھیں معاف نہیں کر سکتی" نواب سلطان ان سے ذرا مختلف ہیں ان کا حصہ ناول میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے ہم ان کے بارے میں آئندہ کچھ کہیں گے" سرد کچھ اور سہی" رسوا نے ان خاکوں میں اپنے بیان سے زندگی کا رنگ بھر دیا ہے امراؤ جان میں اس قسم کے بے شمار خاکے ہیں یہ خاکے اس لیے اور بھی جان دار ہو گئے ہیں کہ ان میں کم سے کم الفاظ' اپنے بہترین سیاق و سباق میں شخص کی قدر و قیمت اور اس کے موقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے استعمال کئے گئے ہیں ساتھ ہی ایک اور خوبی ہے رسوا چہرے کو بھی اس انداز سے دکھاتے ہیں کہ اس میں نامحسوس طور پر مزاج کا خاصہ اور بانکپن ابھر آتا ہے یہ ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ "

مولوی - "اجی وہ کچھ سہی جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں آپ اپنا مطلب کہیے"

ہیں - "مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا بالفعل زبانی مباحثہ ہے"

"شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے" مولوی کا یہ جملہ ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کچھ نہیں یہ نعرۂ جنگ بھی ہے مگر کس کے خلاف، شیطان کے خلاف مگر شیطان ہے کہاں؟ ہوسکتا ہے مولوی میں ہو مگر بظاہر تو ایسا نہیں تو پھر امراؤ جان میں ہوگا! مگر امراؤ جان میں شیطان کہاں سے آیا غالباً مولوی کے چھپے ہوئے احساسات سے تو پھر جملہ نعرۂ جنگ نہیں، فریاد ہے، مگر مولوی تو شیطان کو مات دے سکتا ہے مگر شیطان ہے کہاں باہر تو ہے نہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس کو مات دے سکتا ہے مگر ایسا ہوتا تو وہ فریاد ہی کیوں کرتا؟ کیا وہ دو لمحوں میں ہار گیا۔ دل ہی کہتا ہے۔ یہ جملہ بھرپور طنز ہے اور یہ ایک شخص پر نہیں پوری جماعت پر ضرب لگاتا ہے ان کے عقاید کیا ہیں یہ انسانی سطح سے کتنے بلند ہیں عام انسانوں پر کس کس طرح وار کرتے ہیں ان میں اندرونی تضاد ہے یہ تضاد ان کے اخلاقی نظام کی جان ہے۔ یہ لوگ بیک وقت دعویٰ بھی ہیں اور اس کی نفی بھی۔

مولوی صاحب کا یہ خاکہ کہانی میں ذرا آگے چل کر آتا ہے ہم سے ایک غلطی ہوگئی مگر مجبوری کی بنا پر اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کیونکہ ہمیں زمانہ کو دیکھنا ہے وقت کو خود پر حاوی کرلینا ہمارے مقصد کے خلاف ہے بہرصورت اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ یا تو خانم کے دالان میں یا نوابین کے ایوانوں میں یا کسی اور چہار دیواری میں ہوا ہے ان بند کمروں میں عام طور سے وہی باتیں نظر آتی ہیں، فانوس اور چھت گیریاں قیمتی اور بھاری بھرکم لباس، مجرے، بار بار کھلتے اور بند ہوتے ہوئے دروازے، روپیہ کا لین دین، گانے بجانے کی آوازیں، ناچتے ہوئے بدن، تھرکتی ہوئی بوٹیاں، رنگے ہوئے چہرے اور چلتی ہوئی آنکھیں، نوچیاں جادو کی پڑیاں ہیں جو ایک کمرے سے دوسرے کمرہ میں اور دوسرے سے تیسرے میں بحفاظت تمام لے جائی جاتی ہیں اور ہمیں بھی ان کے ہمزاد کی طرح ان کی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے ہم اکتا جاتے ہیں ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم یہ بندشیں توڑ ڈالیں اور جست لگا کر کسی ایسی فضا میں پہنچ جائیں جہاں انسانوں کا ہجوم ہو جہاں چاند ہو، سورج ہو، بادل ہوں کچھ ہو، شیشہ گر کی دکان نہ ہو، رسوا ایک اچھے فن کار کی طرح ہمارے دل کی بات پالیتے ہیں۔ انھیں اپنے مقصد کے لیے بھی اس فضا سے نکلنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ ہمیں اس معاشرت کی چند اور جھلکیاں بھی دکھانے چاہتے ہیں ابھی تک ہم نے فطری روانی کے ساتھ زندگی کا بہاؤ نہیں دیکھا ہے مگر یہ تو ساون کا مہینہ ہے

"مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ اور دلفریب تقریر نے جادو کا اثر کیا بھلا جواب کیا منھ سے نکلتا ہکا بکا ادھر اُدھر دیکھنے لگے میں سمجھ گئی کہ دامِ فریب میں آ گئے

مولوی۔ (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں "جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے"

مولوی (بہت گھبرا کر) "مسجد میں؟"

میں "جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں"

مولوی "لاحول ولا قوۃ"

میں۔ "اوئی مولوی صاحب مجھے تو سوا آپ کے کوئی اور نظر نہیں آتا"

مولوی "جی ہاں؛ تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی لیے تو میں نے کہا، مسجد میں آپ کا کیا کام؟"

میں "یہ کیا خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہوں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں۔ یہ خوب کہی آپ کا کیا کام ہے؟"

مولوی۔ "میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں"

میں۔ "میں آپ کو پڑھا دوں گی"

مولوی "لاحول ولا قوۃ"

میں۔ "لاحول ولا قوۃ" یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں، کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے"

مولوی "شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے"

میں۔ "خدا سے ڈرنا چاہیے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا، اور یہ کیا آپ کہاں آدمی ہیں؟"

مولوی (ذرا بگڑ کر) "جی ہاں! اور کون ہوں؟"

میں "مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں، اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

مولوی "پھر کیا کریں۔ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے"

میں اسی سے تو آپ کے چہرہ پر وحشت برستی ہے وہ آپ نے سنا نہیں ؎ تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است۔"

لیجئے دوسرے صاحب ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں اماں پان تو لا ؤ کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا معلوم ہوا آپ بڑے تونگر ہیں، پیسہ دو پیسہ کی آپکے آگے کیا اصل ہے؟

"سرشام سے دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی پھر گھر چلنے کی ٹھہری اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید کا میانہ خالی ہے ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔"

اس موقعہ پر اگرچہ انسانی مرقعے ہماری توجہ کا مرکز ہونے چاہئیں اور رہیں گے، لیکن اگر ہم رسوا کی منظر نگاری بھی دیکھتے چلیں تو فائدہ سے خالی نہیں نظارہ دکھانے سے پہلے رسوا ہمیں بتا دیتے ہیں کہ "یہ ساون کا موسم ہے" اس جملے سے ہمارے دل میں چند احساسات بیدار ہو جاتے ہیں جو ہمارے تجربوں کی بنا پر ایک ہالہ سا بنا لیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس ہالے میں کچھ مخصوص چیزیں ہی ابھر سکتی ہیں ساون کے موسم میں پانی برستا ہے آسمان دھواں دھار ہو جاتا ہے اس وقت بھی آسمان سے دودھ کی دھاریں پھوٹ سکتی ہیں یہ بات توقع کے عین مطابق ہے مگر "پانی برس چکا ہے" اس جملے کی مدد سے ایک گریز ہوتا ہے اور وہ لمحہ ہماری گرفت میں آجاتے ہیں جو گذر تو چکے ہیں مگر حال کے لمحوں پر اپنا اثر چھوڑ گئے ہیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے اس کے بارے میں کچھ واقفیت تو اوپر دئے ہوئے جملے میں اور کچھ ہمارے گذشتہ تجربوں میں موجود ہے۔ ہم پیشین گوئی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہمیں وقت کا احساس ہو، یہ احساس بھی تیسرے جملے سے ہو جاتا ہے یعنی "سہ پہر کا وقت ہے" اب ہمیں دو باتیں معلوم ہیں "پانی برس کر کھل چکا ہے" اور "سہ پہر کا وقت ہے" تیسری بات از خود ہمارے ذہن میں آسکتی ہے وہ رسوا کے الفاظ میں یہ ہے "چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے" ابر کے ٹکڑے آسمان پر آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں" آسمان اور چوک کے کوٹھوں کا نام لے کر رسوا نے اس مخصوص فضا کے خطوط کو اور بھی واضح اور گہرا کر دیا ہے۔ ہم ان کے سایے میں چلتے ہیں اور ہماری نگاہیں وہاں پڑتی ہیں جہاں زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیتے ہیں، ہمیں ہمارے ذہنی نقش اور اس نظارے کی تصویر کا حاشیہ ہونا چاہئے یہاں پہنچ کر رسوا کا آخری جملہ ہمارے کام آتا ہے "رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے"

آخری جملہ پڑھتے ہی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ فضا نے ہمیں چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔ تصویر پوری ہو گئی اسے بنانے میں رسوا نے جہاں رنگ سے کام لیا ہے وہاں اس میں بڑی نازک منطق بھی ہے کسی چیز کو جاننے

سہ پہر کا وقت ہے پانی برس کے کھل گیا ہے چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں پچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہے"۔

"آج جمعہ کا دن ہے ہر جمعہ کو چوک میں سفید پوشوں کا مجمع ہو جاتا ہے عیش باغ کا میلہ بھی اسی روز ہوتا ہے میلے میں وہ بھیڑ ہیں ہیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے، جا بجا کھلونے والوں مٹھائی والوں کی دکانیں ہیں خوانچے والے میوہ فروش، ہاروالے، تنبولی، ساقنیں، غرضکہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ ہے" یہ ہجوم دیکھ کر ہمیں تسکین ہوتی ہے یہاں ہمارے حواس خمسہ بھی آزاد ہیں اب تک ہم خاص قسم کے گانے اور سرگوشیاں سنتے اور خاص قسم کے چہرے دیکھتے چلے آئے تھے، یہاں پہلی دفعہ ہمیں ساقنیں نظر آتی ہیں وہ کیسی ہی سہی بہر حال ہمیں اپنی قوت باصرہ میں طراوت سی محسوس ہوتی ہے یہ لوگ بے تکی آوازیں لگاتے ہیں اور ایک دوسرے پر آوازے کستے ہیں پھر بھی ہماری قوت سامعہ ان کی کرخت اور ناہموار آوازوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ ہمارے وجدان میں ہر قسم کے انسانوں کو دیکھ کر گدگدی سی ہوتی ہے اور ہم ان بے شمار چہروں میں دلوں کے پرتو دیکھتے ہیں آیا خوش ہیں یا نہیں؟ نوابوں اور نوچیوں کی طرح یہ بھی مصنوعی ہیں یا ان میں آزاد پرندوں کی سی بات ہے، یہ جنسی طور پر صحت مند ہیں یا ہر انجمن کی رونق ہیں؟ ہمارے دل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں آیا ایک انسانی جذبہ ہے اس کی مدد سے ہماری نظر وسعت اور ہمارے دل و دماغ رہائی حاصل کرتے ہیں سوا پھر ہماری مدد کرتے ہیں، یہ ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے" ایک صاحب ہیں وہ اپنے تنزیب کے انگرکھے اور اودی صدری، نکے وار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اترائے ہوئے چلے جاتے ہیں ایک صاحب رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا باندھے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی مکدر ہیں یہ جبیں کچھ چپکے چپکے بڑ بڑاتے بھی جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بیوی سے لڑ کر آئے ہیں جن باتوں کے جواب بر وقت سوجھے نہ تھے وہ اب یاد کر رہے ہیں ایک صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ اماں کھانا پکاتی ہوں گی اماں کا جی ماندہ ہے اماں سو رہی ہوں گی اماں جاگتی ہوں گی بہت شوخی نہ کیا کرو نہیں تو اماں حکیم کے یہاں چلی جائیں گی۔ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں ناک میں ننھی سی نتھنی ہے دہری چوٹی گندھی ہوئی ہے لال شالباف کا موباف پڑا ہے ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں کلائیاں دکھی جاتی ہیں کوئی چوڑیاں نہ اتار لے کیسے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

جانچنا اور سمجھنا ضروری ہے یہ لہریں ہماری اور آپ کی طرح انسان ہیں یہ زندہ ہیں ہم انہیں ٹھیک ٹھیک کروہ راز دریافت کرسکتے ہیں جو اُن کے بطون میں چھپا ہوا ہے ان کے چہرے بولتے ہیں اور ان کی زبان میں لکنت نہیں ان میں سے ایک صاحب مخملی جوتیوں پر اتراتے ہوئے چلے جاتے ہیں" انھیں دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے مگر وہ یہ کہتے ہوئے کہ" خوشی کسی کی میراث نہیں ہے اور کبھی کبھی تو ہم آپ بھی مسکرا سکتے ہیں اتفاقاً ہی سہی" آگے بڑھ جاتے ہیں۔

" دوسرے صاحب رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں" یہ کوئی اچھی بات نہیں وہ کہہ بھی سکتے ہیں کہ میرے بدن میں چیونٹیاں سی کاٹتی ہیں مگر ایسا نہیں ہے ان کی رگوں کی پیاس بجھ چکی ہے البتہ ہوس باقی ہے ایک اور صاحب" چیں بہ جبیں کچھ بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں" شاید اس دنیا میں ان کا کوئی رفیق نہیں ان کا بدن میلے میں ہے مگر ان کی روح کہیں اور ہے وہ ہم سے پوچھتے ہیں" انسانوں میں عام طور سے کتنا فاصلہ ہوتا ہے" ایک صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے ہمیں یہ دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ میں پاکی ہے وہ عورت میں الوہیت کا جلوہ دیکھتے ہیں مگر وہ ہمیں دوسری نگاہ میں اپنا راز بتا دیتے ہیں" میں دماغی طور پر ناکارہ ہوں آپ جسے میرا کارنامہ سمجھ رہے ہیں وہ میرا تکیہ کلام ہے اور بس" ایک صاحب اپنی بچی کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں کلائیاں دکھی جاتی ہیں کوئی چوڑیاں نہ اتار لے" ہمیں ان کی حماقت اور ظلم دونوں پر پیار آتا ہے مگر وہ آنکھ کے اشارے سے ہمیں چوکنا کردیتے ہیں دل کہتا ہے کہ یہاں ہر بات غیر یقینی ہے غنیم گھات میں ہے" خدا جانے ہم کہاں ہیں؟

لیجئے" ایک اور صاحب کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا معلوم ہوا کہ آپ بڑے تونگر ہیں پیسے دو پیسے کی آپ کے آگے کیا اصل ہے" ہمیں یہ گوارا نہیں کہ مفلسی میں حوصلوں کا اظہار کیا جائے۔ بلبلے پیدا کرنا اور انھیں توڑ ڈالنا نہ تو لعو کا مشغلہ نہیں، ہمیں ان لوگوں کے حوصلوں پر ہنسی آتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی عظمت اس کی جیب میں ہے ہم ابھی اس خاکے کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ پائے کہ وہ زور سے پکار اٹھتا ہے "یہاں کوئی خوشی سچی خوشی نہیں کوئی حوصلہ بھی سچا حوصلہ نہیں، یہاں خوشیاں بکتی ہیں کوئی مہنگی ہوتی ہے اور کوئی سستی، میری جیب میں ہر جمعہ کی شام کو ایک ہی پیسہ ہوتا ہے اور میں ایک مہینہ میں بڑے اطمینان سے چار خوشیاں خرید سکتا ہوں بھلا اس میں آپ کو کیا اعتراض ہے" اب ہم بہت کچھ دیکھ چکے اور اس میلے کو دیکھ کر تو طبیعت اور بھی سیر ہوگئی، ہمیں کھلی ہوا میں نکلنے کا شوق تھا وہ بھی پورا ہو گیا ہماری ملاقات ان سے بھی ہوگئی جنھیں عوام کہتے ہیں ان کی زندگی اس زندگی کے امکانات ان کے

یا کسی فضا کو متعین کرنے کے لیے منطقی طور پر جو سوال ہمارے سامنے آتے ہیں یعنی کہاں ہے؟ کب ہے؟ کیوں ہے؟ ان کے جواب ان چار جملوں میں اس خوبصورتی اور سلیقہ سے آگئے ہیں کہ ہمیں اس دعویٰ کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ رسوا کے بیان واقعہ میں اور شعر میں کوئی فرق نہیں ان کی منطق اتنی نازک ہے کہ وہ شعر کے جامے میں سما بھی سکتی ہے۔

اب اس ہجوم کو دیکھئے اگر آپ اسے محض تکنیک کے اعتبار سے دیکھیں تو رسوا اس معیار پر نہ صرف یہ کہ پورے اتریں گے بلکہ ان کے یہاں ہم پھر کسی ایسی بات سے دو چار ہوں گے جسے ماورائے سخن کہنا چاہئے۔

بہرحال یہاں ہمیں صرف تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں رسوا بالکل ابتدا میں خورشید جان کے حسن، اس کی جامہ زیبی اور ادا اسی کی تصویر کھینچتے ہیں یہ تصویر کچھ ایسی ہمدردی اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کی گئی ہے کہ قاری کے لیے اس کا بھلا دینا کسی طرح ممکن نہیں، میلے کی سیر کے وقت وہ ہمارے دل و دماغ میں بسی رہتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس میلے کے لیے پس منظر کی موسیقی کا حکم رکھتی ہے، درحقیقت یہ لہریں سیلاب کی طاقت اور رفتار کا پیمانہ ہیں یہ اس کی سطح سے ابھر کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں آگے چل کر وہ اس بہاؤ سے دو چار لہریں چن لیتے ہیں ان لہروں میں ایک خاص قسم کا بانکپن ہے ہم انھیں پاس سے دیکھتے ہیں اور ان کے نفس کی گہرائی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے ہم ان میں اور ان کے علاوہ دور و نزدیک جو کچھ دیکھتے ہیں امراؤ جان کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لیے اس ہجوم پر حکم لگاتے وقت ہمیں امراؤ جان کی پیشانی کے خطوط دیکھنے ہوں گے، واپسی کے وقت اس پر کیا تاثرات ہیں اس کے منہ کا ذائقہ کیسا ہے؟ یہ تو ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ امراؤ جان کے ساتھ اس کی نامحرم کنواریاں ہیں جن کے میانے موتی جھیل کے کنارے، بڑی دیر سے ان کے منتظر ہیں یہاں پہنچ کر کیا ہوتا ہے اسے امراؤ جان کے الفاظ میں سنئے "دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی پھر گھر چلنے کی ٹھہری اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے اب جو دیکھتے ہیں خورشید کا میانہ خالی ہے ان کا کہیں پتہ نہ ملا" چلتے وقت امراؤ جان نے اس کے جوبن کو جی بھر کر دیکھا تھا شاید خورشید جان کو اس کی نظر لگ گئی راستہ میں اسے یہ دیکھ کر ہنسی آئی تھی کہ ایک صاحب اپنی بچی کے ہاتھ زور سے پکڑے ہیں کہ کوئی اس کی چوڑیاں نہ اتار لے لوٹتے وقت اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے زمین پر انگارے بچھا دئے ہیں اس واردات میں رمز یہ طنز بھی ہے اور مجموعی تاثر بھی سنسنی بھی ہے اور ایک بھید بھی جس کے جلد یا بدیر کھلنے کی توقع ہے مگر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ یہ فن کار کی مشیت ہے اور اس میں کسی کو چارہ نہیں ہم نے کہا تھا کہ رسوا نے اس بہاؤ سے چند لہریں چن لی ہیں انھیں پر کھنا

اب یہ سطریں ملاحظہ ہوں ..... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں منھ پر دوپٹا ڈالے ہوئے، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی دوپہر سے پہلے کا واقعہ ہے ..... حسب معمول فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے ..... آتے ہی کہا آج ہم باہر جاتے ہیں ..... پرسوں ضرور آئیں گے، اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو ..... فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کوئی بھی عذر نہ ہوتا ..... بوا حسینی نے آکر صاف جواب دیا "ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا"۔

فیض علی۔ "دوگنی تنخواہ پر بھی"۔

بوا حسینی "چوگنی تنخواہ پر بھی ممکن نہیں۔ ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے"

فیض علی۔ "خیر جانے دو"

بوا حسینی چلی گئیں مگر میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے (میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی)

میں۔ "اچھا تو میں چلوں گی"

فیض علی "اچھا چلو گی!"

میں۔ "ہاں کوئی جانے دے یا نہ جانے دے میں ضرور چلوں گی"۔

فیض علی۔ "دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہوگا"!

ان سطروں میں فیضو کے خط و خال ہی نہیں اس کی شخصیت کے وہ تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جن میں چونکا دینے والی بات ہے امراؤ جان کی خلوت میں وہ اس انداز سے آتا ہے گویا اس نے ابھی کوئی معرکہ سر کیا ہے اور اس میں اتنی قوت ہے کہ جہاں پاؤں رکھ دے گا وہاں کی زمین پگھل کر موم ہو جائے گی ہم اس کے تیور دیکھتے ہی کہہ اٹھتے ہیں کہ عورتیں اور قلعے جیتنے کے لیے ہیں۔ وہ زندہ لاوا ہے وہ تاثر رشیدہ بھی ہے مگر یہی اس کی طاقت کا راز ہے وہ اخلاق کی کجروی سے آشنا نہیں البتہ اس کے زحافات پر اسے پورا عبور ہے وہ آپ ہی اپنا زمین اور آپ ہی اپنا مطلع ہے۔ اس کی شریعت اس کے خون میں ہے اس کے لہجہ میں تندی اور اس کی زبان میں تلوار کی سی کاٹ ہے اس میں چھا جانے اور اپنی بات منوا لینے کی امنگ ہے وہ کنواری زمین سے فصل اگا سکتا ہے اور جیتی جاگتی آبادیوں کو بے دردی کے ساتھ پامال کر سکتا ہے جبھی

روح و بدن کی گرمی، ان کی ہوس پرستی، ان کی دماغی اور جسمانی مجبوریاں، ہر بات میں ان کی بے یقینی، ہر انجمن میں ان کی تنہائی ان کے حوصلے اور ان کی پسپائیاں بھی دیکھ لیں یہ سب سفید پوش ہیں مگر سفید پوشی ان کا زرہ بکتر ہے یہ سب لذت پرست ہیں اور لذت پرستی ان کا نعرۂ جنگ ہے دونوں روایتی ہیں مگر دونوں زندگی کو ایک سمت دیتے ہیں اور دونوں ان کی مخصوص زندگی کا ثبوت ہیں۔

یہ زندگی کتنی غیر محفوظ ہے کس قدر غیر یقینی ہے اور پھر کتنی محدود ہے کوئی ایسا بھی ہے جس کے لیے یہ زندگی محفوظ ہو یقینی ہو اور اتنی محدود بھی ہو، شاید کوئی بھی نہیں، تو پھر کوئی ایسا ہو جو زندگی اور موت دونوں کی تاب لاسکے زندگی کی نہ سہی موت کی سہی جس کے بدن میں شیطان ہو اپنے بلند معنی میں نہ سہی پست معنی ہی میں سہی، کوئی ہو کیسے ہی ہو مگر کوئی ایسا ہو جو ان حدود کو نہ مانے، ان زنجیروں کو توڑ دے جو وار کرسکے، وار الٹا پڑے کوئی مضائقہ نہیں گر جائے بلا سے گر جائے مگر جست لگا سکے، دوڑ تو سکے اس کی کوئی سمت ہو یا نہ ہو۔

رسوا کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا وہ اپنے قاری کو عام طور سے مایوس نہیں کرتے ان کے سینے میں وہ کشادگی نہ سہی جو سفید ریش بالزک کے حصہ میں آئی ہے مگر ان میں وہ سچائی ضرور ہے تو پھر وہ شخص کہاں ہے ہم جس کے متلاشی ہیں آئیے وہاں چلیں جہاں امراؤ جان شکار زندہ کی گھات میں ہیں، اب یہ سطریں ملاحظہ کیجئے جو یہاں وہاں سے لی گئی ہیں "ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں ایسی تھی سانولا رنگ چھریرا بدن ایک دوشالہ کمر سے لپیٹے اور ایک سر سے باندھے میرے کمرے میں درانہ چلے آئے اور آنے کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھ گئے کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا...... بوا حسینی نے گود پھیلائی انھوں نے چھن سے روپے پھینک دئے وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے کوئی پہر رات باقی ہوگی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آکر دستک دی وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا تو اب میں جاتا ہوں..... ان صاحب کا نام فیض علی تھا، پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات کو اور کبھی پچھلے پہر اٹھ کے جاتے تھے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہوگئے..... فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی... اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہوگیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی..... اس کو روپے پیسے کی کوئی پروا نہ تھی ایسا دل چالاک آدمی میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں....."

قطعاً محفوظ ہے یہاں آ کر یہ راز بھی ہم پر کھل جاتا ہے کہ خورشید جان عیش باغ سے یک بیک کیسے غائب ہو گئی اس واقعہ سے اس زمانہ کی سیاست کا بھرم بھی کھل جاتا ہے اور ہمیں اس روشنی میں ریاست کے کل پرزوں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے دھیان سنگھ ایک طرف تو سرکاری حکم کی تعمیل کرتے ہیں، ڈاکوؤں پر چھاپا مارتے اور انھیں لکھنؤ پہنچا دیتے ہیں دوسری طرف خانم سے لاگ ڈانٹ رکھتے ہیں اور اپنے آدمی ادھر ادھر لگائے رہتے ہیں کہ موقعہ پاتے ہی خورشید جان کو اڑا لائیں طاقت کا استعمال یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ جاہ و منزلت میں اضافہ ہو یا اس لیے کہ ہوا و ہوس تسکین پائیں، دھیان سنگھ نواب وزیر کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا ہے جو نواب وزیر شاہان دہلی کے ساتھ کرتے ہیں قوی دیکھتے ہیں تو حکم بجا لاتے ہیں موقعہ پاتے ہیں تو سند مانگتے ہیں وقت آتا ہے تو اپنا سکہ چلاتے ہیں۔ کوئی مرکز نہیں کوئی قانون نہیں کوئی تدبر نہیں کوئی دوست نہیں کوئی دشمن نہیں کوئی اصول نہیں کوئی روایت نہیں طوائف الملوکی ہے جو ہوتا ہے ہو رہتا ہے جو بنتا ہے بگڑ جاتا ہے۔ خاندان تباہ ہوئے جاتے ہیں وزرا انگریزوں کے اشارے سے سازشیں کرتے ہیں انگریز طبیب دواؤں میں زہر ملانے کے موقعے تلاش کرتے ہیں نواب زنان خانے کی گرد ہو کر رہ گئے ہیں طوائفیں، ڈومنیاں اور بیتریاں رات دن یلغار کرتی ہیں ہر محل ایک کمین گاہ ہے جھاڑیوں میں ڈاکو چھپے ہوئے ہیں عوام بے دست و پا ہیں، تہ خانوں میں بگلے اور دیوان خانوں میں مرغ ناچتے ہیں، خانقاہوں کے چراغ گل ہو چکے ہیں، شاہ ولی اللہ کے مدرسہ میں جنون کے آثار باقی نہیں۔ مردوں کو رو چکے جو زندہ ہیں اپنے داغ دھونے میں لگے ہوئے ہیں قرآن جزدان میں ہے خدا آسمان پر ہے آدم کہیں نہیں ہے

خدا ہم تلاش آدمے ہست، فیض علی اور نانا فرنویس جان پر کھیلنا جانتے ہیں غدار بھی کہہ سکتے ہیں مگر سلیقے سے محروم ہیں۔ غدر ہوتا ہی ہو جاتا ہے آگ بھڑکتی ہے دب جاتی ہے خانم گوشہ نشین ہو جاتی ہیں کون خانم؟ وہی جو اس دور کا زندہ اصول ہے" اس معاشرت کی روح رواں تھی اس جلوس کی آخری منزل تھیں قیامت سی قیامت ہے۔

دیکھتے دیکھتے عظمت کے ستاروں کے نشاں ہو گئے آنکھ سے دم بھر میں نہاں

ہائے وہ جاہ و حشم نام و نمود اُنکی حسرت تو ہے باقی لیکن اب انھیں ڈھونڈنے ہم جائیں کہاں۔

امراؤ جان کانپور روانہ ہوتی ہے کانپور میں فیض علی گرفتار ہو جاتے ہیں نواب سلطان کے یہاں مجرا ہوتا ہے وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں ان کی بیگم سے تفصیلی ملاقات ہوتی ہے بیگم صاحب کا نام کسی زمانہ میں رام دئی تھا یہ وہی ہیں جو قصہ کی ابتدا میں ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں، دونوں کو گرفتار تھیں بکنے سے پہلے ایک کال کوٹھری میں انھوں نے اپنی

تو امراؤ جان چلا اٹھتی ہے کہ ایسا دل چالاک آدمی رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں، وہ اپنے جنازے پر ہنسنے کے لیے تیار ہے مگر عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں، وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مجاور نہیں ہو سکتا اس نے کوئی چیز ورثہ میں نہیں پائی اس میں اپنی قوت ہے اسی لیے چھینتا ہے اور چھین سے پھینک دیتا ہے وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا اس میں کوئی ایسی بات ہے جو دوپہر کی دھوپ میں ہوتی ہے اور پھر بھی اس میں وہ نمک ہے جس پر امراؤ جان مٹنے کو تیار ہے خانم کے گاہکوں میں یہ نمک کہاں کہیں تاروں کی چھاؤں میں ہماہمی ..... اور پانی کے بلبلوں میں خون کی تلملاہٹ ہوتی ہے .... ان میں یہ گھن گرج کہاں؟ "ہم پرسوں آئیں گے ..... پرسوں ضرور آئیں گے۔ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو" دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہوگا" اس لہجہ میں گھلاوٹ نہیں مگر کوئی گہری منطق ہے اس میں شیطان بول رہا ہے جب ہی تو ایک رچی ہوئی طوائف کی رگوں میں زلزلہ آجاتا ہے اور وہ تھکے ہوئے پرندوں کی طرح گردن جھکا دیتی ہے اس تندی کے باوجود اس کے دل میں گرمی بھی ہے وہ دشمن سے بڑی بڑی قیمت وصول کرتا ہے مگر دوستی کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہتا ہے وہ گرم جوشی سے ہاتھ ہی نہیں دباتا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بھی گرنے لگتے ہیں وہ ہیرے لٹا سکتا ہے مگر ایک دوست کی نشانی کسی کو نہیں دے سکتا شاید یہی وجہ ہے کہ آوارہ گرد اس کا حکم مانتے ہیں کوتوال اسے چپکے سے چھوڑ دیتا ہے علاوہ اس کے کام آتی ہے فضل علی اس پر جان چھڑکتا ہے امراؤ جان اس پر مرتی ہے مگر حاصل یہ ہے کہ وہ جلال الدین شاہ خوارزم نہیں، رہزن ہے وہ زندہ ہے مگر تباہ کن ہے وہ عظیم ہے مگر گمراہ ہے ہم اس کے سایے میں پناہ ... لے سکتے ہیں مگر اس کے سایہ کا اعتبار نہیں، وہ اپنے دور سے میل نہیں کھاتا مگر اس میں آگے دیکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں، وہ معرکہ کا قائل ہے مفاہمت کا قائل نہیں، وہ غدر کر سکتا ہے انقلاب نہیں کر سکتا۔ بہرحال رسوا نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور ہم آہستہ آہستہ اس خاص زمانہ میں پہنچ گئے جب غدر کی آگ نے ملک کے گوشہ گوشہ کو ڈھانپ لیا ہے مگر اس آگ کے پھیلنے سے پہلے کئی باتیں ہو چکی ہیں امراؤ جان، خانم کے اقتدار سے بیزار ہو کر فیضو کے ساتھ نکل بھاگتی ہے۔ راستہ میں راجہ دھیان سنگھ کے آدمی تانگہ گھیر لیتے ہیں ان سے معرکہ ہوتا ہے یہ معرکہ سنسنی خیز ہے اور مصنوعی سا معلوم ہوتا ہے شاید اس لیے کہ امراؤ جان جو کچھ دیکھتی ہے سنولائے ہوئے گنوار اور سلگتے ہوئے توڑے، پردے کے اندر سے جھانک کر دیکھتی ہے راجہ صاحب کے محلات میں ہماری ملاقات خورشید جان سے بھی ہو جاتی ہے امراؤ جان کو اس کے روحانی سکون پر حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی حیرت اس لیے کہ لکھنؤ کی ایک رنڈی دیہات میں کیونکر رہ سکتی ہے اور خوشی اس لیے کہ یہاں اس کا بدن کم از کم خانم کی ستم ظریفیوں سے

ورنہ ہم کان پور ہوتے ہوئے فیض آباد جاتے جہاں ایک بڑی حویلی کی ڈیوڑھی میں دو بوڑھی عورتیں گلے مل مل کر روتی ہیں اور صبح کو وہ نوجوان امراؤ جان کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے آتا ہے جسے اس نے اپنی گودوں میں کھلایا تھا۔ فیض آباد سے ہمیں لکھنؤ جانا تھا۔ ہم لکھنؤ جاتے اور واقعات کے تسلسل اور بہاؤ کا ساتھ دینے کے لیے ہمیں جانا بھی وہیں چاہیے کیونکہ اب ناول اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے چنانچہ ہم اس وقت وہیں ہیں۔

غدر ہو چکا ہے جھلملائے ہوئے ستارے ایک ایک کر کے بجھ گئے ہیں وہ لکھنؤ جو بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں ڈوبا ہوا تھا خاصہ بدل گیا ہے آخر وہ تبدیلی کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے جو واقع ہو چکی ہے؟ ہمارا مطالبہ کیا ہے اور فن کار اسے اپنے حدود میں پورا کرتا ہے یا نہیں؟ دیکھنا یہ ہے کہ رسوا واقعے کا بیان کرتے اور سبک دوش ہو جاتے ہیں یا واقعیت کے چہرہ سے پردہ ہٹا کر ہمیں سچی تسکین بہم پہنچاتے ہیں دوسرے الفاظ میں وہ ہنگامے کی تاریخ پیش کرتے ہیں یا وہ تأثرات جو نتیجہ ہیں ناگزیر ہیں اور ناظر کے دل و دماغ پر وارد ہوتے ہیں۔ رسوا دوسرا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں کیونکہ وہ غدر کے لیے زمین ہموار کر چکے تھے ہمیں یقین تھا کہ یہ ساز و سامان کوئی دم میں بکھرنے والا ہے دوسرے ان کی تصویر مختصر پلاس پر ہے اس میں نانا فرنویس کے معرکے، ریزیڈنسی کی تباہی اور اہل فرنگ کی سخت جانی، دکھانے کی گنجائش نہیں تیسرے اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ یہ ان کے دائرہ عمل سے باہر ہے ہمیں جن لوگوں سے واقفیت ہے انھیں ہم معرکہ میں کب دیکھ سکتے ہیں، اُن پر تو کچھ گذر ہی سکتی ہے وہ کسی المیہ کے موضوع نہیں بن سکتے کیونکہ ان میں خطرہ مول لینے کی ہمت نہیں ہاں وہ خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں رسوا یہاں پھر اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں جو باتیں ہم جاننا چاہتے ہیں ان کا جواب ایک ایک کر کے ہمیں ان کے مخصوص منطقی شاعرانہ انداز میں مل جاتا ہے (۱) غدر کے بعد لکھنؤ اور وہ لوگ کیا ہوئے جو ان در و دیوار کے پردر دگار تھے (۲) خانم کس حال میں ہیں وہی جو اس دور کا زندہ اصول تھیں (۳) نوچیاں کہاں ہیں وہی جن کے دم سے قدم قدم پر بہار تھی (۴) امراؤ جان کے سینہ میں دل دھڑکتا ہے وہ کونوں میں جھانکتی ہے؟ (۵) بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں یا نہیں؟

طوالت سے بچنے کے لیے ہم ذیل میں چند سطریں نقل کیے دیتے ہیں وہ ہمارے سوالات کا جواب اور رسوا کی فنی بصیرت کا ثبوت ہیں آخری سوال کو دماغ میں محفوظ رہنا چاہیے کیونکہ ماضی کا تبصرہ ناول میں ایک مستقل حکم رکھتا ہے۔

اب یہ سطریں ملاحظہ ہوں "لکھنؤ میں آ کر خانم کے مکان میں اتری، وہی چوک، وہی کمرہ، وہی ہم ہیں اگلے انے والوں میں سے کچھ لوگ تو کلکتہ چلے گئے تھے کچھ اور شہروں میں نکل گئے تھے شہر میں نیا انتظام نئے قانون جاری تھے

زندگی کی سب سے بھیانک رات ساتھ ساتھ گذاری تھی اسی لیے روحانی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں زمانہ کی گردش اور بے یقینی دیکھیے اور دونوں کا مقابلہ کیجیے، ایک وہاں ہے جہاں دن کے سوا رات نہیں ہوتی اور ایک وہاں ہے جہاں دن اور رات میں کوئی فرق نہیں، دونوں اپنے آغاز کے اعتبار سے ایک ہیں مگر اپنے انجام کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک بیوی ہے دوسری طوائف، ایک روح و بدن کی پاکیوں کا سنجوگ ہے اور دوسری روح و بدن کا واسوختہ ہے، ایک سلطان پر جان دیتی ہے اور نہیں پاتی دوسری ابرو کے اشارے سے میدان مار لیتی ہے، عقیدے کے لحاظ سے ایک کے لیے سلگتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور دوسری جہاں پاؤں رکھتی ہے شعلے چاٹنے کو لپکتے ہیں، دونوں نے زندگی کی پہلی رات ایک ساتھ گذاری تھی دونوں کہانی کے خاتمے سے ذرا پہلے ایک دوسرے سے ملتی ہیں اس طرح آغاز اور انجام ایک دائرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پلاٹ ناول کی زمین سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، سڈول متناسب اور موزوں درمیان میں واقعات کی ایک زنجیر سی بن جاتی ہے جس میں موضوع اور ساخت دست و گریبان نظر آتے ہیں اور جس کی بدولت قاری کو جمالیاتی تسکین حاصل ہو جاتی ہے، تصور میں جو خطوط ایک دوسرے سے مل کر دائرہ بناتے ہیں ان میں سے دو ایک میں کجی ہے، مشاعرہ ضرورت سے زیادہ طویل ہے، نواب چھبن بہت عرصہ کے بعد دریافت ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسوا نے واقعیت کی مجبوری سے انھیں گومتی میں ڈبو یا تھا اور اب پلاٹ کی ضرورت سے ابھارا ہے فیضو اور دھیان سنگھ کا معرکہ ضروری تھا وہ ایک مفید اور ناگزیر کڑی ہے مگر وہ مصنوعی ہے اور میلوڈرامائی بھی ہے آخر میں گودلا درخاں کی گرفتاری ایسی کھٹکتی نہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گرفتاری دراصل شاعرانہ انصاف کا ادبی تقاضہ ہے، بعد میں امراؤ جان نے ایک وعظ دیا ہے جو کچھ تو پلاٹ کی ضرورت سے لایا گیا ہے تاکہ شعلے کجلاتے ہوئے دکھا دئے جائیں اور رفتہ رفتہ ناول کے آخری حدود نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور کچھ اس لیے کہ زمانہ ناول نگار سے ایک خاص قسم کے اخلاق کی توقع رکھتا تھا اور اپنے پچھلے گناہوں کی تلافی کے لیے پند و موعظت کو ضروری خیال کرتا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وعظ کو ہم ناول کے دائرہ سے باہر سمجھتے ہیں، ناول تو دلاور خاں کی موت پر ختم ہو جاتا ہے اسے ناول کا تتمہ نہیں ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔

حسن تعمیر کی یہ بحث کہاں آنی چاہیے تھی اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، یہ بحث ضروری تھی اور ہماری رائے میں اسے وہیں آنا چاہیے تھا جہاں پلاٹ ایک دائرہ کی صورت میں ابھرتا ہوا نظر آئے پھر یہ ممکن نہیں کہ ہم ان خامیوں کو بھول جائیں جو اس دائرہ کے حسن اور ہماری جمالیاتی تسکین میں خلل انداز ہوتی ہیں، یہ منطق فطری ہے اسی نے ہمیں گریز کرنے پر آمادہ کیا

سبزہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں سامنے جھیل کے پانی میں آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہی درختوں کے پتوں کی آڑ میں کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی ہیں آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں جلدی سے چھولداری میں چلی آتی تماشہ دیکھتے ہوئے خدا جانے کتنی دور نکل گئی"۔

یہ سورج کی آخری کرنیں ہیں، یہ شام ایک پورے دور کی شام ہے یوں تو پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے اور شفق بھی پھولی ہوئی ہے مگر ان کی اصلیت سراب سے زیادہ نہیں آن کی آن میں آسمان پر سرمئی بدلیاں اور جھیل کی صاف ستھری سطح پر سیاہی سی پرچھائیاں چھلاوے کی طرح ناچتی ہوئی نظر آئیں گی اور ہم بھی خدا جانے کتنی دور نکل جائیں گے اس وقت ہمارے دل میں کیا کیا خیال آئیں گے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم راستہ بھول جائیں ہمارے پاس قطب نما تو ہے نہیں ہم کس سمت چلے گئے کہاں جائیں گے ظاہر ہے کہ ہم اس وقت ناول کے حدود میں ہوں گے اور ہم یہ بھولتے ہیں کہ ناول کی ابتدا میں امراؤ جان ہماری قیمت ادا کر چکی ہیں ہم ان کے ہاتھ میں ہیں وہ جہاں کہیں لے جائیں گی ہمیں جانا ہوگا یہ ہمارے آخری سوال کا جواب اور ناول کا خاتمہ ہے اور یہی وہ سمت ہے جس کی ہمیں تلاش ہے سمت کا مفہوم واضح کرنے کی ضرورت نہیں اس کی وضاحت خود بخود ہو جائے گی یہاں اس سوال پر بات چیت کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ ہیرو کیا ہوتا ہے نیز اس ناول میں کوئی ہیرو ہی یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو کیوں؟ یہاں ہم ناول کا ایک انتہائی خوبصورت ٹکڑا نقل کرتے ہیں اس کا سرا ہاتھ آجائے تو کئی باتیں آپ ہی آپ سلجھ جائیں گی وہ کوئی پہیلی نہیں ہے بیداری کا خواب ہے اور رسوا نے اسے ایک ایسے موقع پر چپاں کیا ہے کہ ہمیں ایک طرف ان کے منصب کی قدر و قیمت کا بے لاگ اندازہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ہمارے دماغ پر اس کی ناگزیری اور اس کی شدت جمال کا بے پناہ اثر ہوتا ہے جزئیات کے انتخاب میں ان کے مشاہدے کی باریکی اپنی گواہ آپ ہے اور یہ ناول نگار کی آخری کامیابی ہے اس ٹکڑے میں الفاظ کی سادگی ان کی فطری روانی اور ان کے اختصار پر بھی نظر رکھنی چاہیئے کیونکہ ہماری زبان میں غالباً وہی ایک ایسے ناول نگار ہیں جو کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ فلابیر کے اس نکتہ کو پہچانتے ہیں کہ " ایک خیال ایک ہی صورت میں ادا ہو سکتا ہے" وہ ٹکڑا یہ ہے" جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم کی طبیعت کچھ علیل ہے تمہیں یاد کرتی ہیں فوراً سوار ہو کے گئی انھیں دیکھ کر گھر واپس آنے کا ارادہ کیا جی میں آیا کہ ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں۔ کمرہ کھولا، دیکھا کمرے میں چار لیا

آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا چاروں طرف دمس بنے ہوئے تھے جا بجا چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں گلیوں میں کھڑنجے بنائے جاتے تھے نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں غرضکہ لکھنؤ اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

"آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں طرف دمس بنے ہوئے تھے" ظاہری شکل وصورت میں اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ ہمارے پہلے سوال کا جواب ہے۔

"زمانہ کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی جو رنڈیاں نکل کر علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپیہ پیسہ سے کچھ واسطہ و غرض نہ تھی بہرحال ع۔۔ان کو عبرت تو ہوئی غیر کے مرجانے سے۔

"رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں" اس کی تفصیل آگے چل کر ملتی ہے۔ ایک سلونی شام کو یہ سب امراؤ جان کے کمرہ میں جمع ہوتی ہیں ان میں خورشید جان بھی ہے جس کی موجودگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ غالباً راجہ دھیان سنگھ بھی غدر میں کام آ گئے یہ مجمع کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اسے دیکھتے ہی ہمارے دماغ کی بہت سے بہن نیس بیدار ہو جاتی ہیں" ایک زخم کا مسکرانا ہے غدر کے ہنگامہ کے بعد ان سب کا بہم ہونا ایک خوشگوار اتفاق ہے جس میں غضب کی عبرت ہے یہ بجائے خود بھولی بسری یادیں ہیں جنھیں دیکھتے ہی ہم خواب و خیال کے عالم میں پہنچ جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شعور کی تاش پانی میں ڈوب گئی ہے اگلی صحبتیں اور پرانی چوٹیں غیر ارادی طور پر ایک ایک کر کے ابھر آتی ہیں، یہ سب ایک دوسرے سے ملتی نہیں، ایک معنی میں ماضی کی یادگار مناتی ہیں، یہ مجمع ایک مرحوم معاشرت کی تلخیص ہے اور اس پر نازک تبصرہ بھی یہاں جو منظر نگاری کی گئی ہے وہ انتہائی خیال انگیز ہے اور رسوا کے فن کو نمایاں کرتی ہے کیونکہ یہاں منظر مقصود بالذات نہیں ہے وہ ہمارے اندرون میں ایک خاص دنیا پیدا کرتا ہے یا ہمیں کسی خاص فضا کے معنی و مفہوم سے آشنا کرتا ہے وہ ہمیں یا تو ایک نئے ماحول کے لیے تیار کرتا ہے یا بجائے خود ایک چھپی ہوئی تنقید ہوتا ہے وہ انسان سے آزاد نہیں مگر انسان اس کی مخلوق بھی نہیں، ہاں وہ انسان کی زندگی کو وسعت بخشتا ہے۔ اب یہ اقتباس دیکھئے۔

"گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا اس دن بیگا جان کا گانا جھولا کن ڈاروے امریاں کیا کیا۔ مانیں لی ہیں کہ دل لیا جاتا تھا" آخری جملہ معنی خیز ہے اور جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اس کی تائید کرتا ہے اب یہ سماں دیکھئے" جبر گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا سبزہ پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی جا بجا جنگلی پھول کھلے ہے پڑیاں

تھی! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقعہ پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے چیخ ماری۔ "آدمی! ... بیوی دیکھیے وہ کنکھجورہ آپ کے دوپٹہ پر چڑھا جاتا ہے" میں نے اوئی کہہ کے جلدی سے دوپٹہ اتار کر پھینک دیا، الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹہ اٹھا کے جھاڑا، کنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایا اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پایے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر برابر رکھی ہوئی ہیں۔" یہ خاصا طویل اقتباس ہے اس میں غدر کے اثرات جس خوبی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں اس پر تنقید کی ضرورت نہیں۔ یہ وہی کمرہ ہے جس کے ساز و سامان کی جزئیات پر رسوا نے ٹھہر ٹھہر کر روشنی ڈالی تھی، بار بار ہمیں اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہی کمرہ ماضی کا ترجمان اور اس کا ملجا و ماوی تھا۔ یہی اس کا مکتب تھا اور یہی اس کی منزل۔ اب یہاں نہ جلی آئینے ہیں، نہ فانوس ہیں، نہ چھت گیریاں ہیں، فرش الٹے پڑے ہیں، کونوں میں جالے لگ گئے ہیں، پلنگ گرد سے اٹے ہوئے ہیں کوئی قافلہ ادھر سے گذرا ہے جبھی تو در و دیوار پُر غبار ہو گئے ہیں۔ یہ حال ہے جس کا ماضی وہ تھا۔ "مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دوانے نے موت پائی ہے" اس ساز و سامان پہ غنودگی چھائی ہوئی ہے مگر اس کے مشاہدہ سے حافظہ پر چوٹ پڑتی ہے اور اس کے جاگتے ہی یہ سارا سامان جگمگا اٹھتا ہے اور اس کے متعلقات ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آنے لگتے ہیں البتہ یہ سب بکھرے ہوئے ہیں۔ ماضی کی زندہ تصویر بنانے اور اس کا سچا نقش ابھارنے کے لیے انھیں ترتیب دینا، پرانے انداز پر سجانا اور سنوارنا، آئینے میں اپنے خط و خال دیکھنا اور عمر رفتہ کو آواز دینا ضروری ہے۔ یہی ہمارا مطالبہ ہے اور رسوا اسے کمال فن کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔ امراؤ جان اس نگار خانے کو ماضی کی آرسی دکھاتی اور اگلے انداز پر سجاتی ہیں وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور اپنے چہرے کے ان سوئے ہوئے خطوط کو جگاتی ہیں جو ماضی کے جلووں سے نسبت رکھتے تھے۔ یہ عمل ایک ذہنی ہنگامہ ہے جو یک بیک انھیں حال سے نکال کر ماضی میں پھینک دیتا ہے۔ اب ماضی زندہ ہے۔ اس کی آنکھ میں سرخ ڈورے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ انگڑائی لیتا ہے۔ امراؤ جان کے رگ و ریشے میں اس کے حسن اور ہیبت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریباً چالیس سکنڈ کے لیے وہ کرخت، نکیلی اور سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز جسے ہم شعور کہتے ہیں کسی مٹیالی ملگجی جھیل میں ڈوب جاتی ہے۔ جس طرح جھیل میں کنکر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں، دائرے بنتے، ابھرتے، ملتے اور مٹ جاتے ہیں اسی طرح امراؤ جان کے لاشعور میں ایک ہلکی پھلکی قیامت بپا ہوتی، بل کھاتی اور بسر جاتی ہے۔ تصویریں نمودار ہوتی، ایک ایک کر کے رقص کرتی، اپنے تلازموں کی بنا پر گھلتی ملتی فانوس کی طرح گردش کرتی اور اپنا اپنا حساب دے کر پھر کسی برزخ میں چلی جاتی ہیں۔ یہ عمل تقریباً چالیس سکنڈ میں پورا ہو جاتا ہے۔ آدمی چیختا ہے: "بیوی دیکھیے وہ کنکھجورہ آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے" شعور پلٹ آتا ہے۔ وقت اپنی پرانی رفتار کے ساتھ بہنے لگتا ہے۔ آپ کو یہ

طرف جالے لگے ہیں پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے فرش فروش الٹا ہوا پڑا ہے، اِدھر اُدھر کوڑا پڑا ہے یہ حال دیکھ کر مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے اللہ ایک دن وہ تھا کہ یہ کمرہ کیسا سجا سجایا رہتا تھا دن بھر میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی، بچھونے جھاڑے جاتے تھے گرد کا نام نہ تھا تنکا تک کہیں پڑا نہ رہتا تھا یا اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا میں نے اس سے کہا ذرا جالے تو لے لے وہ ایک سیٹھا کہیں سے ڈھونڈ کر اٹھا لایا۔ جالے لینے لگا اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی آدمی نے اور میں نے مل کر دری بچھائی، چاندنی کو ٹھیک کیا جب فرش درست ہو گیا میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کر جھڑوائے کوٹھری میں سے سنگاردان، پان دان، اگالدان اٹھا لائی سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں جس طرح کسی زمانہ میں لگی رہتی تھیں خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی آدمی کے پاس خاصدان تھا۔ پان لے کے کھایا آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھا اگلا زمانہ یاد آ گیا شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اس زمانہ کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا گوہر مرزا کی شرارت، راشد علی کی حماقت فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی مروت، غرضکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آئے تھے مع اپنے اپنے خصوصیات کے پیش نظر تھے وہ کمرہ اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی پھر دوسری سامنے آتی تھی جب کل تصویریں نظر سے گذر چکیں تو یہ دورہ از سر نو پھر شروع ہوا پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں پہلے تو ایسے کئی دورے جلد جلد ہوئے اب ذرا توقف ہونے لگا اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ غور و فکر کرنے کا موقعہ ملا، جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے ان پر بھی نظر پڑنے لگی پہلے جب دماغ کو چکر ہوا تھا تو صرف چند تصویریں نظر آئی تھیں اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ جس میں سلطان صاحب کو دیکھا، اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا پھر ان کا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں شعر و سخن کا چرچا، خاں صاحب کا مخل صحبت ہونا، بد زبانی کرنا سلطان کا تمنچہ مارنا، خاں صاحب کا گر پڑنا شمشیر خاں کی جاں نثاری، کوتوال کا آنا، خانصاحب کا گھر پر بھجوانا، مگر سلطان صاحب کا نہ آنا، محفل میں ان کو دیکھنا لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں یہ دورے برابر چل رہے تھے مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کر آنا یاد آتا تھا طبیعت کچھ رک سی جاتی

بنّے صاحب کے مکان پر ملوا بھیجتے تھے عجب لطف کی صحبت ہوتی تھی، واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا کسی سے نہ ملا...... ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے ......!"

رسوا، نواب سلطان کو بڑے چاؤ اور محبت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کبھی کبھی تو یہ خیال گذرتا ہے کہ رسوا نے غالباً نواب سلطان کے روپ میں اپنی شخصیت کو ظاہر کیا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ نواب سلطان میں فطری سادگی ہے اور شرمیلا پن ہے جو مردانگی کے احترام سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں جرات بھی ہے مگر وہ صد درجہ محتاط ہیں انھیں فنون لطیفہ کا ستھرا مذاق ہے مگر جھوٹی تعریف پسند نہیں کرتے، وہ اپنی اندرونی قوت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور انھیں کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ان میں ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ روحانی پاکیزگی بھی ہے اور وہ اُسے آلودہ ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے وہ غیر معمولی نہیں مگر اپنے معاصرین سے بہت مختلف ہیں۔

وہ ناول میں اپنا پرتو ڈالتے اور کہیں دور چلے جاتے ہیں شاید وہ اپنے آپ کو سمجھنا اور اپنے تجربوں کو کوئی خاص رنگ دینا چاہتے ہوں، بہرحال اتنا یقینی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ مرنا نہیں چاہتے۔ جن سے موت اور زندگی دونوں شرمندہ ہیں وہ اپنی دنیا بنانا چاہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی دنیا مختصر پیمانے پر ہوگی کیونکہ وہ ہیرو نہیں ہیں ان میں ایک بھرپور کائنات کو جگانے اور زندگی کا رس دینے کی صلاحیت نہیں، وہ عظیم نہیں ہیں ان سے ہمیں جو توقع ہے وہ صرف اس بنا پر کہ وہ گراہ نہیں ہیں، ان کی شخصیت کا راز اس میں ہے کہ وہ عملی ہیں، مانا کہ وہ بہت آگے نہیں دیکھ سکتے مگر ان میں ایک خوبی یہی ہے کہ وہ جب اور جہاں چلتے ہیں دیکھ بھال کر چلتے ہیں اور اسی لیے وہ آخر میں جیتتے اور زوال کے بھنور سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں۔

خانم جو زوال کی آخری سازش تھیں ہیں مگر نہیں ہیں، فیض علی جو زمین کے سینہ میں ہپھرتے ہوئے لاوے کی طرح بدمست ہلچل تھے زمین کے سینہ میں محفوظ ہیں، نوچیاں جو اس دور کی آخری سبیل تھیں کوئی ایسی بات نہیں جو یاد سے نکل گئی ہو، نواب جعفر علی جو امارت کا غمزۂ پیری تھے، چاند کے غار میں ہیں، نواب چھبن جو رقص کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے بس دیوانہ چلے گئے، کٹنیاں، پترنیاں، مولوی، اور لونڈے کٹے ہوئے پتنگ ہیں اس طوفان سے کوئی ابھرا ہے تو وہ نواب سلطان ہیں کیونکہ وہ اپنا ہاتھ دلائی میں چھپائے رہتے ہیں نئے زمانہ کو سمجھتے ہیں اس سے مفاہمت کرتے ہیں آسودگی

محسوس ہوتا ہے نہیں کہ امراؤ جان ماضی کی ایک ایک تصویر کو بار بار چومتی تھیں اور ان کا آدھا وقت محض ایک تصویر پر صرف ہوا ہے یہ تصویر نواب سلطان کی ہے جن کی ملاقات، مذاق، ملازم، مکتوب محبت اور معرکہ کے بہت مختصر مگر شوخ و سنگ خاکے ان کے ذہن میں بھرے ہیں ماضی کے خاکے ہیں مگر نواب سلطان ابھی زندہ ہیں رسوا کی زبان میں ان کا ماضی یہ ہے " نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے آدمی تھے سن اٹھارہ انیس برس کا تھا دنیا کے جعل فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کی کیوں نہ ہو اُن پر مائل نہ ہو جائے بڑی بڑی آنکھیں بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئیں، چوڑی کلائیاں بلند دبالا کسرتی بدن"...... نواب :- "یہ کہیے آپ شعر بھی کہتی ہیں"

میں - "جی نہیں آپ جیسے قدر دانوں سے کہواتی ہوں"

" اس بات پر نواب صاحب پہلے تو ایک ذرا چیں بجبیں ہوئے پھر مجھے مسکراتے دیکھ کر ہنس پڑے"

نواب -" اکثر ایسے صاحب ہیں جنھوں نے کبھی ایک مصرعہ نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد.... جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی ......" اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن سیاہ رنگت، بڑھی ڈاڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی، کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کر بیٹھ گئے نواب صاحب نے میری طرف دیکھا ..... میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑے مارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا 'اب کیا کروں ......"

نواب :- خان صاحب رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجئے، اسی میں خیریت ہے آپ بہت کچھ زیادتی کر چکے ہیں..."

خان صاحب - (قہقہہ لگا کے) صاحبزادے ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ، کہیں چر کہ کھا جاؤ گے۔ تو اماں جان روتی پھریں گی ......"

نواب نے دلائی کے اندر سے ہاتھ نکالا ہاتھ میں طپنچہ تھا دن سے داغ دیا، خان صاحب دھم سے گر پڑے میں سن سے ہوگئی، فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا......

نواب :- "میں نہیں جاتا، اب جو کچھ ہوا، ہوا، اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا"

شمشیر خاں - (کمر سے چھری نکال کر) جناب امیر علیہ السلام کی قسم ابھی اپنے کلیجہ میں مار لوں گا نہیں تو برائے خدا آپ چلے جایئے"

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے ہفتہ میں دو تین مرتبہ ضرور نواز گنج میں نواب

چھا گیا جاڑے کے دن تھے سناٹے کی ہوا چل رہی تھی سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی دم نکلا جاتا تھا"
اس کے بعد وہ منظر ہے جب امراؤ جان خانم کے یہاں لائی جاتی ہے اس وقت کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے "دریا اٹھا ہی چلا آ رہا ہے" امراؤ جان کانپ رہی ہے پھر خانم کے دالان میں ایک جانب بوا حسینی کی کوٹھری دکھائی دیتی ہے تنگ اور تاریک "چراغ میں تیلی سوت سی بتی پڑی ہے مو اندھا اندھا جل رہا ہے لاکھ اکساؤ اونچی نہیں ہوتی" اس بیان کی روشنی میں گرمیوں کے دن اور برسات کی راتوں کا تصور کیجیے اور پھر اس موقع کی فضا ملاحظہ کیجیے جب امراؤ جان وصال کے سانحے کے بعد آئینہ دیکھتی ہے "برسات کے دن ہیں آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے پانی تل دھار اور پر دھار برس رہا ہے بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہا ہے میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں چراغ گل ہو گیا ہے اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دلائی سے منھ ڈھانپ لیتی ہوں" اس کے بعد نوچیوں کے سجے ہوئے کمروں کی فضا کو دل و دماغ میں جگائیے .... وہی نشستیں وہی گرم مرطوب سی فضا وہی صبح کا وقت کا سماں سب دو کنول روشن ہیں پھر مجروں کے ماحول پر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالیے "وہی عطر اور پھولوں کی خوشبو سے بارہ دری بسی ہوئی" دھواں دھار حقے گلوریاں ان کی بے پناہ مہک رات کا وقت نگیرہ تنا ہوا سامنے زرق برق لباسوں کی ڈھیریاں یہی وہ مقام ہے جہاں سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے اس کے بعد عیش باغ کے میلے کے اس منظر کو یاد کیجیے جس پر کافی بحث کی گئی ہے اس منظر میں آسودگی تو ہے مگر اس کا مجموعی تاثر آسودگی میں خلل انداز ہوتا ہے پھر فیض علی کا معرکہ یاد کیجیے "جابجا بھیڑ بھے بڑے غار سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا دور تک دونوں طرف گنجان درختوں کی قطار تھی .... کوئی پہر دن چڑھا ہوگا چاروں طرف سناٹا .... دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں .... توڑے سلگ رہے تھے" یہاں ویرانی اور وحشت کے علاوہ اور کیا ہے اس کے بعد فیض علی امراؤ جان کو سرائے سے اڑا لے جاتے ہیں اور کانپور جا کر ایک مکان میں قیام کرتے ہیں "مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے دو پہر رات ہو گئی اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی اب چاند بھی چھپ گیا بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا" یہاں بھی سوائے ہراس ہیبت اور ہیجان کے اور کچھ نہیں اب ان مناظر کو دیکھنے کے بعد نواب سلطان کی ایک محفل کا سماں دیکھیے جو ناول کے نصف اول میں سجائی گئی ہے "گرمیوں کے دن شب ماہتاب کا عالم صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے گاؤ تکیے لگے ہوئے .... باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے بیلے اور چمیلی کی مہک سے دماغ معطر" اس فضا میں یقیناً روحانی اور جذباتی سکون ملتا ہے اور یہ بیان اس کا مزید ثبوت ہے کہ ناول میں اول سے آخر تک ہمیں صرف

اور عصمت کی زندگی بسر کرتے ہیں ان میں بہتری کی خواہش ہے پرانی اور نئی روش میں توازن پیدا کرتے ہیں موقعہ پاکر وار کرتے ہیں فرار نہیں کرتے وہ جنسی لذتوں میں بھی گرفتار نہیں ہیں ان میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو سمجھنے کی صلاحیت ہے

اب رسوا کا یہ بیان دیکھئے اور منظر کی جزئیات پر نگاہ رکھئے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں ان کے یہاں منظر نگاری ایک خاص اہمیت رکھتی ہے وہ کہانی کے حصوں کو آراستہ کرتے چیزوں کو "حقیقت کا رنگ دینے" ناظر کے دماغ کو تازہ کرنے کسی فلسفے کی ترجمانی کرنے یا انسانوں پر کوئی خاص ٹھپہ لگانے کے لیے استعمال نہیں ہوتی اس کے برخلاف وہ عام طور سے اندرون میں کسی خاص فضا کو جگانے کے لیے اور کہیں کہیں استعارے کے طور پر لائی جاتی ہے اب کانپور کے بنگلے اور اس کی فضا کا حال دیکھئے۔

"نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈھ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح پر بڑھائے گئے تھے جس سے دیوار سی بن گئی تھی باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ کھجور اور طرح طرح کے خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی چاروں طرف سبزہ تھا جا بجا کنکروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے پہاڑیوں کے گرداگرد دوب جمائی گئی تھی باغ میں ہر چہار طرف پکے بہے بنے ہوئے تھے ان میں صاف ہولی سا پانی بہہ رہا تھا۔ پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا دن بھر دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہنچا تھا کیسے تر و تازہ اور شاداب تھے..... تھوڑی دیر میں شام ہو گئی چاند نکل آیا چاندنی پھیل گئی تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجیب کیفیت دکھا رہا تھا باغ کے ایک کنارے پر بہت عالیشان کوٹھی تھی وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا اس کے گرد ولایتی پھولوں کے نائدے خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے اسی تالاب سے ملا ہوا۔ ایک اونچا چبوترہ تھا اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنگلہ تھا اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی واقعی عجیب عالم تھا شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی" اس میں کوئی شک بھی نہیں کیونکہ ناول میں اول سے آخر تک نہ جانے کتنے منظر دکھائی دیتے ہیں وقت، موسم، فضا و ماحول تصویر کے پیکر میں ابھرتے اور دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر یہ جذباتی آسودگی کہیں نہیں ملتی اور ہماری جمالیاتی حس جس طرح یہاں بیدار ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی جس وقت امراؤ جان گھر سے نکلتی ہے اور دلاور خاں اسے بہلی میں ڈال کر لکھنؤ کے لیے روانہ ہوتا ہے اس وقت کا منظر یہ ہے: "چاروں طرف اندھیرا

پنپنے والیوں کے سوانگ سے دامن بچا کر نکل جانا حیرت انگیز سلامت روی کا ثبوت ہے اور اس دور میں بدن کی عصمت کو برقرار رکھنا زوال کو شکست دینا ہے اس کے علاوہ ایک اور بات جو بظاہر متصوفانہ معلوم ہوتی ہے مستقبل کی غیرارادی طور پر ہوئی ہے مگر جس میں غضب کی اشاریت ہے ہماری توجہ کے لائق ہے ہم نے اس معاشرت میں نہیں کوئی مستقبل کی علامت پائی ہے اس دور کے خشت و سنگ ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں بکھر رہے ہیں ان پر خستگی نے اپنی مہر لگا دی ہے ہمیں یقین ہے کہ ان میں کوئی ربط دینے والی چیز باقی نہیں مگر یہاں کس پیشانی میں وہ نور بھی ہے جو دوسری پیشانی میں منتقل ہو جائے کسی عورت کے بطن میں وہ رس پی پی کر جاگنے اور جگانے والی چیز ہے جو ہم سے پکار کر کہے کہ "خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا ہے" اس لامتناہی سلسلۂ دشت میں کوئی بچہ ہے جسے ہم گود میں اٹھالیں پیار کریں جو مسکرائے اور مستقبل کی بشارت دے اس کا جواب نفی میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسل ساری کی ساری بانجھ ہو گئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لکھنؤ میں امجد علی اور واجد علی شاہ کے عہد میں کسی گھرانے میں بھی چھٹی کی رسم ادا نہیں ہوئی ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ہمیں تو ناول میں دیکھنا ہے کہ کہاں اور کن لوگوں میں زندگی ہے کون تر و تازہ اور شاداب ہیں کون مردہ اور افسردہ اور بے ذوق ہو کر رہ گئے ہیں کن لوگوں کی شخصیت میں نشو و نما ہو رہا ہے اور آئندہ بھی اس کا امکان ہے کون ایسے ہیں جو رات کو بھیانک خواب دیکھتے ہیں اور دل کی دھڑکن میں مبتلا ہیں کون ناکارہ ہیں اور جنسی بیماریوں کا نشانہ ہیں کون تندرست ہیں اور باعصمت زندگی گذارتے ہیں کون اپنے ارمانوں کی سچی تصویر اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور کس کی گود خالی ہے وہ کون سا ماحول ہے جس میں سیرابی ہے اور سیری ہے اور وہ کونسی فضا ہے جہاں تشنگی یا تحیر کے سوا کچھ نہیں اس ناول میں اگر کہیں حسن و شادابی سکون بخش فضا روح و بدن کی پاکیزگی اور مستقبل کی تازہ امید ہے تو وہ اسی بنگلہ میں ہے جس کی مصوری رسوا نے اپنا زور قلم صرف کر دیا ہے رسوا نے اس سے پہلے بھی مکانات اور باغات کی مصوری کی ہے مگر اس میں جذبہ کی یہ فراوانی اور جزئیات کی یہ نزاکت نہیں ناول میں اول سے آخر تک انھوں نے کہیں بھی انگریزوں کے اثرات نہیں دکھائے ہیں اور یہ بات ہمارے مقصد کے لیے بہت اہم ہے بکسر ایک طور سے پلاسی کے محاذ کا آخری مورچہ تھا جس پر شاہ عالم ہار گئے نواب وزیر نے اس شکست کے بعد انگریزوں کے خلاف پھر کبھی تلوار نہ اٹھائی ریاست کے مالیانہ کا ایک معتدبہ حصہ کمپنی بہادر کے نام پر لکھ دیا گیا کچھ عرصہ بعد نواب سعادت علی خاں نے بے خیالی میں ریاست کا آدھا علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز

وہی فضائیں اور مناظر تسکین پہنچاتے ہیں جو نواب سلطان کی شخصیت کے معنوی تاثر سے معمور ہیں ورنہ ہر کہیں تمازت ہے یا تو بگولے ناچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ورنہ جہاں دیکھئے اندھیرا چھایا ہوا ہے ہر فضا حبس دم کئے ہوئے ہے ہر ماحول دل تنگ ہے ہراس پیدا ہوتا ہے پیاس لگتی ہے گھٹن محسوس ہوتی ہے مگر ایک ساعت ایسی نہیں جس کے سایہ میں سکون اور ایک منظر ایسا نہیں جس کے پردوں میں اوس کے موتی نظر آئیں جب اور جہاں کہیں یہ سماں دکھائی دے وہیں ناول کی سمت اور ناول کے روحانی مسافروں کی نجات ہے اور وہیں ناول نگار کی بصیرت اور اچھی قدروں کی جیت ہے یہ فضا نواب سلطان کے یہاں ملتی ہے اور کہیں نہیں اسی لیے امراؤ جان یہ کہنے پر مجبور ہوتی ہیں کہ "ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی" ناول کے مناظر اور اس کی فضاؤں پر جو تبصرہ کیا گیا وہی ناول کے چہروں پر بھی صادق آتا ہے یہ چہرے اگرچہ مختلف مقامات پر نظر آتے ہیں ان کے طبقے، جنس اور حیثیتیں جداگانہ ہیں اور اپنی اپنی کارکردگی کے اعتبار سے بعض اوقات ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں تاہم ان میں سے کسی ایک کے خط و خال میں بھی وہ حسن اور شادابی نہیں ہے جو نواب سلطان کے چھوٹے سے خاندان کی نمایاں خوبی ہے۔ دلاور بوڑھا ہو چکا ہے خانم اور بوا حسینی ادھیڑ ہیں مولوی صاحبان سوائے ایک کے سبھی آخری سیڑھی پر ہیں، نوابین کی صورت بھی دعائے قنوط کی سی ہے گوہر مرزا ابھی ادھیڑ ہوا چاہتا ہے نوچیاں بھی ڈھلی ہوئی دھوپ ہیں غرض ان میں جو بھی ہے جوانی کی تازگی خون کے تموج اور پاکیزگی کے تاثر سے محروم ہے دو تین چہروں میں مردانگی یا نسائیت کی کشش ہے اور ایک دو چہروں میں دل کی سادگی جھلکتی ہے مگر کسی ایک میں بھی بیک وقت توانائی، رعنائی عصمت اور ترنم نہیں ہے۔

تیسری خاص اہم بات یہ ہے کہ ناول میں یوں تو نوابین بھی دکھائی دیتے ہیں اور مولوی بھی اس کے حصار میں دلال بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو گھر پھونک تماشہ دیکھتے ہیں ان اوراق میں رہزن بھی ہیں اور مختار بھی شعر و نغمہ کے پارکھ بھی ہیں اور چاپلوسی کرنے والے مصاحبین بھی، مگر کہیں بھی ہماری نگاہ باعصمت زندگی کے جاں بخش نظارہ سے دوچار نہیں ہوتی جدھر دیکھتے ہیں جہاں جاتے ہیں ہر کہیں جسمانی لذتوں کے دام بچھے ہوئے ہیں۔ ایک نواب سلطان ہیں جو عصمت کو زندگی کی اعلیٰ قدر جانتے اور مانتے ہیں اس معاشرت میں صرف ایک خیابان ہے اور وہ نواب سلطان کا خاندان ہے ناول پڑھتے وقت اور پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں روح و بدن کی رسوائی انسان کا راہ ہے یہی دلیل ہے اور فکر و عمل کا آخری اندازہ ہے۔ طوائفوں سے راہ و رسم، ڈومنیوں کے مجرے، لونڈیوں سے چھیڑ چھاڑ، پیرنیوں اور ہی

یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بے نتیجہ اور بے مراد مر جائیں گے اور ان میں سے بعض بے نتیجہ اور بے مراد مر چکے ہیں صرف نواب سلطان ہمیں مژدہ سناتے ہیں وہ ہم سے مستقبل کا وعدہ کرتے ہیں ہمیں تازہ امید بخشتے خواب دکھاتے ہیں ان کے یہاں کچھ کرنے کا عزم ہے ان کی زندگی میں بھی بھرپور اور جاندار خوشی ہے ان کے لیے نہ زمین سخت ہے اور نہ آسمان دور ہے ان کی نظر میں دونوں لا محدود ہیں پر اسرار ہیں اور نئے امکانات سے لبریز ہیں اور انھیں بصیرت ہمت اور دلیری سے فتح کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہیرو نہیں ہیں البتہ ان میں ہیرو بننے کی صلاحیت ہے یہی ناول کا انجام ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں قاری زوال کی شکست و ریخت اور بے کیفیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور جہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک نیا دور پردۂ افلاک سے طلوع ہو رہا ہے

کار ما با رخ ساقی و لب جام افتاد

تشویش

حسن نعیم

مجھ کو تشویش ہے کچھ روز سے میرے محبوب
تیری حساس طبیعت کو نہ کر دے مجروح
میرے اندازِ تفکر کی یہ پُر خار روش
اور تو سمجھے کہ نہیں تجھ میں وہ پہلی سی کشش

اب بھی جلووں میں ہے تخلیق محبت کی سکت
عارض و لب پہ تبسم کا خرامِ مدہوش
تیری باتوں میں ابھی تک ہے فسوں کا انداز
اب بھی دیتا ہے تخیل کو پیام پرواز

پھر بھی کیوں ہے کہ غمِ عشق کا احساس نہیں؟
جیسے لرزاں ہوں لبوں پر تو خوشی کی کرنیں
جیسے سینہ میں امنگیں تو ہیں لیکن خاموش
پھر بھی احساس مسرت کا نہ ہو ذہن کو ہوش

گن تو سکتا ہوں شبِ ہجر میں تاروں کو مگر
اشک مجبور رہا ؤں غمِ جاناں میں مگر
ذہن آوارہ خیالات سے بھر جاتا ہے
سلسلہ میرے ان اشکوں کا بکھر جاتا ہے!

مجھ کو تشویش ہے کچھ روز سے میرے محبوب
میرے اندازِ تکلم کی یہ بے گانہ روی
تیری حساس طبیعت کو نہ کر دے محزوں
اور تسکین نہ ہو، پھر حسن خود آرا کو کبھی

تاجر اودھ میں پھیل گئے اور ان کی عمارتیں اور ڈیرے تعمیر ہونے لگے رفتہ رفتہ ان کی سازشوں کا جال پھیلتا گیا یہاں تک کہ وزرا کے تقرر اور ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات میں بھی ان کا مشورہ لیا جانے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ دہلی سے نواب وزیر کا جو برائے نام علاقہ تھا وہ بھی جاتا رہا اور اودھ کی پیرانہ سال بیگمات کو انگریزوں کی سیاست اور ان کی طاقت کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ سلطنت آصف الدولہ کے زمانہ میں تو عوام نے کوئی آنچ محسوس نہ کی لیکن جوں جوں موسم بدلتا گیا یہ تیز اور سبک ہوائیں لو کے جھونکوں میں تبدیل ہوتی گئیں مادی اقتدار کے یوں چپکے چپکے مگر تیزی کے ساتھ مٹ جانے کا خواص کے مزاج اور عوام کے ماحول پر جو اثر ہوا وہ خوجی کے کردار خانم کی دکان اور سوز خوانی کے کمال سے ظاہر ہے، مذہب کی ساری توبتیں زنگی اور اس قسم کی دوسری رسموں میں، اعمال کی ساری نزاکتیں ماتم درباداری اور تجبہ خانوں میں، موسیقی کے روحانی کمالات بھیروں اور ہلکی پھلکی ٹھمریوں میں، سیاست کے نت نئے شگوفے حرم کی دیواروں میں اور آزاد زندگی کے بیشمار تقاضے بندھے ٹکے اور بے جان میلوں میں سمٹ کر رہ گئے غدر میں عوام کی دبی ہوئی نفرت ظاہر تو ہوئی مگر اس کی تہ میں کوئی عملی بصیرت اس کے سامنے کوئی روشن منزل اور اس کی حرارت اور قوت کا کوئی مرکز نہ تھا اس لیے جن طاقتوں نے اسے جنم دیا تھا وہی اس کی ہلاکت کا سبب بن گئیں۔ یہ زندگی کا ایک پہلو تھا اس میں وسعت بھی تھی اور قدامت بھی، لیکن اس کی قسمت میں رسوائی نہ تھی اسی کے ساتھ ایک دوسرا پہلو تھا جس کی تہ میں چند زندہ عناصر تھے وہ عصر کے فکر و عمل کی جولانیوں کے ترجمان تھے انھیں خود کو منوانا تھا، اور وہ مان لیے گئے، یہ نئی بصیرت سیاست اور معاشرت کے نئے سانچے اور ان سے مفاہمت کا میلان ہمارے یہاں غدر کے ہنگامہ سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا لیکن وہ فطری حالات کے زیر اثر ظاہر بعد میں ہوا یہی وہ شعور ہے جس کی ترجمانی ناول سے باہر کی دنیا میں حالی اور ناول کی دنیا میں نواب سلطان کرتے ہیں اور اسی لیے وہ ناول میں سمت کا علم رکھتے ہیں۔

بہرحال زوال پذیر معاشرت کے ان مرقعوں میں ہمیں کہیں فطری خوشی نصیب نہیں ہوتی ہمیں ہر جگہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے، کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں ہمیں ذہنی، روحانی اور اخلاقی تسکین حاصل ہوتی ہو، کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا انجام رس رس کے بہنا، گھل گھل کے مرجانا، لذتوں سے چور ہو کر زندگی کے دوسرے کنارے پر پہنچ جانا، خیال کی بے بسی، روح کی تیز مردگی اور دل و دماغ کی بے حسی نہ ہو، ان میں سے بعض کے متعلق ہمیں

وغیرہ میں شاعری کی ہے ان کے بعد بھوشن، پدماکر اور دیو نے کوت (کبت) کو اظہار خیال کے لئے زیادہ پسند کیا ہے۔

پچھلی صدی کے خاتمہ پر جب جدید ہندی کے شاعر نے اس نئی زبان میں جس کی نیو للولال جی اپنی پریم ساگر میں ۱۸۰۳ء میں رکھ چکے تھے شاعری شروع کی تو وہ کچھ دیر کے لئے شش و پنج میں تھا کہ شاعری کے کون سے وزن اس نئی زبان کے لئے اختیار کرے۔ اس کے سامنے دو راستے تھے ٹھیٹھ ہندی کی بحر میں دوہا۔ سویا۔ چوپائی۔ کبت وغیرہ کے علاوہ یا تو وہ سنسکرت کی پرانی بحروں میں اپنے نغموں سے جان ڈالے اور یا اردو شاعری کی عروض کو اختیار کرے۔ سنسکرت کی بحروں میں شاعری کرنے کے صاف یہ معنی تھے کہ زبان کو اس کی بوجھل ترکیبوں سے گرانبار کیا جائے۔ اگر دوہا۔ سویا۔ اور چوپائی ہی پر بس کی جائے تب بھی کام نہیں بنتا تھا مقابلہ برج بھاشا سے تھا جو ان بحروں میں رچ بس گئی تھی۔ اس کے سامنے کھڑی بولی ہندی کا دوہا یا چوپائی بڑی پھیکی اور اجنبی سی لگتی تھی۔ اُردو کا عروض اختیار کرنے میں ایک بڑی آسانی یہ تھی کہ کھڑی بولی (اردو کی شکل میں) اس عروض پر ڈھل چکی تھی۔ ھری آودھ اور رہندی کے دوسرے ابتدائی عہد کے شاعروں نے کچھ عرصے تک اُردو عروض کو اپنایا بھی لیکن رفتہ رفتہ رام چندر شکل اور دوسرے بڑے نقادوں کا یہ نقطۂ نظر ہوتا گیا کہ ہمیں ایک بدیسی عروض سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ "وہ ہندی شاعری کا اپنا نکالا ہوا راستہ نہیں۔" (تاریخ ادب ہندی ص۶۴۴) ان کے خیال میں ہندی کو اپنی ٹھیٹھ بحروں کے علاوہ سنسکرت کی ان بحروں کو بھی کام میں لانا چاہیئے جو آسانی سے رواج پا سکتی ہیں اور جن کی وجہ سے ہندی شاعری کی اصل ہیئت پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

بدیسی اثر علوم ساری دنیا کی میراث ہوتے ہیں۔ ادب قوموں کی ملکیت ہوتا ہے۔ شعر بالخصوص بڑی دیر میں بدیسی اثرات قبول کرتا ہے۔ دراصل ہر ملک کی شاعری کے اوزان کا وہاں کی سنگیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور سنگیت قوم کا مزاج ہے وہ اسی کے ساتھ بدل سکتا ہے۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ہندوستان کے علم عروض نے بدیسی اثرات کو بالکل قبول

مسعود حسین خاں

ہندی پنگل (عروض) کی مبادیات

تاریخ جس طرح زبان پہلے بنتی ہے اور اس کے اصول بعد کو مرتب کیے جاتے ہیں، شعر بھی علم عروض سے پہلے وجود میں آتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں ویدوں کے الہامی نغموں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلی بار علم عروض کے اصول مدون کیے گئے۔ ویدوں کے مطالعہ کے لیے جن چھ شاستروں کا مطالعہ ضروری ہے ان میں چھند شاستر (کتاب العروض) بھی شامل ہے لیکن ویدوں میں بحروں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے ان کے عروضی قاعدے بھی سیدھے سادے اور مختصر تھے۔ تمام کلاسیکی زبانوں (مثلاً یونانی، اطالوی) کی طرح ان میں بھی صرف حروف کی تعداد گن لی جاتی تھی۔

لیکن [illegible] ق م میں ادبی سنسکرت کی تشکیل کے ساتھ ساتھ فنون میں نزاکتیں اور علوم میں گہرائیاں بڑھنے لگیں۔ شعر عام مقبول ہو گیا اور اس میں وسعت آ گئی تو اس کے اصول بھی زیادہ جامع و چابکدستی سے تیار کیے گئے۔ یہ زبان و ادب دونوں کے ارتقا کا زمانہ تھا۔ پانینی نے ۳۰۰ ق م میں سنسکرت کی قواعد لکھ ایک طرح سے اس کی شکل ہمیشہ کے لیے متعین کر دی۔ پنگل رشی نے اسی زمانہ میں اپنی "چھند شاستر" (کتاب العروض) تصنیف کر کے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہندوستان میں علم عروض کو پہلے "پنگل شاستر" اور بعد کو صرف "پنگل" کہنے لگے۔ آج ہندی پنگل سے ہندی کا علم عروض ہی مراد ہوتا ہے۔

سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زبانوں میں الٹ پھیر ہوتا رہا، شعر و ادب کے سانچے بھی بدلتے رہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ علم عروض جامد رہتا۔ اس میں بھی توسیع ہوتی رہی، پرانے اوزان متروک ہوتے رہے اور نئی بحریں بنتی رہیں۔ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں سنسکرت کے بیشتر اوزان ترک کر دیے گئے۔ پھر بھی اس علم کی تمام اصطلاحات اور بعض بحریں بھی سنسکرت ہی کی رکھی گئیں۔ قدیم ہندی شاعر (جائسی، تلسی، سور، کبیر وغیرہ) نے زیادہ تر دوہا، چوپائی اور سوریا۔

مسعود حسین خان

اصل میں ایک چھوٹے حرف علت अ (جو اُردو میں (زبر) ہے) کے ساتھ ہی ادا کیے جا سکتے ہیں۔
حروف علت کا تجزیہ کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ ان میں بعض آوازیں بڑی (گرو) ہیں اور بعض چھوٹی (لگھ)
مثلاً ـَـ = अ) - (ـِـ = इ) - (ـُـ = उ) یہ سب چھوٹی آوازیں ہیں۔
اس کے برخلاف (ا = आ) - (ی = ई) - (و = ऊ) - (ے = ए) - (اَے = ऐ) - (او = औ)
بڑی آوازیں ہیں۔

ان چھوٹے بڑے حروف علت میں کسی کو بھی اگر ایک حرف صحیح کے ساتھ علامت (یا ماترا) بنا کر ملا دیا جائے تو حرف صحیح اس کی نسبت سے بڑا یا چھوٹا کہلائے گا۔ مثلاً

چھوٹی آوازیں یا لگھو ۔ مَ - مِ - مُ
بڑی آوازیں یا گرو ۔ ما - مے - مُو - مَو وغیرہ

اس اصول پر آپ اپنی زبان کے ہر لفظ کی ماترائیں معلوم کر سکتے ہیں چھوٹی آواز یا لگھو کو ایک نمبر دیا جاتا ہے۔ اور بڑی آواز یا گرو کو دو نمبر۔ لگھ کی علامت ایک چھوٹی لکیر یعنی (ا) ہے اور گرو کی ٹیڑھی لکیر یعنی (S) ہے۔

چنانچہ اگر آپ کو میر کے اس مصرع کی چھوٹی بڑی آوازیں اور پھر ان کی مجموعی تعداد کو معلوم کرنا ہے تو اس کے لئے یہ صورت کرنی ہوگی۔

ع سارے عالم کے ستم بلا لایا

اس کے لگھ اور گرو اس طرح کئے جائیں

S	S	S	ا	ا	S		ا	ا	S	S	S
سا	رے	عا	لَ	مَ	کے	س	ر	ب	لا	لا	یا

ف اُردو رسم الخط میں یہ بڑی خامی ہے کہ اس میں چھوٹے حروف علت کی کوئی شکل نہیں ملتی اور انھیں زیر، زبر، پیش سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس لئے چھوٹے حروف علت کا فرق جاننے کے لئے ہندی رسم الخط میں انھیں دیکھئے۔

نہیں کیا۔ جیکوبی نے ایک جگہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندی کا "دوہا" اصل میں ایک یونانی بحر "ڈوئی" کا دوسرا روپ ہے لیکن اس کا تاریخی ثبوت ابتک نہیں مل سکا ہے۔ ممکن ہے کہ آوازوں کی تعداد اور ترتیب کے اعتبار سے یہ دونوں بحریں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں لیکن اس قسم کی مماثلت تو ہندی اور اردو عروض کی اکثر بحروں میں بھی مل جائے گی جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

بعض مسلمان صوفی شعراء نے ہندی شاعری میں فارسی عروض کے اوزان بھی استعمال کئے ہیں۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا طرز تک فارسی شاعری کا چربہ ہے۔ لیکن یہ انداز بیان کبھی بھی تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ رحیم خانخاناں اور عالم وغیرہ نے اسی لئے ہندی پنگل میں شاعری کی ہے۔ حالانکہ رحیم فارسی عروض کے بھی ماہر تھے۔

اردو عروض کی طرح ہندی پنگل کے بھی کڑے اصول اور ضابطے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ آجکل انگریزی ادب کے زیر اثر ہندی کا شاعر ان کے خلاف بغاوت بھی کرنے لگا ہے اور آزاد نظم میں من مانے وزن استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ اس نئے رجحان کے بڑے علمبردار نرالا جی ہیں جنھوں نے حال میں ہندی اصناف سخن میں غزل کا بھی اضافہ کیا ہے۔

بحروں کی قسمیں: ہندی عروض میں اوزان یا تو حروف کی گنتی سے بنتے ہیں یا آوازوں کی گنتی سے۔ ان میں ہر آواز ماترا کہلائے گی۔ ماترا دراصل وقت کا وہ وقفہ ہے جو ایک انسان کسی آواز کے نکالنے میں لگاتا ہے۔ مثلاً مار اور مر۔ "م" کے ساتھ حرف علت "ا" کے ملا دینے سے یہاں "م" کی آواز بڑی ہو گئی۔ اسے ہندی میں "گرو" (یا بڑی آواز) کہتے ہیں۔ اس کے برعکس "مر" میں "م" کی آواز پر صرف زبر ہے جو چھوٹے حرف علت سے (अ) کی علامت ہے۔ اس لئے یہاں "م" کی آواز چھوٹی رہی۔ اس چھوٹی آواز کو "لگھ" کہا جاتا ہے۔

حروف کی دو قسمیں ہیں (۱) حروف صحیح اور (۲) حروف علت۔ حروف صحیح بذات خود کوئی آواز نہیں رکھتے اس لئے ان کے ساتھ کسی نہ کسی حرف علت کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ب۔ ت۔ م۔

ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ ہم نے آوازوں کو چند خاص شکلوں میں متعین کر لیا ہے اور انھیں کے ہیر پھیر سے مختلف بحریں بناتے ہیں۔ ان خاص شکلوں کو ہم ارکان عشرہ کہتے ہیں۔ ان ارکان کی ماترک گنتی حسب ذیل ہے۔

فعولن	=	۵ ماترائیں	ISII
فاعلن	=	۵ ماترائیں	SIII
مفاعیلن	=	۷ //	ISSII
فاعلاتن	=	۷ //	SISII
فاع لاتن	=	۸ //	SSSII
مستفعلن	=	۷ //	IIIIII
مس تفع لن	=	۸ //	IIIISII
مفعولات	=	۷ //	IISSI
متفاعلن	=	۷ //	IISIII
مفاعلتن	=	۷ //	ISIIII

ان ارکان کی شکلوں میں ہم نے زحافات قایم کئے ہیں اور توڑ مروڑ کی ہے۔ لیکن ہمارے عروضیوں کی کوشش یہی رہی کہ زحافات قایم کرنے کے بعد بھی ارکان عشرہ کے دائرہ سے بحر کا کوئی نہ کوئی ربط ضرور قایم کیا جائے۔ اس کے لئے بڑی محنت سے عروضی دائرے اور چکر تیار کئے گئے۔ زبانی یاد رکھنے کے لئے مختصر فارمولے بنائے گئے۔ اس طرح یہ ضرور ہوا کہ ارکان عشرہ کے ذریعہ تمام بحروں کا ایک دوسرے سے ربط رہا اور طالب علم کو ان پر شعور حاصل کرنے میں حافظہ کی مدد سے آسانی ہو جاتی تھی لیکن اس زمانے میں حافظہ کی اس مشق کی چنداں ضرورت نہیں۔ مختلف بحروں کے مختلف نام رکھ کر ہم ان کے چارٹ تیار کر سکتے ہیں وقت ضرورت جن کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

کل ماترائیں ہوئیں ۲ + ۲ + ۲ + ۲ + ۱ + ۱ + ۲ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۲ + ۲ + ۲ + ۲ = ۱۹

اس طرح ہر مصرع کا بند بند کھول کھول کے اسے گرو اور لگھ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
مذکورہ بالا مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گرو کو دو ماترا اور "لگھ" کو ایک ماترا مان کر ہم کسی بحر کی ماتراؤں کی مجموعی تعداد معلوم کر سکتے ہیں۔

مرکب حروف میں گرو اور لگھ آوازوں کے پہچان کی صورت حسب ذیل ہوتی ہے۔

(۱) جب کسی حرف کے آگے کا حرف مرکب ہو تو پہلا حرف گرو (بڑی آواز) مانا جائے گا مثلاً

قَدْر = قَدْ + ر = ۳ ماترائیں

یا نکما = ن + کم + ما = ۵ ماترائیں

یا پچھم = پچ + چھ + م = ۵ ماترائیں

ان الفاظ میں ق ۔ ک یا پ کو گرو ماننے کی خاص وجہ یہ ہے کہ تلفظ کرتے وقت ہم ان الفاظ پر غیر معمولی زور دے کر آواز کو بڑا کر دیتے ہیں اور اس طرح آواز ایک گرو کے برابر ہو جاتی ہے

چھندوں (بحروں) کی قسمیں | (۱) ماترک چھند

یوں تو ہر آواز ایک وزن ہے اور اس لئے سب سے چھوٹی بحر ایک حرفی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندی عروض میں سات ماتراؤں تک کی بحریں استعمال نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہندی کی سب سے چھوٹی بحر آٹھ ماترا کی "چھند" ہے۔ مثال

پربھو ہے کرپال   کرادے نہال   ۸ ماترائیں

پنگل کی طویل بحریں ۳۲ ماتراؤں تک پہونچتی ہیں۔ ۳۲ ماتراؤں کا سویا ہندی میں عام رہا ہے۔

ع۔   پری تمھارے پد پنکج پر   یہ میرا تن تو ہے وارن   ۳۲ ماترائیں

(اے محبوب تمھارے پیروں کے کنول پر یہ میرا تن واری ہو)

ماترک بحروں کے اصول پر اگر ہم اردو عروض کو پرکھیں تو معلوم ہوگا کہ اردو کی تمام بحریں ماترک

طرز تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سولہ آواز کا رکن اور دوسرا بارہ آواز کا۔ بیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں سانس ٹوٹے وہاں پر لفظ بھی مکمل ادا ہو جائے۔ مثلاً کسی شعر میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ نکتے کو بیت کے ذریعے سے نکم۔ ے کر دیا جائے۔ جیسا کہ اردو تقطیع کے وقت ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال دوہے سے دی جا سکتی ہے جس میں ۴۸ ماترائیں ہوتی ہیں اور تیرھویں پر بیت آتی ہے۔

۱۳ ماترائیں　　　　۱۱ ماترائیں

چلتی چاکی دیکھ کر / دیا کبیرا روئے

دو پاٹن کے بیچ آ / ثابت رہا نہ کوئے

اس طرح دوہے کے دو رکن ہوئے۔ ایک ۱۳ ماتراؤں کا اور دوسرا گیارہ کا۔

(اردو عروض میں ۸ ماتراؤں سے بڑا رکن نہیں ہوتا) ان تیرہ اور گیارہ ماتراؤں کے ٹکڑوں میں شاعر چھوٹی بڑی آوازوں کو من مانی ترتیب دے سکتا ہے۔ لیکن اردو عروض میں ایسا نہیں ہے کیونکہ وہاں رکن کا ہر وتد اور سبب ناپ تول کر لائے جاتے ہیں۔ ان پابندیوں کی بنا پر اور اندرونی آہنگ کے اعتبار سے اردو عروض پنگل سے زیادہ بلند ہو جاتا ہے البتہ اس میں سم اور تال کے لئے گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ "چلتی چاکی دیکھ کر" اس ٹکڑے کو گانے والا آواز کے جتنے اتار چڑھاؤ کے ساتھ گا سکتا ہے ـــــ "کبھی دیتا" (مفاعیلن) "نہیں ہیں کچھ" (مفاعیلن) "لکر بھی در" (مفاعیلن) "میں آزادی" (مفاعیلن) (کبھی دیتا نہیں ہیں بھول کر بھی درس آزادی) کے چھوٹے چھوٹے نپے تلے ٹکڑوں میں اس کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔

(۲) بحر کو کسنے کا ایک دوسرا اصول ہندی عروضیوں نے "گت" کا نکالا ہے۔ گت دراصل بحر کی چال یا اس کا بہاؤ ہے۔ اس بہاؤ کے اصول متعین نہیں کئے جا سکے بلکہ اس کا انحصار ذوقِ سلیم پر ہے۔

میرے خیال میں گت کی مبہم پابندی کے تحت اردو عروض کے ارکان کی جھلک مل جاتی ہے مثلاً ہندی کا ایک مصرع ہے۔

مسعود حسین خاں

پنگل کی ماترک بحریں اس لحاظ سے یقیناً اردو سے کمتر درجہ کی ہیں کہ ان کے اوزان کی ترتیب میں کسی حد تک وہ کڑی پابندی نہیں جو اردو کی بحروں میں مل جائے گی۔ یعنی ماترک بحروں میں الفوں نے اوزان کو ارکان میں مرتب نہ کرکے شاعر کو کسی حد تک آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اس کا فرق اس طرح واضح ہوگا کہ اردو اور ہندی دونوں کی ۲۸، ۲۸ ماتراؤں کی دو بحروں کو لے لیجئے۔ مثلاً

اردو کی بحر ہزج مثمن سالم :- مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن = ۲۸ ماترائیں

مثال :-

کبھی دیتا نہیں میں بھول کر بھی درس آزادی
مرے لیکچر ہیں لمر دوی مرے خطبے ہیں شادی

ہندی کی بحر للت پد :- ۲۸ ماترائیں - سولھویں پر وقفہ

مثال :-

لجاتی لالی پھیلی تھی مونہہ پر تنک چڑھی تھیں
گری وانچی تھی پر آنکھیں نرپ پاد بڑھی تھیں

دونوں شعروں کو ایک ساتھ پڑھئے اور دیکھئے کہ ماتراؤں کے یکساں ہوتے ہوئے بھی وزن مختلف ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اردو بحر مفاعیلن کے چار رکنوں میں مساوی طور پر تقسیم ہے جبکہ ہندی کی بحر میں اس قسم کی تقسیم کا کوئی اصول نہیں ملتا۔ ہندی کی بحر کو صرف اس وقفہ سے پابند کیا گیا ہے جس کا سولھویں ماترا کے اختتام پر آنا ضروری ہے۔ شاید اسی عروضی آزادی کی بنا پر ہندی کی ماترک بحریں زیادہ گائی جاتی ہیں۔ اردو بحروں کی ارکانی جکڑبندھن آواز کی لہروں کے لئے وہ آزادی نہیا نہیں کرتی جو ہندی کی ڈھیلی ڈھالی بحروں میں ملتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندی پنگل کی بحریں محض غیر مرتب چھوٹی بڑی آوازوں کا ڈھیر ہے۔ ہندی عروضیوں نے دو طریقوں سے اپنی ماترک بحروں کو کسنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) یت (وقفہ) کا التزام :- ہندی کی تمام طویل بحروں میں یت یا وقفہ کا التزام رکھا گیا ہے۔ اس طرح بحر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا للت پد کے مصرع کو پھر دیکھئے۔ کس طرح سولھویں ماترا کے بعد ایک وقفہ (یت) آنا ضروری ہے۔ اس طرح بحر کم از کم دو رکنوں میں تو

ان گنوں کے نام یاد رکھنے کے لئے ان کا یہ مجموعی نام یاد رکھئے۔

"من بھئے جستا" (م + ن + بھ + ی + ج + ر + س + ت)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بحر بنانے کے لئے ان گنوں کی ترتیب کس طرح ہو۔ یہاں پھر سنسکرت زبان کے عروضیوں نے بعض سائنٹفک حقیقتوں کو اپنے توہمات کے پردوں میں چھپانا چاہا ہے۔ ان کے خیال [illegible] گن کا ایک دیوتا ہے۔ اوپر دئے ہوئے آٹھ گنوں میں سے چار کو انھوں نے شبھ (مبارک [illegible]) اور چار اشبھ (نامبارک)۔ م گن۔ ن گن۔ بھ گن اور ی گن مبارک خیال کئے جاتے ہیں [illegible] ج گن۔ ر گن۔ س گن اور ت گن نامبارک۔ بس تو مصرع نامبارک گنوں سے نہیں شروع [illegible] نا چاہیئے۔ یہ شعر بیا ختم ہوگا۔ اس مبارک اور نامبارک کے پردہ میں اگر سائنٹفک حقیقت [illegible] تو بس اتنی ہے کہ بعض "گن" میں حروف اس طرح مرکب ہوتے ہیں کہ وہ مصرع کے شروع میں لائے جائیں تو اس کی موزونیت میں فرق پڑتا ہے۔ اور اسی لئے اکثر اوقات شاعر ان پابندیوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔

گنوں کی [illegible] بعض حروف کو بھی ہندی عروضیوں نے نامبارک کہہ کر شروع میں لانا روا نہیں رکھا ہے۔ حروف علت سب کے سب نامبارک خیال کئے جاتے ہیں۔ حروف صحیح میں ک۔ کھ۔ گ۔ گھ۔ پ [illegible] ج۔ ت۔ د۔ دھ۔ ن۔ ی۔ ش۔ س۔ اچھے مانے گئے ہیں اور باقی برے ان میں خاص طور [illegible] ۔ ر۔ بھ تو بالکل گئے گزرے مانے جاتے ہیں اور اس لئے ان سے کوئی [illegible] چھند شروع نہیں ہونا چاہیئے۔

تک (قافیہ) | [illegible] پنگل میں قافیہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ جب مصرعوں کے آخر میں ایک ہی [illegible] علت یا حرف صحیح آئے تو اسے تک (قافیہ) کہتے ہیں۔ اچھا تک وہ ہوگا جس کے آخری حرف صحیح سے پہلے کا حرف علت بھی یکساں ہو۔ ہندی میں شروع سے "تک والی" شاعری ہوتی آئی ہے۔ بے [illegible] بات اسی لئے محاورہ بن گئی ہے۔ تک کی چاشنی ہندی شاعری کے منہ والیسی لگ گئی ہے کہ بعض عروضیوں نے تو اسے اس کا ضروری جزو سمجھا ہے لیکن سنسکرت میں کچھ

بھو میں۔ری سشرد کی کم نی تا کتی

(بھو = زمین۔ سشرد = سردی کا موسم۔ کم نی تا = حسن)

کو اگر یوں پڑھا جائے۔ ع بھو میں اشرد کی کم نی تا رہی تھی

تو اس چھند (بحر) کی گت بگڑ جائے گی۔ اس طرح گت کے مبہم تصور سے ہندی کی بحروں کا آہنگ درست کر لیا جاتا ہے۔

(۲) ورنک چھند (حرفی بحریں)

ہندی میں بحروں کی ایک دوسری قسم ورنک چھند ہیں۔ ان بحروں کا تعلق ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں سے اتنا گہرا نہیں جتنا کہ ماترک بحروں (دوہا۔ سورٹھا۔ چوپائی وغیرہ) کا ہے۔ ان میں آوازوں کو گننے کا طریقہ بھی مختلف ہے۔ یہاں آوازوں کو "گن" (गण) سے ناپا جاتا ہے۔ "گن" لگھو گرو آوازوں کی سہ حرفی ترکیب کا نام ہے اور اردو عروض کے "رکن" سے ملتا جلتا ہے

جس طرح اردو کا عروض آٹھ ارکان کے ہیر پھیر سے بنتا ہے ہندی کی ورنک بحریں بھی آٹھ گنوں کی نشستوں سے بنتی ہیں۔ ذیل میں گنوں کے نام اور ان میں لگھو گرو آوازوں کی ترتیب دکھائی ہے

گن کا نام	پہچان		مثال
(۱) م گن	تینوں حرف گرو	SSS	چوراہا
(۲) ن گن	تینوں حرف لگھو	III	ہرن
(۳) بھ گن	پہلا حرف گرو	IIS	ساگر
(۴) ی گن	پہلا حرف لگھو	SSI	نہ مانا
(۵) ج گن	بیچ کا حرف گرو	ISI	سدھار
(۶) ر گن	بیچ کا حرف لگھو	SIS	سادھنا
(۷) س گن	آخری حرف گرو	SII	بھرتا
(۸) ت گن	آخری حرف لگھو	ISS	آرام

ان کے علاوہ ماتراؤں اور حروف کی تعداد کے لحاظ سے بھی چھندوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔
ماترک چھندوں میں ۳۲ ماتراؤں تک والی بحر کو سادھارن (معمولی) چھند کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ۲۸ حروف والی ورنک چھندوں کو بھی سادھارن کہا جاتا ہے۔ ۳۲ ماتراؤں سے اوپر کی ماترک بحریں اور ۲۸ حروف سے اوپر کی ورنک بحریں ونڈک کہلاتی ہیں۔
چھندوں کی قسموں کے لئے ذیل کا نقشہ دیکھئے۔

چھند

ماترک (لگھو گرو ماتراؤں کی گنتی) — ماتراؤں کی ترتیب گنوں میں اور حروف کی گنتی — ورنک

وشم — اردھ سم — سم — وشم — اردھ سم — سم

ڈنڈک (۳۲ ماتراؤں سے اوپر کے) — سادھارن (۳۲ ماتراؤں تک) — ڈنڈک (۲۶ حروف سے اوپر کے) — سادھارن (۲۶ حروف تک)

(۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

شجاع احمد زیبا

غزل

طوفاں میں بہ رہے ہیں یہ تنکے تو کیا ہوا
خودکشتیٔ حیات سلامت نہیں رہی

اب تک غم فراق بدستور ہے مگر
اب آنسوؤں سے رونے کی عادت نہیں رہی

شاخیں بھی آشیاں کو سہارا نہ دے سکیں
اب جورِ آسماں کی شکایت نہیں رہی

دیر و حرم کو خونِ بشر اب بھی چاہیئے
گو شیخ و برہمن کی سیادت نہیں رہی

بے تک کی شاعری بھی ملتی ہے۔ اور ہندی میں بھی برج لال اور ہری اودھ وغیرہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

تک کی تین قسمیں مانی گئی ہیں۔

(۱) اُتّم (سب سے اعلیٰ) (۲) مدّھم (درمیانی درجے کا) اور (۳) ادھم (پچھلے درجہ کا)

(۱) اگر مصرع کے آخر میں دو گرو (SS) آئیں تو وہاں پانچ ماترائیں ایک سی آواز کی ہونے پر تک اُتّم ہوگا۔

(۲) اسی طرح چار ماترائیں یکساں طور پر آئیں تو مدھم ہوگا۔

(۳) اگر اس سے کم ہوں تو ادھم

(ب) اسی طرح مصرع کے آخر میں گرو (IS) یا لگھو گرو (SI) کی ترتیب ہو اور پانچ ماترائیں یکساں ہو جائیں تو تک اُتّم ہوگا۔ چار ہوں گی تو مدھیم اور تین کا ادھم۔

(ج) اگر مصرع کے آخر میں دو لگھو (II) آئیں تو چار ماتراؤں کی تکرار ہونے پر تک اتم ہوگا۔ دو پر مدھیم اور ایک پر ادھم[1]

(۳) چھندوں کی تیسری قسم

چھندوں کی تیسری قسم یہ ہے کہ اگر کسی طرح کے چاروں مصرعوں میں ماترائیں اور حرف یکساں ہوں تو اسے سم کہتے ہیں۔

جس بحر میں پہلے اور تیسرے اور دوسرے اور چوتھے چرنوں (مصرعوں) میں ماترائیں اور حروف یکساں طور پر آ جائیں تو انھیں اَردھ سم (اَردھ = آدھا) کہتے ہیں۔ اور اگر چاروں مصرعوں کی ماترائیں اور حروف کی تعداد مختلف ہو تو اسے "وِشم" کہتے ہیں۔

---

[1] دیکھئے اُردو عروض میں قافیہ کا بیان۔ جو کام وہاں حروف کی تکرار اور حرکات وغیرہ سے لیا گیا، یہاں گرو لگھو اور ماتراؤں کی یکسانیت سے لیا گیا ہے۔

خاک کی ٹوکری راہ میں ڈال دی تھی۔ میں سنبھلا آگے موڑ پر کارپوریشن کا گیس نہایت مری سی روشنی سے لوگوں کو موڑ کا اشارہ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رات کے گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی جھکی آرہی تھی اور یہ بھی سوجانا چاہتا تھا۔ لیمپ سے گذر کر میں آگے جا رہا تھا میرا سایہ مجھ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے سوچا۔ جس طرح روشن زمانہ میں سایہ ساتھ نہیں چھوڑتا یہ عورت ذات بھی اسی طرح مرد کے پیچھے لگی ہوتی ہے تاریکی کے عہد میں یہ بھی ساتھ نہیں دیتی۔ مرد بیچارہ مرد اس کی زندگی کی ذمہ داری لیتا ہے اس کے لیے مرتا ہے اور اسی کے لیے جیتا ہے۔ خون پسینہ ایک کرتا ہے صبح سے شام تک کارخانوں میں دفتروں میں گاڑیوں میں وطن سے دور عزیزوں کی نظر سے پرے زمین پر زمین کے نیچے پانی میں ہوا میں نہ معلوم کہاں کہاں جھک مارتا ہے کس لیے؟ صرف عورت ذات کے لیے اس کو خوش کرنے کے لیے اس کو آرام پہنچانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے لیکن اس کی محنتوں کا جواب کیا ملتا ہے؟ مرد ظالم ہے۔ عورتوں کی حق تلفی کرتا ہے۔ اسے قید میں رکھتا ہے اس کی آزادی کا دشمن ہے یہ غاصب ہے ظالم ہے درندہ ہے بے انصاف ہے اور نہ معلوم کیا کیا؟ میں چھوٹی چھوٹی گلیوں کے موڑ سے خود بخود گذرتا جا رہا تھا دماغ کہیں اور تھا لیکن نگاہیں قدم کی رہبری کر رہی تھیں۔ "دیکھو" انسانی تہذیب کا خون کس قدر گندہ ہو رہا ہے؟ یہ میرا اپنا رنگ نہیں ہے یہ وہ رنگ ہے جو ایک دو رات نہیں بلکہ زندگی کی ساری راتوں کو انہی گندگیوں کی سڑاند پیدا کرنے والے مشاہدوں میں گذارنے سے میری روح میں جذب ہو گیا ہے کوٹھریوں کے سامنے سیڑھیوں پر ان کے مکینوں کی زندہ لاشیں پڑی ہوئی ہیں جسم زندہ ہے مگر روح رخصت ہو چکی ہے احساس مر چکا ہے آگے بائیں جانب کچھ کھڑکی بھی ہیں ایک طرف ایک کو حرکت ہوئی ایک مرد کے گذرنے کی آہٹ محسوس ہوئی اور الاپ اٹھی "انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا" میں تیزی سے جسم کو سمیٹتا ہوا آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا دوسری نے راگ ملایا "رم جھم برسے بادروا پیا گھر آجا" میرا خون غصہ سے کھول رہا تھا۔ یہ آزادی چاہتی ہیں حق طلب کرتی ہیں۔ ذلیل کہیں کی بے حیا اور دوسری نیک بخت کو دیکھئے ان کے لیے وقت بے وقت ہر وقت بادل بھی رم جھم برسنے لگتا ہے اور ساجن کی یاد بھی ان کو کسی بھٹکے ہوئے مسافر ہی کو دیکھ کر آتی ہے کمینی ڈائن کہیں کی نہ معلوم کتنے معصوم اور شریف مردوں کی زندگی کے دق کے جراثیم کی طرح

افسانے

ایک شام

اظہار الحق ملک

جنگ سے قبل کلکتہ میں بالاخانے بہت تھے، ہر درجہ اور ہر قیمت کے [illegible] ابتدائے جنگ میں ہی حکومت نے تمام بالاخانوں کو خالی کرا دیا اور ان بام و در کی آرائش کو اپنی دانست میں سرے سے ہی اجاڑ پھینکا۔ لیکن مرض مہلک بھی کبھی مستقل اور مکمل طور پر دور ہوا ہے۔ کلکتہ شہر کے [illegible] ذمہ داروں نے شہر کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا تھا لوگ انھیں بے وفا سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں وہ تو ایسا نہیں سمجھتیں انھوں نے اس مقدس حلف کے احترام کی خاطر سب تکلیفیں برداشت کرنے کی ٹھانی اور آخر میں اُن ہی گلیوں کو "پناہ گھر" بنایا۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" ایجاد تو نہیں مگر تحقیق یہاں بھی کام کر ہی گئی۔ امریکہ اور برطانیہ تحقیق و تفتیش کے میدان میں ہر جگہ بہت آگے ہیں ان کے باشندوں نے یہاں آکر اپنی خصوصیات نہیں کھوئیں۔ فطرت کے تقاضوں کے تحت یہاں بھی ان کے سپاہیوں نے تلاش شروع کی اور ان تنگ و تاریک گلیوں کا پتہ لگا ہی لیا اور پھر یہی گلیاں کاروبار میں اپنے پہلے بازار سے زیادہ سرگرم ہو گئیں ٹکے سیر بکنے والی چیزیں امریکہ کی دولت پر سونے کی قیمت بکنے لگیں۔ ہندوستانی تو ہندوستانی انگریز بھی اس مارکٹ میں امریکنوں کے مقابلے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے مگر برا ہو ان نازیوں اور فسطائیوں کا کہ یہ اتنی جلد گھٹنے ٹیک گئے اور جنگ ختم ہو گئی سورج ڈوب گیا اور رات کی حکومت شروع ہو گئی [illegible] نے آہستہ آہستہ کالے کے لیے جگہ چھوڑ دی اور اونچے مونڈھے والے فراک اور اسی حد تک اونچی ایڑی والے جوتوں کی جگہ ساری اور چپل نے لے لی اور ایک بار پھر حالات پرانے جیسے ہونے لگے باوجود اس کے کہ گلیاں تاریک تھیں میں تیز تیز قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا میں سوچ رہا تھا۔ انسان کی تہذیب روشن کا بدنما داغ یہی جنس نحیف ہے۔ اگر اس کو اس کی فکر کرنی نہیں ہوتی تو وہ دنیا میں کیا کیا نہ کر سکتا تھا اس جنس کا وجود ہی مرد کی راہ ترقی میں ایک سنگِ گراں ہے تیز سے تیز رفتار ترقی کو اس کی ایک جھلک کتنی آسانی سے ختم کر دیتی ہے۔ اسی سنگ راہ ...... "اور میں واقعی [illegible] کرتے کرتے بچا کسی نے

سخت نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ ان کمبختوں نے آزادی اور حقوق کے نام پر کیا کیا ظلم نہیں کئے ہیں ان کی تو ان کی، ان کی تصویروں کی بھی پرستش کی جائے یہی ان کی عصمت، یہی حیا اور یہی احساس آبرو ہے اور ان بھولے بھالے مردوں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ ان پر مرے چلے جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر یہ آزادی چاہتی ہیں راستہ دے دو حقوق طلب کرتی ہیں پیش کر دو، برابری کا دعویٰ کرتی ہیں کرنے دو مرنے دو، جہنم میں جانے دو، تم ان کے لیے کیوں جان دیتے ہو؟ نہیں مرد انصاف پسند ہے سمجھدار ہے لیکن رحم دل ہے اور محبت والا دل بھی رکھتا ہے، وفا بھی جانتا ہے وہ اپنے اخلاق سے کیسے بے پروائی برت سکتا ہے؟ لیکن ایسا بھی کیا اخلاق جو تمہیں ان کا غلام بنا دے، ان کا محتاج کر دے ان کے رحم و کرم پر تم کو چھوڑ دے۔ نہیں! تم کو ان کے ماتحت نہیں ہونا چاہیئے یہ ذلیل ہیں، اور ناقص العقل ہیں، نہیں مجھیں تو ڈالو ان کو جہنم میں۔ میں بہو بازار کی سڑک پار کر رہا تھا۔ آج میرا جذبہ ان کے خلاف زبردست طور پر بھڑکا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے ایک گھنٹے کی بھی خدائی مل جائے تو میں اس صنف کو ہی ہمیشہ کے لیے نیست نابود کر دوں انسان کو انسان بن کر دنیا میں رہنا سکھا دوں، عورت کے نام کا وجود ہی ابد کے لیے ختم کر دوں، اس جڑ کو ہمیشہ ہی کے لیے اکھیڑ پھینکوں جو ہماری زندگی کو ساس بہو، دیور بھاوج اور میاں بیوی کے آئے دن کے جھگڑے سے پاک کر دے۔

بہو اسٹریٹ کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں صرف ایک دکان کرسیوں کا بید بننے والے کی کھلی تھی۔ دوکان کے باہر سڑک کے کنارے ایک نوجوان مزدور بیدوں کو آگ کا تاؤ دکھا کر سیدھا کرنے کی کوشش میں منہمک تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی یا تو سو چکے تھے یا اس کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ نوجوان دھیمے سروں میں کچھ گنگناتا ہوا بیدوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی صورت کہہ رہی تھی کہ اس نے زندگی کی بہاریں ابھی زیادہ نہیں دیکھی ہیں مگر اسی امید میں کسی امید موہوم کا فریب خوردہ ہے۔ انتھک محنتیں اسی امید کے سہارے قائم رکھے ہے شاید اس کے لیے رات بھی دن ہے یا رات آرام کے لیے نہیں بنی پتہ نہیں کون سی امید اسے کشاں کشاں اس طرف لیے جا رہی تھی۔ یعنی یہ بھی مظلوم ہوگا۔ اس پر بھی اختیارات کسی بنت حوا کے ہوں گے اس عمر میں اور یہ حال؟

تباہ کیا ہوگا اور ابھی تک لرادوں میں کوئی کمی نہیں محسوس کرتیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ صرف کمزور طبع ضعیف دماغ اور ناقص العقل ہیں؟ یہ وہ عذاب ہے جو نہ معلوم حضرت آدم کو کس گناہ کی پاداش میں ملا تھا" میں گلی سے مڑا لیکن کسی چیز سے ٹکرا گیا "معاف کیجئے گا میری زبان سے بے ساختہ نکلا اور سمٹا گیا لیکن اس کے جواب میں کئی قہقہے بلند ہوئے اور میرے جی میں آیا کہ یا تو ٹکرانے والی کا گلا دبا دوں یا بے تحاشا وہاں سے بھاگ جاؤں۔ قہقہے مسلسل بلند ہو رہے تھے اور میں تیز تیز بھاگا جا رہا تھا۔ سلسلۂ خیال ٹوٹ چکا تھا۔ پان والے کی دکان کے پاس سے مڑا۔ آگے بھٹیار خانے کی گلی کو پار کیا۔ اب چینا پاڑہ میں داخل ہو چکا تھا ذرا جان میں جان آ رہی تھی اگرچہ دماغ ابھی تک پریشان تھا۔ گلی کچھ کشادہ ہونی شروع ہو چکی تھی مگر یہاں سکوت تھا۔ میں بڑھتا جا رہا تھا۔ سامنے چینیوں کے ہوٹل میں لوگ تیلیوں سے چاول کھا رہے تھے۔ ہوٹل والا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گلی داہنی طرف گھوم کر بائیں جانب مڑی۔ اس جگہ گیس کی روشنی ذرا تیز تھی۔ ایک چینی نصف تپلون اور گنجی پہنے دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے "شو شو" سیٹی بجانی شروع کی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اٹھتے ہوئے میری طرف بڑھا۔ میں رک گیا۔ قریب آ کر بولا "صاحب کچھ چاہیئے" میں کچھ نہ سمجھ سکا "کیا؟" میں نے پوچھا۔ بولا "کچھ چیز دکھائیں صاحب" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اب پاگل ہو جاؤں گا "نہیں نہیں بخشو بابا مجھے کچھ نہیں چاہیے، کچھ نہیں چاہیے" بڑبڑاتا ہوا میں تیز تیز بھاگنے لگا۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس راہ سے آیا ہی کیوں؟ بزرگوں نے صحیح کہا تھا کہ سال بھر کی محفوظ راہ چھ ماہ کی اس راہ سے بہتر ہے جو خطرناک ہو۔ اب تو جانا ہی تھا واپس ہونے کی بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ چنانچہ جس قدر تیز چل سکتا تھا بھاگا جا رہا تھا۔ بچوں کے کھیل کا میدان گزار کر داہنی جانب مڑ چکا تھا یہاں یہودیوں کا عبادت خانہ اور مسلمانوں کی مسجد دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں آگے چوراہے پر سگریٹ کی دوکان کھلی تھی اس کے پاس والی میوہ کی دکان بند ہو رہی تھی سگریٹ والے کی دوکان میں روشنی کے سامنے کلنڈر میں نرگس کی نہایت حسین تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ٹیڑھی مانگ نکالے سر جھکائے لیکن نگاہیں حشر کا ساماں بنی ہوئی۔ اس تصویر کو میں نے آج سے پہلے بھی کئی دفعہ دیکھا تھا اور واقعی بڑی بھلی معلوم ہوئی تھی لیکن ابھی اسے دیکھ کر

جنت تلاش کرنے کو کہتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس گلی کی ہر ہر شے لیمپ پوسٹ، کوڑے کا ٹین، ہاتھ کا ٹھیلا، اونچی دیواریں، بند دروازے اور کھلے دریچے سب ہی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں مرد غلام ہے، بدھو ہے، احمق ہے، الو ہے" مجھے غصہ آیا طبیعت چاہی کہ آج ایک ایک عورت کی بوٹیاں نوچ یا اس کے پرخچے اڑا دوں۔ دنیا میں ہمیشہ کے لیے اس کا نام حرف غلط کر دوں مرد کی زندگی کے اس بدنما داغ کو برابر کے لیے صاف کر دوں، اس کی تاریخ کے اس آبلہ کو ابد کے لیے توڑ دوں۔ ساری دنیا کے مرد کو بغاوت سکھا دوں۔ انقلاب پیدا کر دوں اور اس انقلاب کے سیلاب میں مرد کی زندگی کی اس سڑاند کو بہا دوں" آ۔آ۔ہ" ایک دبی سی چیخ سنائی دی اور میں چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹا "دور ہو میری نظروں سے۔ نکل جا میرے گھر سے" میں نے اپنے مکان کے صدر دروازے کے اندر پاؤں رکھا تھا کہ عادل بیڈمنٹن والا اپنی بیوی صابرہ کو دھکا دیتے ہوئے گرجا صابرہ منہ کے بل گری۔ صرف ایک دبی سی چیخ اس کے حلق سے نکلی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ ٹوٹی ہوئی چارپائی کا سہارا لیتی اٹھی۔ عادل کے قدم پکڑے "میرے سرتاج! پھر آپ ہی بتائیے میرا کیا جرم ہے؟ میں آپ کی چوکھٹ چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ اب میرا کون سہارا ہے؟" پاس ہی اس کا بڈھا سسر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ "کمبخت تیری کوک میں تو چڑیل بسی ہے۔ تیرے لیے کیا میری نسل ختم ہو جائے گی؟" صابرہ سسکتی ہوئی بولی "آپ شوق سے دوسری بہو لائیے میں منع تو نہیں کرتی۔ میں ایک باندی بن کر رہوں گی۔ مگر مجھے اپنے پاؤں چھونے سے تو نہ روکئے۔"

اب میرا سر بڑی تیزی سے الٹا چکر کھا رہا تھا۔

(۱۵ دسمبر ۱۹۴۴ء)

اسے خبر نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے؟ انسانی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب آ رہے ہیں مگر یہ تو اسی محور کے گرد ناچتا رہے گا۔ تیلی کا بیل ہے ایک کھونٹے سے لگا دیا گیا ہے اور یہ ساری عمر اسی کے گرد گھوم کر گزار دے گا۔ اس کے لیے انقلاب نام کی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ دنیا انقلاب سے زندہ ہے۔ انقلاب، بورژوائی، سرمایہ پرستی کے خلاف، سوشلزم کی آوازیں، اور پتہ نہیں دنیا میں کیسے کیسے انقلاب آ رہے ہیں لیکن نہیں آتا ہے انقلاب تو اس ظالم صنف کی حکومت میں کیوں نہیں ایک لینن، ایک ابراہیم لنکن، ایک گاندھی یا ایک جناح ایسا بھی پیدا ہوتا ہے جو اس جبر و ستم کے خلاف آواز اٹھائے، نعرے لگائے اور چیخ چیخ کر کہے "تخت حوا کی حکومت مردہ باد" آزادیٔ مرد، زندہ باد" اور کیوں نہیں یہ کمبخت ان بیدوں کو آگ دکھانے کی بجائے اپنی آتش طبع کو ذرا آنچ دے کر اس ظالم جنس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتا؟ بید آگ کی گرمی سے سیدھے ہو سکتے ہیں تو مرد کی طبیعت میں اتنا جوش اتنی تپش نہیں ہے کہ وہ اپنے غیظ کی بھڑکتی ہوئی چنگاری سے ان کو سیدھا کرے" مشن روڈ [illegible] کی چوڑی سڑک میری راہ کو کاٹ رہی تھی بائیں جانب دو فرلانگ پر پیڈو دے سے ایک [illegible] لڑکے کا نکل کر سامنے والی کار میں گھسا۔ "پھر وہی غلامی [illegible] عورت کی حکومت [illegible] صاحب پہلے کار میں داخل ہوں پھر صاحب گھسنے کی ہمت کریں گے واہ رے سچے مرد اور واہ رے خدا! اطاعت کے لیے اپنی مخلوق میں اور کسی کو اس قابل نہیں سمجھا تھا مرد نے کیا جرم کیا تھا؟ کس گناہ کی پاداش میں یہ عمر سزا اسے عطا کی۔

سنٹرل اونیو گزر چکا تھا اور پلسپا اسٹریٹ سے چاندنی میں مڑ رہا تھا۔ سامنے امجد یہ ہوٹل کا خیمہ اٹھ چکا تھا۔ میزوں پر کرسیاں اوندھا دی گئی تھیں

گم گھر لین بھی گم سم تھی۔ مجھے یاد آیا آج صبح وہ سامنے والا عیسائی اپنی میم سے غصہ میں سرخ اسی جگہ تو کہہ رہا تھا "سچ کہا ہے کہ وہی عورت جو کبھی اپنے قدموں کے نیچے جنت رکھتی ہے کبھی چڑیل بن کر جہنم کے انگارے بھی انڈیل سکتی ہے" اس نے صحیح کہا تھا کیونکہ قدموں کے نیچے جنت بسانے والی ہی نے تو جنت سے آدم کو نکلوایا تھا اور اب مرد کو اپنے قدموں کے نیچے

کررہی تھیں میرا غصے سے بُرا حال تھا۔ یوں میری انسلٹ کرنے کا انھیں کونساحق ہے۔ کچھ زیادہ بڑی تو نہیں صرف چھ مہینے ہی بڑی ہیں۔ پھر بھی بزرگی کی شان جتاتی ہیں۔ چچا جان کی اکلوتی صاحبزادی ہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سب ہی ان سے لاڈ کریں اور ان کے نخرے اٹھائیں۔" میرا دل باغیانہ خیالات سے بھر گیا۔ اور یہ شاید شگفتہ صاحبہ ہیں جن کی تصویریں کمرہ کی زینت بنی ہوئی ہیں اور آپا سماں ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتی ہیں۔ واقعی تھیں تو حسین۔ شاید وہ بھی اپنی سہیلی کی طرح شریر تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیاں اتنی شریر اور بے باک کیوں ہوتی ہیں۔ "طرفہ!" میں نے اپنی چھوٹی بہن کو پکارا "پاگل کی بچی ابھی سن لے۔ شگفتہ! آپا بے طرح چہک رہی تھیں" "آئی .... بھائی جان" دراصل میں نے اپنا غصہ اتارنے کو اسے بلایا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتی ہے تو میرا کہنا مان لیتی ہے لیکن آپا سماں کو دیکھ کر انھیں کی ساتھی بن جاتی ہے۔" آداب شگفتہ باجی! جیتی رہو آؤ بھئی طرفہ بس تمھاری کسر رہ گئی تھی۔" چائے کب تک آئے گی۔ طرفہ کالج جانے کو دیر ہو رہی ہے۔" شاید آج اپنے خیالی کالج جائیں گے؟ نواب صاحب نے ابھی تک چائے بھی نہیں پی" آپا نے پھر منہ مارا۔ لاحول ولا بے وقوفیاں بھی آپا کے سامنے ہی ہوتی ہیں۔ اور آپا بھی اتنی تیز ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بھانپ لیتی ہیں مجھے اپنے پر غصہ آنے لگا۔ "رُو مت منے میاں! بچے غلطی کرتے ہی ہیں۔ سن لو آج چھٹی ہے" "چھوڑو بھئی سماں! تم تو انتہائی پریشان کر دیتی ہو۔" آپ ان کی کم گوئی اور معصومیت پر نہ جائیے ——— اچھا تو ان کی اتنی دیر کی بدتمیزی کی یہی سزا ہے کہ ہمیں بھی ناشتہ میں شرکت کرنے کو کہیں اور چائے بنا کر ہمیں پیش بھی کریں۔" آپا نے میری طرف ٹرے سرکائی۔ میں خاموشی سے چائے بنانے لگا۔ میں نے شکر ڈال کر آپا کی پیالی میں چائے ڈالنا چاہی تو انھوں نے پھر میرا مذاق اڑایا۔ ماشاء اللہ خوب۔ ابھی حضرت پہلے مہمان کو پیش کیجیے۔" یہ تو بڑی مصیبت آئی۔ خدا جانے یہ کتنی میٹھی چائے پسند کرتی ہیں۔ خیر میں نے تین چار چمچے شکر ڈالی۔

اب جو پیالی بڑھانا چاہی تو آپا نے زور سے "اوں ——— کہا میرا ہاتھ کانپا اور پیالی شگفتہ کی گود میں جا پڑی۔ وہ گھبرا گئی۔ "یا خدا رحم کر۔ کیا سب حماقتیں آج ہی ختم ہوں گی۔" میں کھسیانہ ہو گیا۔ سفید سلکن ساڑی پر چائے کے داغ پڑ گئے۔ "جب ایک کام آتا نہیں تو کرتے کیوں ہو؟" صبح کی ہلکی سردی میں میں پسینہ سے بھیگ گیا۔ چائے دوبارہ بنا کر دی۔ ایک گھونٹ لے کر شگفتہ نے پیالی میز پر رکھ دی۔ "کیا بات ہے" آپا نے جواب سنے بغیر

عابدہ رشید جہاں

آپا سماں

نئے سالنامہ کی اشاعت کا اشتہار دیکھا اور میری طبیعت افسانہ لکھنے کو چاہی۔ کئی دن سے کچھ لکھنے کا موڈ تو تھا مگر چھٹی نہ ہونے کی وجہ سے طبیعت ماری پڑتی تھی۔ خیر تو میں افسانہ لکھ رہا تھا کہ آپا سماں آنازل ہوئیں۔

”اُف خدا کی پناہ پھر وہی افسانہ نگاری کا خبط سوار ہوگیا۔ کچھ اور بھی آتا ہے؟“

بھلا اس وقت اُن سے کس نے کہا تھا مجھے یوں پریشان کرنے کو آئیں۔ انھیں کیا معلوم کتنی دماغ سوزی سے کوئی کہانی لکھی جاتی ہے۔ میں نے جواب نہ دینا ہی بہتر سمجھا مگر وہ کہیں ٹلنے والی تھیں۔ ”کیا ایسا نہیں کیا لکھ رہی ہوں“۔ وہ چلائیں۔ ”آپ نہ کیجئے آپا“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”ماشاء اللہ کیا اچھا ہے۔ ابھی دکھتا نہیں کہ ہم آگئے ہیں۔“ ”معلوم تو ہے“ میں رو سا دیا۔ ”تو ہماری تعظیم کو کیوں نہ اُٹھے۔ دیکھ لیا تم نے پورا خبطی ہے۔ قلم پکڑنا بھی نہیں آتا، محض معمولی بچی جان پر رعب جماتے ہیں۔“ نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ کسے مخاطب کیا ہے تو بڑی حیرت ہوئی۔ سامنے حسین اور مسکراتا ہوا چہرہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ خیالات تو پہلے ہی بکھر چکے تھے۔ اب اپنی مجبوری کو یاد کر کے خاموش ہوگیا۔ زبان گنگ ہوگئی۔ ”کمرہ تو اپنا ہی ہے آؤ بیٹھیں یہ تو کیوں کہنے لگے“۔ ”اجازت تو لے لو“ وہ بولیں ”یہ تو جنگلی ہے۔ میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اگر ابھی کچھ کسک ہو تو ان سے رونے سے دور کرلو“ دونوں میرے برابر آ بیٹھیں۔ ”ہاں تو کتنے افسانے لکھ ڈالے“ ”ابھی تو لکھنا ہی شروع کیا تھا کہ آپ .... آگئیں اور اس لئے ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا۔“ آپا نے میرا جملہ پورا کیا اور ان کی سہیلی ہنس پڑیں۔ نہ جانے کیوں آپا کے جسم میں پارہ دوڑتا تھا۔ ”خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ اب تعارف کرادو“ ”اتنا سب کچھ تو بتا چکی ہوں۔ اچھا تو پھر سن لو۔ آپ بی۔اے فائنل میں پڑھتے ہیں۔ پیدائشی نصف پاگل تو تھے ہی رہی سہی کمی فلسفہ نے کر پوری کردی۔ آتا واتا کچھ نہیں۔ آپ کے ایک دوست بھی ہیں یاں عزت لئے ادیب ٹائپ کے ہیں کبھی کبھی کسی ردی سے پرچے میں کچھ چھپوا دیتے ہیں انھیں کی تقلید آپ بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھی کر کے بہت اچھے“ ”کف اڑی بھی ہیں“ آپا میری صفات بڑی نمک مرچ لگا کر بیان

مسلمانوں پر یہ کافر ظلم ڈھائیں اور ہم خاموش رہیں، جب تم لوگوں کے گلے پر چھری چلے گی جب معلوم ہوگا۔ رہ جائیں گے "نفاق دور کرو" "ایک ہو" "ایک ہو" کے نعرے ــــ یہ غریب لڑکی گھبرا کر چھت پر چلی گئی۔ ان وحشیوں کو سمجھانا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ ان کو تو وقت ہی سمجھا سکتا ہے" وہ سوچ رہی تھی۔

"میں تو مسلمان ہوں۔ جبراً ہندوؤں نے میرے سر پر چوٹی رکھدی ــــ وہ جان بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہا تھا۔ اُف جان جانے کا خوف کتنا زبردست ہوتا ہے۔ جان دینا آسان ہے مگر اس کا تصور ــــ خدا بچائے "جھوٹا" سور کا بچہ ہمیں بہکاتا ہے" منتظر سپاہیوں نے للکار لگائیں ــــ"

میں اتنا ہی لکھنے پایا تھا کہ امی آگئیں۔ اور پیار سے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں:ــ

اللہ میرے لال کو جیتا رکھے۔ کتنا لکھ ڈالا آج۔ انشاء اللہ ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا۔ چل بیٹے کھانا کھالے۔ امی کا شفقت بھرے ہاتھ کا لمس اور ان کا پیار کا جملہ سن کر میں پھول گیا۔

اب جو میز پر جا کر دیکھا تو آپا سماں کے ساتھ ان کی سہیلی بھی کھانے پر تھیں۔ انھیں دیکھ کر میرا خون خشک ہوگیا۔ مگر امی کی موجودگی میں وہ کچھ نہ کہہ سکیں گی۔ مگر بھلا ہو امی کی سادگی کا۔ فخر سے شگفتہ سے بولیں۔ "جتنا اپنے کلاس میں اول ہے اسی طرح وہ افسانہ نگاری میں بھی پورے کالج میں اول ہے"۔ "بس چچی جان آگئیں آپ ان کی باتوں میں۔ وہ تو ان کے دوست عزت لکھتے ہیں۔ اور یہ ان سے کہہ سن کر اپنے نام سے شائع کرا دیتے ہیں۔ کچھ فلسفہ پڑھنے والے بھی کہیں لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ فلسفہ بہت خشک مضمون ہوتا ہے" میں امی جان کے سامنے تو چپ رہنا پسند نہیں کر سکتا تھا۔ "آپ نے سائنس لے کر کونسا تیر مارا۔" "جی جناب! بغیر سائنس پڑھے تو چائے بنانے کا بھی شعور نہیں ہو سکتا ــ" طرفہ اور شگفتہ زور سے ہنس پڑیں۔ میں اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

میں تو ویسے ہی آپا کی صورت سے سہم جاتا ہوں۔ جانا آنا تو بہت بڑی چیز ہے۔ کہنے لگیں۔ "سنو بھئی! آج سینما جانے کا پروگرام ہے۔ تمھیں بھی چلنا ہوگا۔ اور موٹر بھی تمھیں ڈرائیو کرو گے۔" دیکھیے تو آپا ــــ مگر" "میں اگر مگر کچھ نہیں جانتی۔ میں تم سے بڑی ہوں اس لئے میرا حکم ماننا سعادت مندی ہے۔" آپا نے بزرگانہ انداز سے کہا۔ اور چلی گئیں۔ راستے میں زیادہ تر یہی جملہ سنائی دیا۔ "ستماں تم بہت پریشان کرتی ہو۔"

ٹکٹ خرید کر ہم بیٹھ گئے۔ اب آپا کی چہچاہٹ پھر شروع ہوگئی۔ مگر شگفتہ نے سنجیدہ پہلو گفتگو کا نکالا۔ پرسوں کے میچ میں آپ کی ٹیم جیتی تھی" "جی ہاں" "اور کالج میں مقابلہ کی تقریروں میں اول انعام بھی آپ ہی کو ملا تھا" "جی ــــ" "ارے شگفتہ بس رہنے دو۔ کیوں مغالطے میں پڑتی ہو۔ روز شیخی بگھارتے تھے کہ میں یوں کھیلتا ہوں اس طرح وکٹ غائب کرتا ہوں۔ گیند پر تو میں نے جادو کر رکھا ہے۔ اب جو جا کر دیکھا تو ایسی

پیالی اٹھائی اور گھونٹ لے کر بُرا سا منہ بنایا۔" توبہ بے ڈھنگ پنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ انڈوں کے لئے نمک آیا تھا اور تم نے چائے میں ڈال دیا —— "یہی تو روز فلسفہ میں پڑھتے ہیں" طرفہ نے جرح کی۔ میں نے شرمندگی دور کرنے کو لب ہلانے چاہے تو آپا پھر بولیں "چلو بس چپ رہو۔ ایک تو ہمیں Bore کر دیا اور دوسرے چھوٹی بہن کو ڈانٹتے ہو۔"

میں نے اس ایک خط کو پرزے پرزے کر دیا تھا۔ آپا کی نگاہیں میرے چہرے کو تکتے تکتے نیچے چلی گئیں۔ "طرفہ یہ دیکھو تو اس چیز کے ٹکڑے ہیں"۔ "اوہ —— آپا میں کا پیالہ تلاش کرتے کرتے تھک جاتی ہوں مگر ملتی نہیں۔ اب پتہ چلا کہ ان کا یہ حشر ہوتا ہے۔ ضبط کی انتہا ہوتی ہے۔ اچھا ٹھہر تو۔ —— میں —— " پھر حواس جاتے رہے۔" تو آپ حواس میں رہتے ہی کب ہیں آپا۔" طرفہ نے پھر چرکہ لگایا۔ "چلو جی اب ٹیلیہ پر پروگرام سنیں۔ سب چلی گئیں۔ میں اپنے خیالات جمع کر کے لکھنے لگا۔

"فرقہ وارانہ آگ پھیل رہی تھی۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ سڑک پر بہت سے آدمی جمع تھے "وہ آ رہا ہے" ایک نے آنے والے کی طرف اشارہ کیا "مسلمان ہے" دوسرے نے موٹی سی گالی بھی دی۔ "بہروپ تو دیکھو ان گائے کے ہتیاروں کا۔ کوٹ پتلون پہنے "صاب" بنا آ رہا ہے"۔ انگریز چلے گئے مگر نشانِ غلامی نہیں گیا" ایک قوم کے جاں نثار بولے۔ "کلوا تو اپنی چھری سنبھال" "میں سنبھالے ہوں" اس نے اپنی کمر سے چھری نکالی۔ صیاد صید کے انتظار میں تھا۔ "صاب" کو موت کی کشش کھینچ رہی تھی۔ ایک چیز چمکی دوسرے لمحہ نوجوان خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ "آہ —— آہ" اور وہ خاموش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔ دھرتی ماتا نے اپنے آزاد لال کا خون جذب کر لیا۔ "کون ہے یہ؟ ہے بھگوان" ارے بھائی! بڑا پاپ ہوا۔ یہ تو ہندو ہے۔ بہت پاپی ہے تو کلوا تو نے ایک ہندو کا خون کر دیا ——"

امی جلدی اٹھو وہ آ رہا ہے کافر کا بچہ، چوٹی ہلاتا ہوا" بیوی نے کواڑ کی آڑ سے جھانکا۔ "کہاں" "وہ دیکھو سامنے گلی کے منہ پر" "جا بیٹی جلدی جا کر پڑوسن کو خبر کر دے۔" "نہیں امی جان یہ غلط طریقہ ہے" "او کی لو اور سنو۔ اللہ کی مار اس انگریزی پڑھائی کو۔ اب اس کی بدولت نہ جانے کیا کیا سہیں گے۔ امی جاؤ جلدی کر دو ——" "دیکھئے امی جان! اسلام یہ نہیں سکھاتا۔" "بس بس رہنے دے لڑکی۔ پھٹکار تمھاری صورت

ایسی بیوقوفیوں سے الٹی سیدھی گیندیں پھینکی ہیں کہ ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ وہ تو انھیں ہٹا دیا گیا ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔ اور اس دن "ڈبیٹ" میں گئی۔ جیسے ہی صدر نے ان کا نام لیا حضرت زرد پڑ گئے۔ اب جو اسٹیج پر آئے تو لب نہ ہلا سکے۔ بولنا تو کجا۔ بس کھڑے کانپ رہے تھے۔" آپا سماں صریح جھوٹ بول رہی تھیں۔ سماں اس قدر جھوٹ سے کام نہ لو۔ اس دن میں بھی تھی۔" اب بولئے آپا۔" میں شیر ہو گیا۔ کسی دوسرے کو دیکھا ہو گا تم نے۔" اتنے میں کھیل شروع ہو گیا ورنہ کچھ دیر اور میری مخالفت اور موافقت میں بحث ہوتی۔ کھیل دیکھتے دیکھتے آپ ہی آپ میری نظریں شگفتہ کے چہرے پر پڑ جاتی تھیں جو اس اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ کئی دفعہ میں نے بھی یہ محسوس کیا وہ بھی دیکھ رہی ہے۔ مگر نگاہ ملتے ہی آنکھیں پردہ کی طرف پھیر لیتی تھی۔ انٹرول میں شگفتہ نے چاکلیٹ اور ٹافی خریدی۔ مجھے دینا چاہا میں نے انکار کیا تو آپا کی ہلکی سی ڈانٹ کھائی۔ میں نے ٹافی لے کر منہ میں رکھنا چاہی تو خواہ مخواہ ہی نگاہ شگفتہ کے چہرے پر پڑ گئی۔ میں نے گھبرا کر کاغذ منہ میں رکھ لیا۔ آپا نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ بھلا شگفتہ نے کس سے کہا تھا کہ وہ دیکھیں بھی۔ اب جو کھیل شروع ہوا تو ایک مسخرہ نظر آیا۔ اس کا پارٹ تھا "وہ لیس میں اور آیا تھا۔ ایک لڑکی جو پہلے سے اس کی محبت میں گرفتار تھی مگر اظہار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کی جیت کے واسطے ایک خوبصورت پھولوں کا ہار لے کر گئی اور اس کے گلے میں ڈال کر نیچی نگاہ کر کے کہا۔ "محبت کا حقیر تحفہ ہے" حضرت نے جو محبت کا نام سنا تو گھبرا کر بھاگے۔" تمام ہال قہقہوں سے گونج گیا۔ آپا سماں اور اپنے موقع سے فائدہ نہ اٹھاتیں ناممکن تھا۔ "بالکل مشابہ بھی شکل بھی اور فطرت بھی۔ کوئی بات نہیں چھوڑی۔" "کہاں ہے سماں حد کر دی تم نے تو۔ صرف ہاڑی تو ملتا ہے۔ صورت تو بالکل مختلف ہے۔" نہ جانے کیوں تم اس کا پارٹ لے رہی ہو۔ کیا رشوت مل گئی ہے ذرا عینک لگا کر دیکھا کرو۔" "آپا خدا کے لئے کھیل کا مزہ تو کرکرا نہ کیجئے۔ تم چپ رہو جی کس نے کہا ہے تم سے بڑوں کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کو۔" عجیب مصیبت ہے۔ خدا چھوٹا کسی کو نہ بنائے۔ میں تو بڑا ہو کر بھی بعض دفعہ چھوٹوں سے بدتر ہو جاتا ہوں۔ طرفہ صاحبہ کیا کچھ کم ہیں۔ خیر کھیل تو کیا دیکھا ظاہر ہے۔ اپنے پر طرح طرح کے ریمارکس پاس ہوتے سنے مگر ایک لفظ نہ بول سکا۔ قدرت نے ایک ساتھی جو دے دیا تھا۔ جو آپا کا ہی ہم جنس تھا۔

رات کو نیند نہیں آئی۔ نہ معلوم کیسا جذبہ تھا۔ خواہ مخواہ ہی دماغ میں شگفتہ گھوم جاتی تھی۔ سوچا کہ افسانہ ہی پورا کر لوں۔ مگر جو لکھنے بیٹھا تو ایک لفظ نہ لکھا گیا۔

کالج بند ہو گیا تھا۔ بیکاری کے دن کاٹے نہیں کٹتے تھے۔ آپا سماں جانے کو کہتیں مگر میں روک لیتا۔

اختر اورینوی

رقصِ شرر

محبوب نگر سے قریب دامودر ندی سے سات میل دکھن کالندی نامی ایک اڑاؤں گاؤں تھا۔ اس بستی میں اڑاؤں قبیلہ کے علاوہ کچھ منڈا قبیلہ کے لوگ بھی بستے تھے۔ کچھ شمال سے آئے ہوئے مسلمان جولاہے اور کچھ دات کے ہندو بھی تھے۔ اڑاؤں اور منڈا قوموں کے چند گھرانے عیسائی مشنریوں کے زیرِ اثر آ کر عیسائیت قبول کر چکے تھے بقیہ اڑاؤں اور منڈا آبادی عناصر پرست تھی۔ وہ بھوت پریت اور ارواح پر ایمان رکھتی تھی۔ جادو ٹوٹکے اور وحشیانہ تجربات ان کے عقیدہ میں داخل تھیں۔ یہ چھوٹا گاؤں دیودار کے ایک گھنے جنگل کے پاس آباد تھا بلکہ جنگل اسے اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ بستی کے اردگرد مورم کے سرخ ٹیلے تھے جن کا ڈھلوان پچھم جانب تھا۔ یہ نشیب ایک زرخیز "دون" تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ جس کی مٹی سرخی مائل زرد تھی اور جس میں بستی کے کسانوں کے دھان کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ "دون" ایک بڑے سے جام کی طرح گنبدِ فلک کی طرف نگراں تھا۔ اس کے چاروں طرف مورم کے ٹیلے سرافراز تھے۔ مغربی ٹیلے کے بعد سیاہ سفید چٹانوں کا سنگستان تھا۔ سپاٹ، گول، نوکیلی چٹانوں کے وسط سے ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ ندی کے دامن میں بھی چٹانیں اور بڑے بڑے سنگ ریزے تھے۔ ندی کبھی کبھار ہی برسات میں بھرتی تھی۔ پہاڑی ندیاں جوانی کے جذبات کی طرح چڑھتی اور بھولی بسری ہوئی محبت کی مانند اتر جاتی ہیں۔ صرف دوال دوال سرجوش دھارے کی گزرگاہ کے نشان رہ جاتے ہیں۔

بستی کے سب مکان کچی مٹی کے تھے۔ ایک دو کھپریلیں تھیں۔ ورنہ عموماً پھوس اور جنگلی گھاسوں اور سرکنڈوں کے چھپر ہر جگہ نظر آتے تھے۔ گاؤں والے ان کے مویشی، ان کے سور اور مرغیاں سب ایک ساتھ ایک کنبہ کی حیثیت سے رہتے تھے۔ گاؤں کے بچے اور کتوں اور سوروں کے پلے گلیوں، میدانوں اور ٹیلوں پر ایک ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔ بستی والوں کا پیشہ صرف کاشتکاری تھا۔ بعض بکریاں اور سور پال کر گزارا کرتے تھے۔ کیونکہ "دون" کے اندر کھیتی کے لئے زمین محدود تھی۔ دھرتی ماتا نے اس سور یا کی طرح اتنے زیادہ بچے جن دئے

ہوئیں۔ حالانکہ ہیرو ہیروئن میرا شیا پوزلیتی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس قدر کیمرہ سے عشق تھا۔ طرفہ آگئی اور میری طرف دیکھ شرارت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کسی کی رات والی بات" "کونسی" میرا دل دھڑک گیا۔ کہیں اس نے مجھے اور شگفتہ کو تو نہیں دیکھ لیا۔ "جلدی بتاؤ کونسی بات" آپا سماں بول پڑیں۔ یہ نہ پوچھو آپا"

میں نے آنکھ سے منع کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی "جی رات کو چاندنی میں بڑے راز و نیاز ہو رہے تھے"

"کس سے؟" "شگفتہ باجی سے" آپا ساکت رہ گئیں۔

کچھ دیر بعد طرفہ اور امی جان کی باتوں کی آواز آتی رہی۔ پھر آپا اور طرفہ آگئیں۔ آپا کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھرک رہے تھے۔ یا اللہ یہ آپا کو کیا ہو گیا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سخت حیران تھا۔ یہ یک لخت آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ عقل کچھ کام ہی نہیں کر رہی تھی۔

نتیجہ نکلا میں فرسٹ آیا اور کالج ہی میں پروفیسر بنا دیا گیا۔ طرفہ کی شرارت کارگر ثابت ہوئی۔ واقعی بہن بھی خدا کی بخشش بہا عنایت ہوتی ہے۔ برسر روزگار ہوتے ہی میری نسبت شگفتہ سے ٹھہرا دی گئی۔ میری شادی اسی ماہ میں ہونے والی تھی۔ آپا سماں کو اتنے خط لکھے مگر وہ جواب ہی نہیں دیتی تھیں۔ شادی میں اور آپا سماں شریک نہ ہوں؟ یہ مجھے برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک شادی کے موقع پر بہنوں کی چھیڑ چھاڑ نہ ہو کچھ مزا ہی نہیں آتا۔ آخر ہار کر میں نے لمبے چوڑے خط میں اپنی قسمیں دلائیں تو مختصر سا جواب لکھا۔ "اگر تم ہی چاہتے ہو تو آ رہی ہوں"۔ برات جانے سے چند گھنٹے پہلے آپا آئیں۔ پہلے جیسی بات ہی نہ تھی۔ حیران تھا مشکل سے آپا کو پہچانا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ "کیا بھول گئے؟" آپا نہیں پھیکی اور مردہ ہنسی۔ آپا کے اس جملہ سے میں کانپ گیا۔ میں اور آپا کو کبھی بھلا سکتا ہوں؟ کہتے ہوئے ایک بنڈل میرے سامنے انھوں نے کھولا۔ یہ سب میری تصویریں تھیں۔ "مجھے ان کے رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے" "کیا مطلب؟" میرا دماغ ساکت ہو گیا۔ "یہ تصویریں اب میں نہیں رکھ سکتی۔ شگفتہ رکھے گی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ میں بت بنا کھڑا تھا کہیں خوابوں میں بھی حقیقت ہوتی ہے! —— میں نے حسین خواب دیکھے تھے —— لیکن تعبیر ڈراؤنی نکلی —— شیریں خواب —— تلخ تعبیر —— ہاں مجھے کچھ نہ کہنا چاہیے —— میں بڑی ہوں صرف تمہارے بچپن کی تصویر لینا چاہتی ہوں —— تم چھوٹے ہو —— میں اس کی حقدار ہوں مجھے معاف کر دو۔ جذبات کی رو میں بہہ گئی ہوں —— اچھا مبارک —— خدا تم دونوں کو سکھی رکھے۔" آپا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئیں۔ میں خاموش تھا کچھ بھی نہ بول سکا۔

(جنوری ۱۹۴۸ء)

کرتی ہے نہ زمیندار کھیت بڑھتے ہیں، کوئی نیا کام نکلتا نہیں مگر بچے پیدا ہوتے رہتے اور آبادیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ لاکھوں بچے مرتے جاتے ہیں اور جو بچ رہتے ہیں انھیں نسلی اثرات اور سطح مرتفع کی صحرائی آب و ہوا کی جاں بخش خصوصیات حیرت ناک طور پر تاب و تواں عطا کر دیتی ہیں مگر معاشی ماحول کی سختیاں اور تنگیاں انھیں مرجھانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ جھاڑکھنڈی فطرتاً جنگلی جھاڑیوں کی طرح چمڑے اور سخت جان ہوتے ہیں۔ ادبین مقابلۂ حیات میں جو مر مٹے وہ مر مٹے۔ پر جو بچ نکلے وہ مصیبتوں کو چار و ناچار سہتے ہوئے ہنستے روتے سانس لیتے اور کام کرتے زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مرجھانے اور سوکھ جانے پر بھی سخت کوشش ہوتے ہیں اور عموماً غم دوراں کو اپنے کھیلوں اپنے تہواروں اور اپنے رقص و نغمات میں بھول جانے کی سعی کرتے ہیں وہ ہنسی خوشی اپنے کھیتوں کو جوتتے بوتے، اپنی عورتوں سے محبت کرتے اور بچوں کو پالتے سفرِ حیات ختم کر دیتے ہیں۔ اس محنت اور آنسو کی وادی کو محبت کی وفاداریاں اور جوانی کی رنگ رلیاں سوز و ساز عطا کرتی رہتی ہیں۔ بوڑھے اکھاڑوں مرد اور عورتیں تو جلی ہوئی لاش کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ادھیڑ بھی فاقوں اور مصیبتوں کی وجہ سے نہایت کریہہ المنظر ہوتے ہیں۔ عورتوں کی چپٹی جھولتی ہوئی چھاتیاں خالی خولی چمڑے کی تھیلیوں کی طرح ان کی بے گوشت سوکھی ہوئی پسلیوں پر تھپیڑے مارتی رہتی ہیں۔ ان کے پچکے جھرّی دار بے رونق گلے اور پیشانیاں ان کی اینٹھی ہوئی ننگی ہنڈلیاں اور بازو، ان کے جھاڑجھنکاڑ خشک الجھے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال اس مخلوق کو آدمی سمجھنے نہیں دیتے۔ عمر رسیدہ مرد تو ممی شدہ لاشوں سے زیادہ مکروہ ہوتے ہیں اور ڈھلے سن والے لنگ کے ایسے جھڑ کے جلے ہوئے بندرا و رمنومان معلوم ہوتے ہیں جن کی ساری اچھل کود ختم ہو چکی ہو اور وہ بھبنی میں بھنے ہوئے کالے بیگن کی طرح سکڑ کر بے رس ہو گئے ہوں۔ کالندی گاؤں میں ایسے ہی لوگ بستے تھے۔ ان کے کھیتوں کی مٹی میں ان کے آنسو ملتے رہتے تھے۔ ان کے دست دپا اس خاکِ پاک کو گوندھ گوندھ کر آنے والی نسلوں کے پتلے بناتے جاتے تھے اور وہ بیچے ایک ابدی تسلسل کے ساتھ اسی کام میں مشغول رہ کر خود بھی راکھ بن کر مٹی میں مل جاتے تھے۔

کالندی میں کوئی دکان نہ تھی۔ دور کی ایک بستی میں ہفتہ وار ہاٹ لگتی تھی۔ قرب و جوار کے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ کالندی میں رات کو ایک آدھ ہی دیا جلتا تھا اور وہ

ہے جن کے پستان کی تعداد اور دودھ کی مقدار بچوں سے کم ہوتی ہے۔ پتلے پستان کو چوستے چوستے سوریا کو دبلا کر دیتے ہیں اور انھیں چاٹتے رہنے کے باوجود خود بھی لاغر ہی رہتے ہیں۔ اُنّادون اور منڈا ... صرف ایک لنگوٹی پہنکر زندگی کے دن کھیپا دیتے ہیں۔ جوانی میں ان کے سڈول سیاہ جسم اور سنورے ہوئے لانبے بال چمکتے رہتے ہیں۔ لال دھاگے کی پتلی زلفوں کو سر کے بالائی محاذ پر کسے رہتی ہے اور عریاں جسم میں کانچ کے رنگین موتیوں، نقلی مونگوں چھوٹے چھوٹے گھونگھوں اور چپٹی کوڑیوں کے ہار جھولتے رہتے ہیں۔ عورتیں ایک پتلی سا موٹیا کی ساری پہنکر گذار دیتی ہیں۔ ان کے سینے اور شانے کھلی ہوا میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ لانبے سیاہ بال سجے سنورے ہوئے ہاتھوں میں کالے سرکہ موٹے موٹے بتاسے اور کانوں کی لو میں سرخ رنگین بانس یا سرکنڈے کی ڈھائی انچ کی نلکی گھسی ہوئی۔ یہی اُن کا سامانِ آرائش و تجمل ہوتا ہے۔ ان قوموں کی جوانی کا کس بل دیدنی ہے۔ اعضا کی بندش، توازن، تراش، اٹھان اور اُبھار ایسے دیدہ زیب ہوتے ہیں جیسے کسی بے مثل بت گر نے سنگِ موسیٰ سے نادر مجسمے تراش تراش کر سجا دئیے ہوں۔ ان کے گٹھیلے بدن کی استواری، کٹیلے پن، سختی اور توانائی دیکھنے والوں میں یہ احساس پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ ماؤں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے جنوبی سنگستانوں کے بطن سے معجزانہ رنگ میں جنم لیا ہے۔ ان کے جسموں کی لچک، پھرتی، حرکت و خرام تناؤ اور لہر سے زندگی آبشار کی طرح پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مگر ان کے جیون کا دکھ سکھ ان کی ہنسی اور ان کا رونا۔ ان کی محبت و نفرت، اُن کی امنگیں اور ان کا سوچ، اُن کے شباب کا اُتار اور ان کی موت، یہ سارے حیات کے اونچ نیچ، یہ واردات و سانحات زندگی ہم سے منوا چھوڑتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح کے ہی حساس اور فانی انسان ہیں۔ اُنّادون اور منڈا قبیلوں کا رنگ روپ اور ان کے بدن کی آب جلد بجھ جاتی ہے۔ سارا چھوٹا ناگپور مہاراجوں، راجوں اور لالوں کی ملکیت ہے۔ وہ اس دیار کی ترقی کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ یہ کہستانی اور جنگلی علاقہ ہے۔ کاشت کے قابل زمینیں بہت ہی کم ہیں۔ جھاڑ کھنڈی بستیوں کے ارد گرد بھی موم کے ٹیلوں اور غیر آباد کنکار سے بھرے ہوئے میدانوں کی کثرت ہے۔ صرف نشیبی 'دونوں' میں کھیتی ہوتی ہے۔ نہ اچھی زمینوں میں اضافہ کی فکر کسی صاحبِ اختیار کو نہیں۔ آ... گنے کھیتوں کو کوڑ کوڑ کر کسان پرانی پیداواریں حاصل کرتے رہتے ہیں جو ان کے اور ان کے بچوں اور عورتوں کے لئے کبھی بھی کافی نہیں ہوتیں۔ بیشتر زمینوں اور آب و ہوا کی مناسبت سے نئی فصلیں اُگانے کا پیمانہ

کو بیکراں بناتیں۔ ازلیت اور ابدیت گلے مل کر عجیب کائناتی رقص شروع کر دیتے۔ زندگی کا رقص یا موت کا رقص؟ کون جانے؟ ایسے میں جب آسمان کے چراغ کے گل ہوئے چار گھڑیاں بیت چکی ہوتیں اور تاروں کی لرزاں روشنی اس جہان کی امس ظلمتوں کو صرف اجاگر کر کے دور سے سہمی ہوئی تماشہ دیکھتی، دولی کے کسی جھونپڑے سے ایک کانپتا ہوا دیا نکلتا۔ مخملی فضا میں سفر کرتا ہوا کسی خاص درخت کی جڑ پر آ جاتا۔ اپنی کومل جوت جگاتا۔ پیچیدہ جڑوں، اور تنوں، کبھی ادھ گوشے کو چمکاتا۔ نزدیک کی شاخوں اور پتوں پر ہلکی پیلی سی روشنی ڈالتا، ٹمٹماتا اور جھلملاتا رہتا۔ دیا کی روشنی کا حلقہ عظیم تاریکیوں کے جسم پر سسکتا ہوا ایک زرد چھوٹا سا بے حقیقت دھبا معلوم ہوتا۔ یہ دیا اندھیرا دور کرنے کے لئے شاید نہیں جلایا جاتا بلکہ محض ایک مرکز، ایک علامت، ایک تسکین کی حیثیت سے روشن کیا جاتا تھا۔

سیاہ چمکدار چہرے اور چکیلے پیکر پیڑ کے نیچے جمع ہو جاتے۔ نو خیز لڑکیوں اور شباب رسیدہ عورتوں کی ٹولی الگ بنجاتی اور نوجوان لڑکوں اور ادھیڑ سال مردوں کی علیحدہ۔ دن بھر کی کڑی جاں سوز محنت کے بعد مسرت کے ان گذراں لمحات پر جھپٹ کر دوامیت کرنے کے آرزومند۔ اپنے ولولوں کو مہوا یا چاول کی شراب خانہ ساز سے بیخودی کا سہارا دیتے، آمادۂ رقص ہوتے۔ صنف نازک کا ایک نیم دائرہ بنتا جس کے مرکز میں مرصع زلفوں، تیکھی چتونوں، سینہ تاب بازوؤں والے گٹھیلے لنگوٹی پوش جوان گلوں میں ڈھول ڈالے پیر جمائے کھڑے ہو جاتے۔ عورتیں ادھیڑ، الھڑ، لڑکیاں، پھٹے بال سجائے۔ آنچل بے کلے اور کمر کسے نیم عریاں ایک منظم حلقے میں پہلو بہ پہلو پھلدار پیڑوں کی طرح استوار کھڑی ہوتیں۔ ان کے سجل بازو گدرائے ہوئے سینے بندھی ہوئی پنڈلیاں، تھرکتی ہوئی کمریا اور خوش آہنگ ابھرتے ہوئے۔ مجسم ترنم، مقید رقص متشکل نغمگی اور رنگین تموج کی تشنہ سامانی کے نیچے! اچانک ایک سنگیت کا راگ سکوت کو تراشتا ہوا بلند ہوتا۔ نرم، نازک، رسیلا، مگر تیز اور براق۔

"کیولے ڈنڈن پاڑا کو پاڑو، پچ بالیائے راگے برتو۔ ر۔ ر۔ ر۔ بیری بٹری پاڑا کو پاڑو، پچ بالکرا راگے برتو۔ ر۔ ر۔ ر۔ (او گیت گانے والے، پیارا سا نغمہ چھیڑ دے! مرے ہوؤں کی روحیں سننے آتی ہیں)

جوان ڈھول پر تال لگاتے اور اس کے گت پر عورتوں کا مرتب و منظم نیم دائرہ قدم ملاتا ہوا آگے

بھی بجھا دیا جاتا تھا۔ سارا گاؤں جھاڑ کھنڈ کی قدیم تاریکیوں میں گم ہو جاتا۔ سورج کے چراغ کے گل ہوتے ہی ازلی امٹ، ناقابل تسخیر ظلمتیں بیکراں، اٹل، زندہ و پائندہ جنگلوں سے سر نکال کر بے حقیقت انسانی آبادیوں کو نگل جاتیں۔ یوں تو دن کو بھی جنگل اپنے پنجے نکالے ہوئے ہر طرف سے آدمی کے مسکن کو دبوچ لینے کی فکر میں رہتا۔ مگر رات کے کالے جادو کے جاگتے ہی سارے معمورے پر ایک افسوں پھونک جاتا اور چھوٹے چھوٹے گاؤں تحلیل ہو ہو کر جھاڑ کھنڈ کی بہیمانہ وحشت میں ہضم ہو جاتے۔ صبح ہوتے ہی پھر جنگل اور آدمی کی جنگ شروع ہوتی۔ آدم اور جن کی جنگ۔ زراعت اور خودرو، وحشی بے پناہ روئیدگی کا ازلی پیکار۔ تہذیب کی ابتدائی کرن جھاڑ کھنڈ میں بھی پھوٹتی ہے۔ بہت ہی ابتدائی، بہت ہی کمزور۔ بہت ہی غیر محفوظ۔ یہاں ہلکی سی روشنی کی نازک سی کرن محیط، غیر مختتم ظلمتوں سے لڑتی رہتی ہے اور تہذیب کے مراکز اس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ بلکہ خود وہ بھی اس ننھی کرن کو مٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہوس استحصال اور حرص بعض آدمی بھی جن بن جاتے۔ اخوان الشیاطین یا ذریات شیاطین انسانیت اور بربریت کی لڑائی میں وہ دشمن کی صف میں ہوتے ہیں ان کے دلوں، ان کے دماغوں، ان کے نفس میں ایک اندھیرا جنگل ہوتا ہے جس میں ریچھ، بھیڑیے اور چیتے ہوتے ہیں۔ آدم اور جن کی جنگ، انسان اور شیطان کی جنگ ہمارے وجود کے اندر اور باہر ہر گھڑی اور ہر جگہ جاری ہے۔ یہ جنگ کالندی میں بھی جاری تھی۔

اکثر رات کو گاؤں میں ناچ ہوتے تھے۔ اراؤں اور منڈا قبیلوں کے ہاں بھی ناچ گاؤں کے اندر یا کسی بڑے درخت کے نیچے سبھا سجتی تھی اور ناچ شروع ہو جاتا تھا۔

چاروں طرف سانس لیتے ہوئے تاریک جنگل اور سائیں سائیں کرتے ہوئے اندھیرے، ٹھٹھرتی ٹیلے نشیب و فراز میں رینگتی ہوئی سیاہیاں۔ بستی کے قریبی ماحول پر منڈلاتے ہوئے سیاہ سائے اور ہر سو لامتناہی ہو کا عالم۔ اُبلتی ہوئی پُر اسرار خاموشیاں۔ تاریکی خاموشی کے ساتھ ہم آغوش ہو کر انجان بولی میں سرگوشیاں کرتی ہوئی۔ اور اس ساری پُر ہیبت ابدیت کو ڈھانپے ہوئے گہرا نیلا آسمان اپنے ستاروں کی کرنیں اپنے دامن میں ہی سمیٹے ہوئے اپنی ازلیت کا راز اپنے کہن سال سینہ میں چھپائے اور حیرت افزا فوق الفطری تاثیرات و ممکنات اپنے ان سنے مگر اٹل تنفس میں لئے ہوئے۔ تاریکیاں خاموشیوں کو گہرا کرتیں اور خاموشیاں تاریکیوں

رات گئے تک ناچ ہوتے رہتے اور "ہانڈی" کی شراب پی جاتی۔ کبھی تو رقص کی حرکت و خرام ظالم تیرگی کے مجبور شکاروں کی تلملاہٹ اور کشاکش معلوم ہوتے۔ ظلمت منہ پھاڑ کر حملہ کناں نظر آتی۔ بوڑھے درخت کی پیچ و تاب کھائی ہوئی پھیلتی کھنچتی ہوئی بھوری مضبوط جڑوں کی انگلیاں اور استوار ورگ دار تنے کی کٹھی کلائی اوپر کی تیرہ و تار فضا سے شکار کی گرفت کے لئے بڑھتی ہوئی آتیں۔ نزع کا درد و اضطراب یا خوشی کا ترنگ؟ قدیم رقص کے بھاؤ عجیب احساسات کو چونکا کر کبھی ازلی مسرتوں کو جگاتے ہیں اور کبھی ازلی خوفوں کو بیدار کرتے ہیں۔

ناچ ختم ہوتا۔ گلدستۂ رقص بکھر جاتا۔ ناچنے والوں کی الگ الگ ٹولیاں بن جاتیں۔ جھلملاتے ہوئے دیا کی نوکیلی لو رات کے کالے کمبل کو کاٹتی ہوئی جھونپڑی میں واپس چلی جاتی مگر تیرگی کی تہہ بہ تہہ موجیں زخم نشتر کو بھر دیتیں اور پھر وہی مکمل اٹوٹ سیاہ گلیم۔ ساری کائنات کو ڈھانپ لیتا۔ نغمہ و رقص کی تھرتھری فضاؤں میں کچھ دیر کے لئے چھائی رہتی اور شراب خانہ ساز کا نشہ لہریں پیدا کرتا رہتا۔۔۔۔

ہر اُڑاؤں و مُنڈا گاؤں میں دو "دھمکڑیا گھر" ہوتے ہیں۔ یہ دھمکڑیا گھر، ایک بڑی سی کوٹھری ہوتا ہے اور بس۔ ایک میں عموماً گاؤں کے سب نوجوان لڑکے ساتھ سوتے ہیں اور دوسرے میں بستی کی دوشیزائیں مل کر رات بسر کرتی ہیں۔ قدیم اقوام کے اس عجیب و غریب اشتمالی ادارہ کو راز و رمز کا پردہ ڈھانپے رہتا ہے۔ یوں تو یہ "دھمکڑیا گھر" محض اجتماعی رین بسیرے کی ایک جگہ ہے۔ مگر در اصل یہ ایک ایسی ابتدائی سماج کے رواجوں، عقیدوں اور روایتوں کا غیر مرئی عجائب گھر ہے جس نے غیر شعور کے نہاں خانوں سے نکل کر شعور کی طرف چند قدم ہی بڑھائے ہیں جس سے شعور و عقل کا بار گراں برداشت نہیں ہوتا اور وہ غیر شعور کی طرف واپس جانے کے لئے بے تاب ہے۔ فطری عادات اور جبلتوں کی تن آسانی کی طرف "دھمکڑیا گھر" نفس تحت الشعور کے نہاں خانہ کی خارجی و ظاہری علامت ہے۔ نفسِ انسان کے وحشی، پرشور، بے عنان، انجان تاریک حصے کی محفوظ پناہ گاہ۔ جہاں ابتدائی خواہشات قدیمی جبلتیں اور ازلی شہوات راز و رمز کے غاروں میں چھپ کر، شعور و عقل کی جرح و تنقید سے بچ کر بے روک لذتِ اظہار حاصل کرتی ہیں۔ "دھمکڑیا گھر" کے بھی قوانین ہوتے ہیں اور عام سماجی نظام کے قوانین سے زیادہ سخت، زیادہ اٹل۔ مگر اس میں موافقت، فیصلہ، ارادہ اور اقدام کے

بڑھتا اور گیت کی لَے کے اتار کے ساتھ پیچھے ہٹ جاتا۔ مرکزا ور نیم دائرہ ہم آہنگی کے ساتھ آگے بڑھتے اور پیچھے ہٹتے رہتے۔ بدن کا ارتعاش۔ نغمہ کا اہتزاز اور ڈھول کا گت گھُل مِل کر ایک مخصوص ترنّم بموتج بن جاتا۔ ناچ کی لہریں، اٹھتیں، بڑھتیں اور پیچھے ہٹتیں۔ آہستہ آہستہ گیت کی لَے اُبھرتی جاتی اور ناچ کے قدم تیز ہوتے جاتے۔ یہ موجیں شعلے کی زبان کی طرح تیز تر ہوتیں اور سرکتی رہتیں۔ ایک بار تین بار اور پھر تو بار بار۔ تین بار، سات بار، اور پھر تو بار بار نغمہ، رقص کا موضوع اور اسلوب، بھاؤ اور اظہار، جذبہ اور رس بالیدہ ہو کر ایک سادہ وحدتِ مزاج میں گم ہو جائے۔ جیسے جیسے ناچ کی آنچ گرم و تیز ہوتی جاتی ہے رقص اور شعلۂ آواز ایک ہمہ گیر لہک کی صورت اختیار کر لیتے جس میں ایک قرینہ، ایک سلیقہ، ایک ضابطہ ہوتا۔ ایک شعور اور معیار ہوتا۔ بے اختیاری میں اختیار، بیساختگی میں ساز، بے تحاشگی میں توازن۔ جس اچانک پن سے ناچ شروع ہوا تھا۔ اُسی طرح یک بیک ختم ہو جاتا دیا اُسی طرح جھلملاتا ہوتا اور پھر فضا پر المناک سکوت طاری ہو جاتا۔ تاریکیاں پھر لپٹنے لگتیں اور ایک لمحے کے لئے یہ احساس غالب ہو جاتا کہ یہ سیاہ عورت و مرد خود بھی اسی کالی رات کے ٹکڑے ہیں۔ ماحول کی تاریکی سے بنے ہوئے منجمد ٹھوس پیکر وہ اسی سے ہیں، اسی کے ہیں اور اسی میں محلول ہو جانے والے ہیں۔ اطراف کے جنگل کے ہانپنے سے نم آلود گرم ہوا کا ایک بھبکا آتا اور دیا کی روشنی غمناک ٹھنڈی سانس بھرتی۔ پھر رقص کا دوسرا دَور شروع ہوا۔ زندگی کی آنکھوں میں پھر امید کی کرن جگمگاتی اور حیات کی رُکی ہوئی بالیدگیاں سرافراز ہو جاتیں۔ رقص کی پیچیدگیوں کے اندر گھٹی ہوئی تمنائیں بھی آزادانہ ناچنے لگتیں۔ اسی طرح کئی بار ہوتا۔ کبھی دلیپا اور کے گیتوں کی ایک آدھ کڑی بھی تبدیلی ذائقہ کے لئے گائی جاتی —— "دوڑی گے دوڑی گلبا جھاچن چن کھائے" کبھی آپس میں چُہلیں اور چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی اور جو سبھا دیر تک جمتی تو مخلوط رقص بھی ہوتے۔ کبھی ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کی مسلسل قماش بنا کر نیم دائرہ مکمل کیا جاتا۔ ہر نوجوان دو لڑکیوں کو اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں میں دونوں جانب لے لیتا اور ہر لڑکی دونوں طرف دو نوجوانوں سے بازو پھیلا کر بغل گیر ہوتی۔ مرکزِ دائرہ میں حسبِ سابق چند نوجوان ڈھول بجاتے اور ناچ شروع ہو جاتا۔ کبھی اس ترکیب و قماش میں تبدیلی بھی ہوتی۔ بہرحال و بہر رنگ

تنقید

مختار الدین آرزو

اشعارِ میر پر ایک نظر

دنیائے شاعری میں استاذ الشعراء میر تقی میر کو جو درجہ اور مرتبہ حاصل ہے وہ اہل نظر
سے پوشیدہ نہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے ان کی شاعری کی عظمت میں
بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا دیوان کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ [illegible]
صاحب [illegible] انجمن ترقی اردو نے مولانا عبدالحق کا ایک انتخاب شائع کیا ہے
اور کچھ دنوں ہوئے لکھنؤ سے مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے ان کا مکمل کلیات
بھی مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ غالب اور اقبال کی طرح ان پر مستقل کتابیں
ابھی بہت کم لکھے گئے ہیں جس کے وہ مستحق تھے۔ اور جو چیزیں لکھی بھی گئی ہیں
وہ کچھ اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں۔

زیر نظر کتاب میں متعدد عنوانوں کے تحت ان کی زندگی اور ان کی شاعری
کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میر کے علاوہ ان کے
معاصرین اور ان کے تلامذہ کا بھی ذکر ضروری سمجھا گیا ہے۔ میر کے حالات کسی قدر
تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں ان کے کلام کا
انتخاب بھی دے دیا گیا ہے لیکن ساری بحثیں پھیلا کر نہیں لکھی گئی ہیں۔ بعض
جگہ تو اس قدر اختصار ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ مصنف
نے اس کتاب کے لکھنے میں بہت کم محنت کی ہے ورنہ [illegible] سے بہتر
ممکن تھا۔

کلام پر جو تنقید کی گئی ہے اس کا پایہ بھی بلند نہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف

دوسرے کی اذیت نہیں۔ یہ فطری اور جبلّی قوانین کی طرح اچوک ہیں۔ ان میں ترک و اختیار نہیں۔ ان میں رفتار نہیں۔ ارتقار کی کٹھن منزلیں نہیں۔ ان میں عزم سفر نہیں۔ یہ ساکت، اچل، غیر مبتدل، ازلی اور ابدی ہیں۔

دھمکڑیا گھر میں زندگی بالیدہ ہوکر جوانی کا سانس لیتی ہے۔ شباب کی حیرتوں سے روشناس ہوکر اس کی تازہ کام آمجوبگی میں گم ہو جاتی ہے۔ یہاں حیات کا سادہ تسلسل قائم رہتا ہے۔ زندگی کی خواہشات و مطالبات سے واقف کار نوجوان لڑکیاں اور لڑکے دوسری دو خیز ہستی کو نہایت اہتمام و باضابطگی کے ساتھ رازہائے زندگی سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہر دھمکڑیا گھر کی کچھ رسمیں، کچھ معمولات، کچھ پرستشیں اور کچھ تجربات ہوتی ہیں۔ ایک رسم یہ بھی ہے کہ گاؤں کے مردانہ دھمکڑیا گھر کے اہالیان رات بھیگنے کے بعد جنس کی پوجا کے لیے نکلتے ہیں۔ یہ سیر شبانہ دور کے کسی گاؤں تک انھیں لے جاتی ہے کیونکہ اپنی بستی کے زنانہ دھمکڑیا گھر سے خونی انسان کے یہاں ممنوع ہے۔ ان یلغاروں میں کبھی دو گاؤں کے نوجوانوں کی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہو جاتی ہے اور خون خرابہ تک نوبت پہنچتی ہے۔ نوجوان مہوے اور چاول کی شراب پیے چیتے کی طرح صنفی شکار میں نکلتے ہیں۔ بڑی احتیاط سے اپنا مقصود حاصل کرنے کی دوا دوش کرتے ہوئے اکثر کامیاب اور کبھی گھائل ہو سکتے ہیں۔ لڑکیاں بھی جذبۂ سپردگی و تمنائے جوانی سے اپنے دھمکڑیا گھروں سے پیغامات بھیجتی رہتی ہیں۔ تہذیب کے جدید حملوں سے پہلے اسی ادارہ کے ذریعہ لڑکے لڑکیوں کے جوڑے بنا یا کرتے تھے اور کبھی لغزشوں سے غبارے بھی بھٹکنے پڑتے تھے۔ اگر زنانہ دھمکڑیا گھر کی بوڑھی مشیر طبیبہ عورت کی عجیب عجیب جڑی بوٹیاں، حیرت ناک ٹوٹکے اور کالے جادو کھیلنے والوں کو سہارا دینے میں ناکامیاب ہو جاتے تو پھر خون کے چھینٹوں سے تقدیس کے دیوتاؤں کی پیاس بجھائی جاتی۔ کبھی حبیب قتل کر دیا جاتا اور کبھی محبت شعار و ایثار پسند محبوبہ اپنے حبیب کا نام بتانے سے انکار کر دیتی اور محبت و شباب پر قربان ہو جاتی لیکن اب جھارکھنڈ میں خالص قدیم رسم و رواج نہیں رہے۔ ابتک تو بیرونی در آمد نے اس علاقے کو زیادہ نقصان ہی پہنچایا ہے۔ دھمکڑیا گھر کو بھی خارجی بدعنوانیوں کی چھوت لگ گئی ہے۔

(دامنِ تعمیر کا ایک باب)

پھر لکھتے ہیں

"جوان صالح عاشق پیشہ بود۔ دل گرمے داشت بخطاب علی متقی امتیاز یافت" (ذکر میر صفحہ ۵)

ان بیانات سے معلوم ہوا کہ 'علی متقی' میر کے والد کا لقب تھا اور محمد علی نام، القب و علم میں فرق ضرور کرنا چاہیے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ میر صاحب شیعہ تھے ان کے والد کے متعلق تذکروں میں مرقوم ہے کہ وہ متقی اور پرہیزگار، زاہد اور عالم باعمل تھے۔ ان کے والد کا ایک سنی صوفی بزرگ حضرت کلیم الہ آبادی سے مرید ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے میر صاحب ایک وسیع المشرب آدمی تھے کبھی کبھی درگاہوں کی زیارت بھی کر لیتے تھے ایک مرتبہ جب وہ قصبہ سامر کی لڑائی میں نواب کے ساتھ شریک تھے تو اجمیر وہاں سے قریب تھا زیارت کے لیے فوراً وہاں چلے گئے

"من پس از صلح برائے حصول سعادت درگاہ فلک اشتباہ خواجہ بزرگ رفتم"

مؤلف نے میر کے صرف ایک لڑکے کا ذکر کیا ہے ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے مرزا عسکری عرف کلو عرش، دوسرے میر فیض علی خان فیض ان کے کچھ شعر بھی تذکروں میں ملتے ہیں ایک تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کی صاحبزادی بھی شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص تھا۔

مولف نے صرف سالِ وفات لکھنے پر قناعت کی ہے تاریخ نہیں بتائی۔ ہم اس کمی کو پوری کیے دیتے ہیں میر صاحب ربیع الثانی کے مہینے میں بستر علالت پر گرے زمانۂ مرض الموت طویل تھا چھ ماہ بیمار رہے آخر سنبھل نہ سکے اور جمعہ کے روز ۲۰ ماہ شعبان کو شام کے وقت ۹۰ برس کی عمر میں لکھنؤ کے محلہ سٹی میں داعی حق کو لبیک کہا اور بروز شنبہ ۲۱ ماہ شعبان بوقت دوپہر اکھاڑہ بھیم میں دفن

کے پاس چند کتابیں ہیں جن کی مدد سے ایک رات میں بیٹھ کر پوری کتاب مرتب کر ڈالی گئی ہے۔ عزیز الدین بلخی کے تذکرے سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا گیا ہے میر کے معاصرین پر جو حصہ لکھا ہے اس میں رکن الدین عشق، ... قلی خاں حسرت، میر محمد باقر حزیں، کے حالات میں بعض مقامات پر جملے کا جملہ اور سطر کی سطر وہیں سے ماخوذ ہے۔ اشعار بڑی بے پروائی سے نقل کئے گئے ہیں اکثر مقامات پر تصحیف اور دوسرے اغلاط موجود ہیں۔ ایسی علمی کتاب کے لیے جس پائے کی زبان اختیار کرنی چاہیے تھی اس کا بھی فقدان ہے لیکن سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کتاب تحقیقی طور پر پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اور یہ کتاب کا کمزور ترین حصہ ہے ان صفحات میں کتاب کے سارے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، صرف تحقیقی نقطۂ نظر سے کتاب کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کے سارے اغلاط کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی اہم بات لکھنے سے رہ نہ جائے۔

مؤلف نے میر کی ولادت کا ۱۱۳۷ھ بتایا ہے یہ صحیح نہیں میر کے سال ولادت میں اختلاف ہے زمانۂ حال کے اکثر تذکرہ نگاروں نے ۱۱۳۰ھ سال ولادت بتایا ہے سر شاہ سلیمان بعض قرائن کی بناء پر ۱۱۳۶ھ کو انسب سمجھتے ہیں لیکن اب میر سے متعلق کچھ نئی تحقیقات ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سال ولادت ۱۱۳۵ھ ہے ان کے والد کا نام میر علی متقی بتایا ہے تعجب ہے کہ ذکر میر کی اشاعت کے بعد بھی مؤلف نے یہ غلطی کی ہے۔ خود میر لکھتے ہیں۔

"خواجہ محمد باسط کہ برادر زادہ صمصام الدولہ امیر الامرا بود شفایتے بحال من کرد وپیش نواب برد۔ چوں مرا دید پرسید ایں پسر کیست؟ گفت از میر محمد علی است" (ذکر میر صفحہ ۶۲)

نثار کا نام میر عبداللہ نہیں، میر عبد الرسول ہے۔ ان کے نام ... میں بڑا فرق ہے۔ دیکھیے مصحفی کا تذکرۂ ہندی صفحہ ۲۵۳، نثار کا مجموعۂ نغز ۱۹۵، قائم کا مخزن نکات صفحہ ۶۲، شفیق کا چمنستان شعرا صفحہ ۲۱۴، خلیل کا گلزار ابراہیم صفحہ ۲۴۹۔ حد یہ ہے کہ خود میر بھی یہی لکھتے ہیں، دیکھیے نکات الشعراء صفحہ ۱۴۳۔ میر کے حالات لکھنا اور نکات الشعراء سے مشورہ نہ لینا بڑی جسارت کا کام ہے۔

مرزا آغا حسین برشتہ لکھنوی کو جلوۂ خضر کے حوالے سے میر کا شاگرد لکھا ہے۔ جلوۂ خضر مستند تذکرہ نہیں جب تک کہ کسی معاصر تذکرے سے اس کا ثبوت نہ ملے میر کی شاگردی مسلّم نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں ہم مؤلف کو ریاض الفصحا دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مصحفی کا بیان ہے کہ برشتہ سودا کے شاگرد تھے[1]

یہی حال باقر علی حشمت کا ہے، کوئی معاصر تذکرہ نگار انھیں میر کا شاگرد نہیں بتاتا، جلوۂ خضر کا بیان قابل اعتماد نہیں۔ حشمت کا ذکر مصحفی کے تذکرے میں موجود ہے انھوں نے بھی میر کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نثار کا نام محمد اکرام نہیں محمد اکرم ہے دیکھیے تذکرۂ مصحفی صفحہ ۲۵۳، گلزار ابراہیم صفحہ ۲۴۹۔

شیخ ابن امام کی شاگردی میر کے بارے میں مؤلف نے ایک غیر مطبوعہ گیا ہے تذکرے سے بہت کمزور لفظوں پر اعتماد کیا ہے کہ شوق کا بیان ہے کہ انھوں نے بھی میر سے اصلاح لی ہے۔ ہم حیرت میں ہیں کہ نکات الشعراء چھوڑ کر اس قدر دور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ خود میر کا بیان ہے "مشق شعر از مرزا رفیع می کند قبل ازیں با فقیر نیز مشورت شعری کرد"[2] ہمارا خیال ہے مؤلف نے سرور کا تذکرہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، ان کا بیان گل رعنا سے ماخوذ ہے۔ مصحفی عظیم آبادی

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ ۵۵ [2] نکات الشعراء صفحہ ۱۴۳

کیے گئے، ان کا مزار جس باغ میں تھا وہ اکھاڑہ بھیم میں اپنے اقربا کے ساتھ دفن ہیں

میر کو واسوخت کا موجد لکھا ہے۔ نہیں میر سے پہلے آبرو کا واسوخت موجود ہے آبرو میر سے مقدم ہیں۔ میر کا سال وفات ۱۲۲۵ھ ہے اور آبرو کا صحیح قول کی بنا پر ۱۱۴۷ھ دونوں میں ۸۰ برس کے قریب کا فرق ہے۔ مثنویوں کی فہرست بھی ناقص ہے مصنف نے ان کی ۱۱ مثنویوں کا ذکر کیا ہے اٹھارہ مثنویوں کا ذکر تو آزاد نے کیا ہے سرشتہ نے ان کی ۲۳ مثنویوں کا انتخاب چھاپا ہے ان کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ میر کی مثنویوں میں کوئی مافوق العادت عنصر کارفرما نہیں اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے "بقول خود" اپنے حافظہ پر اعتبار کیا ہے۔

مرتب کا کہنا ہے کہ میر نے مرثیے لغرض ثواب لکھے اور اسی لیے ان میں مرثیہ گویوں کی خوش اسلوبی نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کے پیش نظر ابھی تک کلیات میر کے قدیم نسخے ہیں میر کے دوسرے جدید مرثیوں کی دریافت کی شاید انھیں خبر نہیں اور پھر وہ خوش اسلوبی سے معلوم نہیں کیا مراد لیتے ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ میر کے یہاں انیس جیسی زبان اور انداز ہو۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ بقول سودا میر کے مرثیے شاعرانہ حیثیت سے بہت پست ہیں۔ ہم نہایت ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ مؤلف کو سودا کا یہ قول کہاں سے ملا؟

مؤلف نے "تلامذہ میر" کے عنوان سے میر کے چند تلامذہ کا حال لکھا ہے۔ اول تو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر ضرورت سمجھی گئی تھی تو فہرست کو مکمل اور صحیح بنانے کی کوشش کرنی تھی۔ فہرست بالکل غیر مکمل ہے۔ میر کے بعض تلامذہ کا قطعاً ذکر نہیں اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جو درحقیقت میر کے شاگرد نہ تھے۔ بعض شعراء کے جو ترجمے لکھے ہیں وہ حد درجہ ناقص ہیں بہت سی اہم باتوں کا قطعاً ذکر نہیں کیا ہے ان کا یہ مختصر سا بیان بھی اغلاط سے بھرا پڑا ہے۔

سال فوت راسخ معجز بیاں — گفت ہاتف راسخ شیوا بیان

ایک دوسری تاریخ لکھی ہی

بہر تاریخ وفات راسخ — ساکن باغ جناں بر گفتم

راسخ عظیم آبادی کے ایک شاگرد ہیں انور علی یاس آروی ان کا دیوان فارسی و اردو کمیاب ہے دیوان میں یاس کے چند قطعات ہمیں ملے ہیں جو انھوں نے شیخ کی وفات پر لکھے ہیں:

ز دنیا شیخ من راسخ تخلص — سفر کرد و دل من گشت مغموم
تو گوئی شعر گوئی بذلہ سنجی — بفوتش از جہاں گردید معدوم
ورودش معدن انوار مخفی — دل او مخزن اسرار مکتوم
چو خواہم یاس تاریخ وفاتش — بگو با دل حساب "شیخ مرحوم"

"شیخ مرحوم" کے اعداد ۱۲۰۴ ہوتے ہیں اس میں "دل" کے اعداد ۳۴ ملا لیجئے ۱۲۳۸ ہو جائیں گے۔

ز دنیا راسخ رنگیں طبیعت — بہار آرائی گلزار جناں شد
بہ فوت اک گل باغ تقدس — بہ دل صد خار درد و غم نہاں شد
پئے سال وفاتش ہاتف غیب — بگفتا آہ "راسخ از جہاں شد"

بہ جنت رفت از دنیا چو راسخ — بہ فن شعر ملجا و ملاذم
ہو دم فکر تاریخ وفاتش — دل من گفت "ہے ہے اوستادم"

ان تمام قطعات سے ثابت ہوگیا کہ راسخ کا سال وفات ۱۲۳۸ھ ہی جیسا کہ دتاسی اور بیل نے لکھا ہی نہ ۱۲۳۹ھ ہی مؤلف نے تاریخ وفات ۲۲ جمادی الآخر لکھی ہی "تاریخ اور ماہ دونوں غلط ہیں اب رہا یہ کہ ان کا انتقال کب اور کس

نے بھی انھیں شاگرد سودا لکھا ہے ان کا بیان ہے:

"راقم تخلص، اسمش مندرا بن، مرد ہندوئے کوتاہ قامت از قوم کھتریاں است اشعار ریختہ خود از نظر مرزا رفیع سودا تخلص می گزرانید و در تصنیف کردن مخمس مہارتے داشت"

مؤلف نے شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کا سال ولادت ۱۱۶۲ھ لکھا ہے۔ یہ شاد عظیم آبادی کا بیان ہے جو قابلِ قبول نہیں اور قرائن اس کے خلاف شاہد ہیں اسی طرح ان کا مولد سائیں ہونا بھی متحقق نہیں۔ مؤلف نے راسخ کا سال وفات گارساں دتاسی کے حوالے سے ۱۸۲۱ء لکھا ہے یہ صحیح نہیں شیخ کے سال وفات میں اختلاف ہے اب تک حسب ذیل اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں:

(الف) ۱۲۳۶ھ یہ قول ناظر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی کا ہے

(ب) ۱۲۳۸ھ یہ شیفتہ اور نساخ کا بیان ہے

(ج) ۱۲۴۱ھ یہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کا قول ہے، انگریز قاموس نگار بیل نے بھی یہی لکھا ہے۔

پہلا قول ۱۲۳۶ھ ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہو سکتا ۱۲۳۶ھ کی عبرتی سے پہلے کوئی سند نہیں ملتی۔ ۱۲۴۱ھ دتاسی سے پہلے کسی نے نہیں لکھا ہے۔ بعد کے کچھ تذکرہ نگار دھوکے میں آ گئے اور انھوں نے سال وفات راسخ ۱۲۴۱ھ ہی بتایا ہے صحیح ۱۲۳۸ھ ہے، ہمارے دلائل یہ ہیں:

(۱) مصنف گلشن بے خار نے یہی لکھا ہے، نساخ بھی اس کی تائید کرتے ہیں نساخ نے تذکرے کے علاوہ ایک رسالہ "گنج تواریخ" لکھا ہے جس میں تمام بڑے لوگوں کے سنین وفات دیے ہیں راسخ کے سال وفات پر بھی انھوں نے دو قطعے لکھے ہیں؎

"پدر او مرزا جان نام داشت، از فرط شفقت مرزا جان جاناں
می گفت، ازیں سبب بہ ہمیں اسم موسوم گشت"

پھر صفحہ ۳۰۸ پر انعام اللہ یقین کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

"نام مرزا جانِ جاناں است، و شاعر جان جاناں لبعضے اکثر عوام
نام مرزا را از غلطی جان جاناں می گویند"

قاسم لکھتا ہے:-

"اینچہ از زبانش مسموع است، آن ست کہ نام اصلی جان جاناں
ست چہ والدش محمد جان نام داشت، نظر براں جان جان موسوم
گردانیدہ" (صفحہ ۳۵۵)

شفیق کا بیان ہے:-

"نام والد ماجد او مرزا جان است ازیں جا وجہ تسمیہ او توان
دریافت"

اثناء ترتیب تذکرہ، شفیق نے مظہر سے ان کا ترجمہ مانگا۔ مرزا ترجمۂ خود
بہ تحریر آورد۔ "فقیر جان جان متخلص بہ مظہر"

خود مرزا کے ایک شعر سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے ؎

کوئی آزاد کرتا ہے سمجھ اپنے کو ہر ظالم   یہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ مظہر، مالوہ میں پیدا ہوئے۔ گردیزی کا بیان ہے
کہ وہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے (صفحہ ۱۳۱) تاسی اور بیل نے بھی یہی لکھا ہے، خود
مظہر نے "نشو و نما در بلدہ اکبر آباد یافتہ" لکھا ہے۔ اسی طرح مظہر کا سال وفات
۱۱۹۴ھ نہیں ۱۱۹۵ھ ہے، سودا اور قمر الدین منت کے قطعات تواریخ اس کے
مؤید ہیں۔

عقد ثریا یعنی تذکرہ فارسی ۱۱۹۹ میں مرتب ہوا "زہے باغ صفا" مادہ تاریخ ہے لیکن وہ اس کے بعد بھی اضافے کرتے رہے چنانچہ مضطر کا حال ۱۲۱۳ میں لکھا گیا ہے۔ سال تالیف سے مصحفی کی مراد ۱۱۹۹ ہے اس بنا پر تذکرہ ہندی کا سال آغاز ۱۱۹۹ یا اس کے کچھ بعد قرار دینا چاہیے یہ تو ہوا سال آغاز سال تکمیل ۱۲۰۹ ہے معلوم ہوا کہ قائم کی وفات ۱۲۰۹ سے بھی پہلے ہو چکی تھی سال وفات قائم میں اختلافات ہیں علی ابراہیم خلیل عظیم آبادی۔ لطف، فیلن اور کریم الدین نے ۱۲۱۰ بتایا ہے دناسی ۱۲۰۷، بلوم ہارٹ انگریز فہرست نگار ۱۲۰۲، لیکن صحیح ۱۲۰۸ ہے ثبوت میں ایک اہم معاصر جرات کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔ جرات نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات

یکتائی کے ساتھ

قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی

کیا کیجے اب آہ!

مؤلف، خواجہ احسن اللہ بیان کا سال وفات ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ قاسم ۱۲۲۱ھ میں ان کا ذکر ایک زندہ آدمی کی حیثیت سے کرتے ہیں اور آخر میں "سلمہ الرحمٰن" لکھتے ہیں اور ان کی زندگی کی سلامتی کی دعا مانگتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ کم از کم ۱۲۲۱ھ تک ضرور زندہ تھے

مؤلف نے سوز کا ولادت ۱۱۴۳ھ لکھا ہے ہم پوچھتے ہیں ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ سوز کا سال ولادت آج تک متحقق نہیں ہو سکا ہے بعض ۱۱۳۳ بتاتے ہیں۔ سوز کے معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کا سال ولادت نہیں لکھا ہے۔ آزاد اور ناصر نے لکھا ہے کہ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ دونوں سوز کے معاصر نہیں بلکہ بہت بعد کے ہیں اب رہا

احسن اللہ خاں بیان دلی میں نہیں پیدا ہوئے جیسا مؤلف نے لکھا ہے شفیق کا بیان ہے اکبر آباد مولد ہے (صفحہ۳۵) گردیزی کا بھی یہی کہنا ہے (صفحہ ۲۷) مرزا علی لطف اور علی ابراہیم خاں نے لکھا ہے کہ دہلی میں سکونت اختیار کی لیکن متوطن اکبر آباد تھے (گلشن ہند صفحہ ۶۵) مؤلف نے قائم کا نام قیام الدین علی لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔ میر نکات الشعرا میں۔ حسن تذکرہ اردو میں محمد قائم لکھتے ہیں۔ علی ابراہیم خلیل عظیم آبادی نے گلزار ابراہیم صفحہ (۱۹۱) میں اور مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں (صفحہ ۱۳۳) یہی لکھا ہے۔ مصحفی اور حکیم قاسم قیام الدین علی بتاتے ہیں۔ (تذکرہ ہندی صفحہ ۱۷۹، مجموعہ نغز صفحہ ۱۳۳) گردیزی محمد قائم لکھتا ہے کمال اور گارساں دتاسی قائم الدین بتاتے ہیں، صحیح یہ ہے کہ ان کا نام محمد قیام الدین تھا، اور دلائل کو محفوظ رکھتے ہوئے ہم صرف ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔ قائم خود اپنے تذکرے کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔

"فقیر مؤلف محمد قیام الدین قائم بعد کوشش بسیار......"

ظاہر ہے کہ اپنا نام جتنا نام والا جان سکتا ہے دوسرا نہیں جان سکتا۔ مؤلف کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ قائم کا سال وفات ۱۲۱۰ھ ہے اس لیے کہ مصحفی کے تذکرہ ہندی میں ان کی وفات کا ذکر موجود ہے۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کی ابتدا تذکرہ فارسی کی تکمیل کے بعد ہوئی۔

"چوں ایں فقیر از تدوین دیوان فارسی و ہندی و تالیف تذکرہ فارسی فراغت حاصل کردہ ہم تالیف تذکرہ ہندی درپیش آمد"[1]

[1] دیباچہ تذکرہ ہندی صفحہ ۳

یہ غزل جیسا کہ قائم کا بیان ہے ۱۱۵۲ میں لکھی گئی۔ یقین کے سال وفات کا ہمیں علم نہیں سال وفات پر بھی بہت سے تذکرے خاموش ہیں علی ابراہیم خاں خال عظیم آبادی، ناسخ اور دتاسی نے صرف یہ لکھنے پر قناعت کی ہے کہ احمد شاہ کے زمانے میں مرے۔ احمد شاہ کا زمانہ ۱۱۶۱ سے شروع ہو کر ۱۱۶۷ پر ختم ہو جاتا ہے۔ انگریز قاموس نگار ریل، سال وفات ۱۱۶۳ بتاتا ہے، مرزا جعفر علی نشتر ۱۲۰۴ لکھتے ہیں جو صریحاً غلط ہے۔ پہلے بیانات بھی زیادہ صحیح نہیں، اس لیے کہ میر، قائم گردیزی تینوں کے تذکرے عہد احمد شاہ میں لکھے گئے۔ یہ تینوں وفات یقین سے متعلق کچھ نہیں کہتے بلکہ گردیزی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین ۱۱۶۵ تک ضرور زندہ تھے۔ مصاحب پہلا تذکرہ نگار ہے جو یقین کی موت کی خبر دیتا ہے وہ اس سے متاثر ہو کر قطعہ وفات بھی لکھتا ہے۔ جس سے ۱۱۶۹ مستخرج ہوتا ہے ہمارے پاس یہ ماننے کے لیے کافی ثبوت ہیں کہ مصاحب کا علم بالکل صحیح ہے اس لیے کہ اس کی اس اطلاع کے ذرائع سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ سال وفات یقین ۱۱۶۹ مان کر اگر بہ قول مرتب ۲۵ سال ان کی عمر کے نکال دئے جائیں تو ۱۱۴۴ ہو جاتے ہیں کیا مرتب کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ۸ سال کا بچہ ایسی غزل کہہ سکتا ہے اور قائم جیسا جگت استاد ایک بچہ کی غزل پر غزل کہے گا۔ ذیل میں یقین کی غزل درج کی جاتی ہے کیا ۸ سال کی عمر کا کوئی بچہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے؟

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں　　تری فریاد رس شاید مری فریاد کو پہنچے

ہمیں اس غم کے ہاتھوں زندگانی خوش نہیں آتی　　کوئی بیدادگر یا رب ہماری داد کو پہنچے

بہار آئی ہے جب سے تب سے رنگ بھی تھم نہیں سکتا　　دعا اس مشت خوں کی نشتر فصاد کو پہنچے

یقین تقلید میں سرمست ٹیک پتھر پہ آ لیں کر　　یہ ممکن ہی نہیں ہر سر، سر فرہاد کو پہنچے[1]

[1] مقدمہ دیوان یقین صفحہ ۱۹

کہ سال ولادت واقعی کیا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ موجودہ مواد کی بنا پر
تیقن کے ساتھ کچھ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

بیدار کا نام میر محمد بتایا ہے۔ مصحفی نے میر محمد علی لکھا ہے[۱]، یہی صحیح ہے لیکن یہ میر
محمدی کے نام سے مشہور تھے۔

مؤلف نے مصحفی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انعام اللہ خاں یقین ۲۵ برس
کے سن میں مرے" بعض دوسرے تذکرے اس سے زیادہ عمر بتاتے ہیں۔ شفیق
نے لکھا ہے کہ ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ صحیح یہ ہے کہ اُن کی عمر ۲۹ سال
سے کسی طرح کم نہ تھی یہ غلطی مصحفی کے علاوہ دتاسی، کریم الدین، گراہم بیلی
صاحبِ گلِ رعنا، مؤلفِ سخن شعرا سے بھی ہوئی ہے۔ شفیق نے حکیم بیگ خاں حاتم
کی زبانی لکھا ہے کہ یقین کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی۔ یہ روایت زیادہ
صحیح ہے بہ نسبت اور روایتوں کے کہ اس کا راوی خود دلّی میں یقین سے
مل چکا تھا اور وہ اس سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ اس کے علاوہ بھی
بعض باتیں ایسی ہیں جن سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ دیوان حاتم
کی ترتیب یوں ہے کہ ہر غزل پر تاریخ کتابت دے کر یہ لکھ دیا گیا ہے کہ یہ
غزل کس کی غزل پر لکھی گئی ہے۔ چنانچہ دیوان حاتم میں ۸ غزلیں ایسی
ملتی ہیں جو یقین کے طرز پر لکھی گئی ہیں۔ حاتم کی یہ غزل ع

خدا کے واسطے کوئی مری فریاد کو پہنچے

یقین کی اس غزل پر لکھی گئی ہے:

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے وصیت ہے ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

---

[۱] صفحہ ۱۳

لکھی ہے جب بصارت بھی جواب دے چکی تھی۔ پوری مثنوی انھوں نے املا کرائی ہے کلیان سنگھ نے زبان کے متعلق دعوی کیا ہے:-

یہ شعرائے دہلی کی گفتار ہے　　　کہ سن اس کو طوطی شکربار ہے

یہ مثنوی انھوں نے ۸۰ برس کی عمر میں لکھی تھی اس کی تکمیل ۱۵ شعبان المعظم ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۶ء بروز سہ شنبہ کو بنگالے میں ہوئی۔

(۲) مثنوی زیبا: یہ فارسی مثنوی انھوں نے ۷۶ سال کی عمر میں کنور حشمت علی کے لیے لکھی تھی میری نظر سے جو نسخہ گزرا ہے وہ کلکتہ میں ۱۲۳۱ھ میں لکھا گیا ہے

(۳) دیوان قصائد فارسی: یہ دو جلدوں میں ہے یہ قصائد تمام کے تمام سرور کائنات فاطمۃ الزہرہ اور دوازدہ امام کی شان میں لکھے گئے ہیں، قصائد کی زبان اچھی ہے جو نسخہ میری نظر سے گزرا ہے وہ دنیا کا واحد نسخہ ہے۔

(۴) خلاصۃ التواریخ: یہ کلیان سنگھ کی بہترین تصنیف کہی جا سکتی ہے مغلوں کے آخری عہد کی اور بنگال کے گورنروں کی بہترین تاریخ ہے۔

مرتب کا خیال ہے کہ "مرزا محمد علی فدوی عظیم آبادی ۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی" اس چھوٹے سے جملے میں دو غلطیاں ہیں، فدوی ۱۱۹۰ھ سے پہلے ہی عظیم آباد آ چکے تھے۔ اب رہا سکونت کا سوال وہ عظیم آباد میں کچھ دنوں رہے تھے ضرور لیکن جیسا کہ میر حسن نے لکھا ہے وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھے کبھی عظیم آباد رہے کبھی مرشد آباد اور کبھی فیض آباد

"مزاج او یک جا قرار نمی کند، گاہے در عظیم آباد گاہے در مرشد آباد گاہے بہ فیض آباد می ماند والحال (۱۱۸۸ھ، ۱۱۹۰ھ) شنیدہ ام کہ در بنگالہ بسر می برد[۱]"

---

[۱] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۴۸

مرتب ہدایت دہلوی کا سال وفات ۱۲۱۵ھ سمجھتے ہیں کریم الدین اور گارساں دتاسی نے بھی یہی لکھا ہے لیکن دتاسی ایک بے پروا تذکرہ نگار ہے اور کریم الدین کا بیان ظاہر ہے کہ دتاسی ہی سے ماخوذ ہے بعض تذکرے ۱۲۱۱ھ اور ۱۲۱۹ھ بتاتے ہیں صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، سردست ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ۱۲۲۱ھ سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ قاسم کا بیان ہے:

"از چندے دل از جہانِ فانی برکندہ بہ سرائے جاودانی رحل اقامت انگندہ خدایش رحمت کناد و بہ جوار عنایات مسکن دہاد"

یہ معلوم رہے کہ قاسم کے تذکرے کا سال تالیف ۱۲۲۱ھ ہے۔

الم کا سال وفات ۱۲۱۵ھ لکھنا فاحش غلطی ہے مجموعۂ نغز کے مصنف ۱۲۲۱ھ میں "سلمہ ربہ" لکھتے ہیں[1] اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ کم از کم ۱۲۲۱ھ تک ضرور زندہ تھے خورشید بلگرامی کا سال ولادت ۱۱۹۵ھ اور سال وفات ۱۲۰۱ھ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی اردو دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔ کیا مرتب سمجھتے ہیں کہ ایک چھ برس کا لڑکا اردو اور فارسی میں شعر کہہ سکتا ہے۔

شورش عظیم آبادی کا نام غلام حسین خاں نہیں تھا ان کا تعلق سادات سے تھا عشقی عظیم آبادی نے انھیں سید لکھا ہے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق نے ۳۰ سال کی عمر میں ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا اور نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی تصانیف سے صرف ایک دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی کی مندرجہ ذیل تصانیف کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے ——

(۱) مثنوی : یہ ایک صاف شستہ اردو کی مثنوی ہے جو سحر البیان کے طرز پر لکھی گئی ہے، اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار ہے۔ یہ مثنوی اس نے آخر زمانے میں

---

[1] مجموعہ نغز صفحہ ۱۳

منظومات

فراق گورکھپوری

تلاشِ حیات

اہلِ ہند کے نام سالِ نو ۱۹۴۸ء کا پیام

مہر کے گرد یہ زمیں
کر چکی اک طواف اور
قلبِ زماں مکاں میں آج
پڑ گئی اک شگاف اور

جان فضا میں پڑ چلی
سینوں سے وہ اٹھا دھواں
رات کٹی، سحر ہوئی
دوڑیں رگوں میں بجلیاں

گنگ و جمن نے کروٹیں
بدلیں چمکتے درد سے
ہلتی ہیں رات کی لٹیں
موج ہوائے سرد سے

جن پہ گراں جمود تھا
ذرّے وہ تلملا اٹھے
جھوم کے چل پڑی ہوا
غنچے بھی مسکرا اُٹھے

ایک چھپی ہوئی لکیر
شرق سے دے رہی ہے لو
کانپتے ہیں کرن کے تیر
چرخ پہ پھٹ رہی ہے پو

خواب سے آبشاروں نے
چونک کے آنکھیں کھول دیں
چشمے اچھل اچھل پڑے
نہریں ابل ابل پڑیں

شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی کا سال وفات ۱۲۰۳ھ لکھا ہے مولف نے "یہ تاریخ شعرائے بہار" سے نقل کیا ہے ہم اس کے عدم صحت پر مصر نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جس قطعۂ تاریخ سے عشق کا سال وفات ۱۲۰۳ھ ثابت کیا جاتا ہے اس سے اس کے خلاف مستخرج ہوتا ہے قطعے کا آخری شعر یہ ہے ؎

گفت فدوی سال تاریخ وفات ۔۔۔ ہادی ما شاہ رکن الدین عشق

مولف کا کہنا ہے کہ "تذکرۃ الصالحین میں ہے کہ ۲۲ سال کی عمر پائی" اس کتاب میں اس کے خلاف لکھا ہے "عشق ۱۱۰۳ھ میں پیدا ہوئے" صفحہ ۱۲ "ایک سو برس کی عمر میں وصال ہوا" صفحہ ۲۵ ہم حیرت میں ہیں کہ مولف نے اتنی غیر ذمہ دارانہ بات کیسے لکھ دی، مولف فرماتے ہیں کہ عشق کے دیوان اردو کا ایک قلمی نسخہ پیرس میں گارساں دتاسی کے پاس تھا کلیات عشق کے لیے سات سمندر پار جانے کی ضرورت نہیں تھی اس کے متعدد نسخے کتب خانہ خانقاہ "تکیہ عشق" کتب خانہ خانقاہ پھلواری شریف اور کتب خانہ خدا بخش میں موجود ہیں اس کے علاوہ بھی اس کے نسخے ملتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا انتخاب انجمن ترقی اردو پٹنہ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو؟ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود خود ایک اجالا تھا یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیتے ہو؟ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا بجلیاں کڑکیں تو ان پر مسکرا دیے بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا آندھیاں اٹھیں تو ان سے کہا تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔

یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

(ابوالکلام)

تم جو ہوں رحمتیں کہ تم
خاک بھی ہو کے پاک ہو

دیکھئے کاروانوں کو
آتی ہیں کہ وہ منزلیں
چہرہ رخ سے بدگمانوں کو
اپنے جہاں پتے ملیں

سینے میں آگ ہاتھ میں
لے کے نشانِ دوجہاں
کون و مکاں ہیں ساتھ میں
بڑھتا چلا ہی کارواں

منزلیں کاٹتے چلو
راہ رَو بڑھے چلو
نعرہ ملب بڑھے چلو
رقص کناں چلے چلو
کھوئی نہ ہو رہِ وفا
جو بھی پڑے سہے چلو
آنکھوں میں کاٹتا ہی رات
جگ بیتی کہے چلو

ہوش چھٹا تو غم نہیں
جھومتے جھامتے چلو
جیب سکون و صبر کو
پھاڑے چلو سئے چلو
پھول نہیں تو داغوں سے
دامن دل بھرے چلو
تاروں کو چھیڑتے بڑھو
خاک بھی چھانتے چلو
موت ملے جو راہ میں
موت کو بھی لیے چلو
اٹھو بڑو آندھیوں کی طرح
سینہ تنا بڑھے چلو
دل نہیں تم کہ بیٹھ جاؤ
درد ہو تم اٹھے چلو
آب خضر ہی بوند بوند
جام اجل پئے چلو
اپنے ہی دل کی آگ میں
ڈوبتے تیرتے چلو

تلوؤں سے ٹھنڈی دھرتی کو
آنچ سی کچھ دئے چلو

سو گئی تھی پڑے پڑے
جیسے ہو ماتی نیند کی
خواب گراں سے موت کے
جاگ اٹھی ہے زندگی

تم کو بلا رہی ہیں آج
سازِ حیات کی صدائیں
تم کو سنا رہی ہیں آج

ہند کے گھونگھٹوں کے تلے
ہندی کی دہکی آگ ہے
صبح کی مانگ کے ماتھے پر
آج نیا سہاگ ہے

پوچھو نہ اہلِ کارواں
اگلا کہاں پڑاؤ ہے
ہوں گے نہ جانے کل کہاں
آج تو چل چلاؤ ہے

آج وطن کے نونہال
پھر سے ہیں مائلِ سفر
آنکھوں میں ہیں وہ ماہ و سال
عید ہے جن سے بے خبر

سوچو نہ جی میں یہ کہیں
چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں
زیر ... درخت میں
چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں

اٹھ پڑے ہو تو اہلِ ہند
بڑھتے ہی رہنا کام ہے
کوئی نہ ہو رہ حیات
تم سے یہی پیام ہے

نام مقام کا نہ لو
بڑھتے ہی جاؤ صبح شام
نام قیام کا نہ لو
تم ہو مسافرِ دوام

نیلے گگن کی چوٹیاں

یاد رہے کہتے ہیں کہ تم
شہ کی زندہ خاک ہو

حیات ڈھونڈتے چلو

صدائے صلح و جنگ میں سکوت خاک و سنگ میں
جہانِ رنگ رنگ میں امنگ میں ترنگ میں
جوانیوں کی آگ میں محبتوں کے راگ میں
لگاؤ اور لاگ میں حسینوں کے سہاگ میں
شفق شفق جمال میں اڑے اڑے گلال میں
فراق میں وصال میں طواف ماہ و سال میں
جھکی پلک کی چھاؤں میں
رسیلی نرم اداؤں میں
خنک خنک ہواؤں میں ستاروں کی سبھاؤں میں
دھواں دھواں گھٹاؤں میں گھلی گھلی فضاؤں میں
اندھیری گھپ گپھاؤں میں جو ڈس لیں ان بلاؤں میں
حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو
افق افق جبینوں میں
چراغ پاش سینوں میں
چمن چمن [illegible] میں [illegible] ان کے نازنینوں میں
دلوں کے آبگینوں میں جبیں کی نرم چینوں میں
زمین کے دفینوں میں دل فلک [illegible] کے کینوں میں
اندھیری کائناتوں میں
سیاہ پوش راتوں میں

راہ ۔۔۔ ر کے ذروں کو — اذنِ حیات دئے چلو
ہاں یوں ہی آنکھوں آنکھوں میں — مورت ۔ کو نوٹے چلو
کون و مکاں کی سرحدیں — توڑتے تاڑتے چلو
سوکھی ہیں زیست کی جڑیں — اشکوں سے سینچتے چلو
نخلِ مراد کو یوں ہی — آر ۔ حیات دئے چلو
چاند سے کیو ۔ ؛ رمز ِ ت — راز ۔ سے چھینتے چلو
موت کی ۔ ۔ نیند اچاٹ دو — د ۔ ۔ کی صدا دئے چلو

عمق میں بطن گیتی کے
حیا ۔ ۔ ڈھونڈتے چلو

مسل گیا ہے جس رخ راہیوں سے جو دل تپاں
ہنوز لو سی دے رہی ہیں تاروں کی بھی چٹکیاں

چمن چمن، عدن عدن — کلی کلی چمن چمن
بسوز عشق شعلہ زن — بساز حسن گل بدن
بہ مشک آہوئے ختن — بہ گیسوئے شکن شکن
بہ شیریں و بہ کوہ کن — بہ داستان نل دمن
بہ نرگس پیالہ زن — بروئے صاعقہ فگن
بہ ہر نفس و ہر سخن — بہ ہائے وہوئے ما و من
زمیں زمیں، زمن زمن — سفر ۔ ۔ ر، وطن وطن
بہ پیر ساز و بر ۔ شکن — بہ ذوق شیخ و برہمن
بہ حق بہ کفر شعلہ زن — بہ ہر خدا و اہرمن

حیا ۔ ۔ ڈھونڈتے چلو

جھکی نظر کی باتوں میں — اجل کی گھری گھاتوں میں
چھلکنے والے زہر میں — چڑھنے والی لہر میں
چھلکنے والے زہر اور چڑھنے والی لہر میں
ہر ایک جبر اور ڈھائے جانے والے قہر میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

شفق کے مسکرانے میں
سحر کے گنگنانے میں

صبا کے جھوم جانے میں — کلی کے رسمسانے میں
حیا کے رنگ لانے میں — کسی کے منہ چھپانے میں
فلک کے قہر ڈھانے میں — قیامتیں اٹھانے میں
سرشک ڈبڈبانے میں — دلوں کے بیٹھ جانے میں

سما کے نرم لوچ میں
شجر حجر کے سوچ میں

حیات ڈھونڈتے چلو — حیات ڈھونڈتے چلو

بہ مستی و بہ کیف و کم
بہ نشاط و صد الم

جہاں جہاں عدم عدم — جدا جدا بہم بہم
ارم ارم حرم حرم — خدا خدا صنم صنم
بصوت نغمہ دم بدم — بہ مد و جزر و زیر و بم
بہ خلوت و بہ جلوہ گہ — بہر ادا بہر نگہ

وہ پو پھٹی جبینِ چرخ کی وہ جگمگاہٹیں
وہ رسمساتے گلشنِ سحر کی لہلہاہٹیں
کچھ اودی اودی بدلیوں میں دھوپ کی وہ مسکراہٹیں
صبوحی ہی کے روئے لالہ گوں کی تمتماہٹیں
شگوفہ چھوڑتی جوانیوں کی اچپلاہٹیں
لبوں کی پنکھڑی پہ تاروں کی وہ جھلملاہٹیں
وہ مدھ میں ڈوبے سینوں کی رسیلی گنگناہٹیں
نگاہِ شرمسار کی کرن کی لپلپاہٹیں
ردائے روز و شب کی وہ خموش سرسراہٹیں
ہوائے انتظار کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں
چراغِ نظمِ کہنہ کی اداس ٹمٹماہٹیں
زمین کی تہوں میں زلزلوں کی گڑگڑاہٹیں
نظامِ کائنات کی رگوں کی [illegible] ہٹیں

جہاں فگن اجالے میں — اندھیرے میں اجالے میں
دہکتے آگ ہالے میں — جوانیوں کے ہالے میں
جبینوں کے اجالے میں — سیاہ لٹ کے کالے میں

کتھا کلی کے لوچ میں
کلائیوں کی موچ میں
فضا کی نرم سانس میں
ہر اک کھنکتی پھانس میں

لبوں نفع و زیاں
بدرو سعی رائیگاں

جمالِ مہ چکاں و عشوۂ ستارہ بار میں
سرکتے کھنچتے گھونگھٹوں میں شوخیٔ نگار میں
ادا ادا کے گرد سارے رنگ کی پھوار میں
امنڈتے سیلِ نغمہ کے سکونِ بے قرار میں
چڑھاؤ میں اتار میں نشے میں اور خمار میں
ہر ایک کارزار میں ہر ایک جیت ہار میں
حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

کلی کی چٹکیوں میں
سنبلِ چمن کے طرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو
دھڑکتے قلبِ قطرہ
اور سانس لیتے ذرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو
جہانِ عنصری کے
کاروبارِ روزمرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو[1]

بھری بھری گھٹاؤں میں فضا کی وہ اداہٹیں
ڈھلی ہوئی ہوائیں زلفِ شب کی سرسراہٹیں
سکوت میں کسی کے پائے نازکی وہ آہٹیں
گجر سے پہلے کائنات کی وہ کسمساہٹیں

---

[1] میں نے ان قافیوں کو یہاں جائز قرار دے لیا ہے (فراقؔ)

شعاعِ تیز و تند سے فضاؤں کے گداز میں ہوائے بادہ ساز میں
ہر اک کھنکتے ساز میں ہر انکشاف و راز میں حقیقت و مجاز میں
سمندروں کی تہ میں آسمانوں کے فراز میں ہر اک جہانِ راز میں
ہر اک غم اور شادی میں
فراق و وادی وادی میں
حیات ڈھونڈنے چلو
حیات ڈھونڈنے چلو

شجاع احمد زیبا

سہمے ستارے

لگا وہ تیشہ کہ منہ کھل گیا ہے جھرنوں کا — رگِ سحر سے لہو کی لکیر پھوٹی ہے
جبینِ عرش پہ ہے ازدہام کرنوں کا — افق پہ دور کہیں پھلجھڑی سی چھوٹی ہے

اندھیری رات مگر اب اندھیری رات کہاں — سمٹ رہا ہے اندھیرے کا بیکراں دامن
فلک پہ ہیں تو ستارے مگر وہ بات کہاں — خزاں کے خوف سے سہما ہوا ہو جیسے چمن

بقائے ذات کی خاطر ہے سب یہ جد و جہد — بقائے ذات کی کب تک کریں گے تاویلیں
نہ کوئی مونس و ہمدم نہ اب کسی کی مدد — سحر قریب ہے بجھنے لگی ہیں قندیلیں

قفس میں ہو گئے بیدار طائرانِ اسیر
الگ ہٹو کہ وہ بجنے لگا سحر کا نف

یہ ارض اور یہ آسماں — زماں زماں مکاں مکاں
برنگِ سیلِ کارواں — رواں دواں رواں دواں
شتابِ برق پا ہے انساں — تپاں تپاں دماں دماں
بسازِ قلبِ عاشقاں — بسوزِ سینۂ بتاں
بہ سرِ عیاں و ہر نہاں — یقیں یقیں گماں گماں
کششِ جہات و لامکاں — ادھر ادھر یہاں وہاں
بسازِ دل بسوزِ جاں — بہ نیک و بد یہ این و آں
بہر تپ و بہر نشاں — بہ ماندگاں و رفتگاں
بعزمِ عمرِ جاوداں — برزمِ مرگِ ناگہاں

دلوں کی دہکی آگ میں
جنوں کی مڑتی باگ میں
جوانیوں کی آہ میں
جمالِ بے پناہ میں
نگاہِ دل نواز میں
دلوں کے ساز باز میں

نگارِ بے نیاز کی ادائے دلنواز میں دلوں کے ساز باز میں
لجاتے مسکراتے آہوئے بہانہ ساز میں نگاہ نیم باز میں
صد انتشارِ غزنوی و گیسوئے ایاز میں نیاز اور ناز میں
نہ کٹنے والی ہجرِ یار کی شبِ دراز میں دلوں کے سوز و ساز میں
پلک کی اوٹ سے اشارۂ نگاہ ناز میں جنوں کی ترکتاز میں
جمالِ رنگ رنگ و نرگسِ کرشمہ ساز میں گناہ کے جواز میں

مگر یہ کون؟ یہ کس کی صدا سے چونک اٹھا ہوں
یہی تو ہے وہ سحر جس سے دور دور رہا ہوں
کہیں افق سے پکارا کسی نے لو وہ چلا ہوں
مجھے تو لرزش آہنگ کائنات بہت ہے

تغیرات کی بیباکی بھی عزیز ہے مجھ کو
نگاہِ ناز کی ہر بر ہمی عزیز ہے مجھ کو
یہ صبح، صبح قیامت بھی عزیز ہے مجھ کو
مرے جنوں کو بھی پاسِ تغیرات بہت ہے

مری نوا نے ستاروں کو تیز گام کیا ہے
مرے سکوں نے فرشتوں کو ہمکلام کیا ہے
مری وفا نے مشیّت کا احترام کیا ہے
نگاہ ہو تو جہاں تغیّر ہے

مری نگاہ سے بچ کر گزر رہا ہے اندھیرا
ہے میری روح میں شاید نئی سحر کا بسیرا
یہ خون دل ہے سرِ مژگاں بنے گا "سرخ سویرا"
یہ ہو سکا تو مجھے فرصت حیات بہت ہے

روش صدیقی

ابھی تو رات بہت ہے

عروس شب یونہی مجھکو، ابھی تو رات بہت ہے

علاج غم بھی نہیں کچھ، علاجِ غم بھی نہ ہو گا
یہ زہر کم بھی نہیں کچھ، یہ زہر کم بھی نہ ہو گا
مگر یہ لمحۂ شاداں کبھی بہم بھی نہ ہو گا

نشاطِ روح کا اتنا بھی التفات بہت ہے

خود آفتاب کے دل کا لہو بھی زرد ہے اب تک
متاعِ سینۂ مشرق شرار سرد ہے اب تک
رُخِ سحر پہ یہاں ظلمتوں کی گرد ہے اب تک

اگرچہ شورِ ہجومِ تجلیات بہت ہے

طلوعِ مہر سے بھی دل میں روشنی نہیں ہوتی
شفق بھی ساقیٔ صہبائے زندگی نہیں ہوتی
نگارِ صبح کے نغموں میں سرخوشی نہیں ہوتی

مگر یہ رات! یہ آرائش حیات بہت ہے

تنک تنک کے مچلتے ہیں مے کی بوندیں سب
ہر ایک لالہ و گل بن گیا ہے ساغرِ کیف

جواں قدم کبھی کھاتے نہیں ہیں اگر ٹھوکر
تو جیسے خواب کو کوئی جگا دے یکسر ٹھوکر
نظر کمند ستاروں پہ ڈالتی رہتی!
فلک پہ کھینچتے ہر دم یہ آرزو کی لکیر!

ستارے ان کی اُمنگوں سے کب ہیں بالا تر
ہلال ان کے ارادوں کا اک رکابِ زر
سمندِ شوق فلک میں بھی کھولتا ہے در
کہاں کہاں لئے جاتا ہے جذبۂ تسخیر!

وہ عشرتیں کہ دہن میں ہے تلخیٔ نبات
یہی دعا کہ خدایا نہ ختم ہو یہ رات
کبھو بھی چاند سے امواجِ نبض تیز کرے
فلک سے برسے جو مہتابیوں کا عیشِ کثیر

وہ ان کی پیار کی باتیں، شبک شبک سے سوال
گرانیٔ شبِ الفت گمان و وہم و خیال
جبیں پہ فکرِ حسیں نام کو ملے نہ کہیں
لہو زمیں کا یہ پی کر بنے ہیں بدرِ منیر

وہ مست، خود کو بھر آغوشِ وا میں جو کھو دیں
بھرا بھرا سا ہے جوبن تو کھوکھلی گودیں
نہ دل ہیں رس کی ہیں دھاریں نہ دودھ آنچل ہیں
ہے نامراد سی تسکیں کا شوق عالم گیر!

مسعود حسین

خوابِ سنگ

ابھی تو خواب گراں سے اُٹھے ہیں سنگِ گراں
کہ ہوگی سنگِ محبت پہ اک نئی تعمیر

ٹپک رہے ہیں جو اشکوں کے تارے آنکھوں سے
ابھی تو ٹپکیں گے لاکھوں شرارے آنکھوں سے
کوئی بتاؤ چمن والو ان کا حشر ذرا
یہ رنگ و بو کا ہجوم اور گلوں کا جسمِ غفیر

چمن چمن ہیں یہ نسرین و نسترن کے محل
بہار کھیلتی ہے ان میں آنکھ سے اوجھل
وہی بہار جو دولت زمیں کی سے بھاگی!
کہ رنگ و بو کی ہوئی خونِ سنگ سے تعمیر!

یہاں آرزو دیکھو تو کیاریاں ہیں
کہیں خیال نے پچکاریاں سی ماری ہیں
صبا کی گود میں مچلی ہوئی ہے نکہتِ گل
چھلک رہے ہیں کٹورے کہ دل ہے آتش گیر

کہیں وہ چہلیں، وہ آپس میں ہوتی رنگ رلیاں
گلوں نے چھیڑ دیا، مسکرا سی دیں کلیاں
وہ برگِ گل کی زبانی پیام حیرانی
کہ سن رہے سنگ بھی سن سن کر ان کی یہ تقریر

وہ ان کی نیم نگاہی وہ قہقہوں کی کھنک
ہر اک خیال کی گودی میں آرزو کی دھنک —

کسے خبر تھی کہ ہے اس نوا میں بھی بم و زیر

جواں لہو کی وہ پینگیں، وہ مست انگڑائی
وہ نخوتیں، وہ اذیت، خودی، خودآرائی
کمر کے دائرے آتے اُتر کے قدموں پہ
وفورِ رقص سے عالم تمام ان کا اسیر

وہ گرم گرم لہو، تیز تیز سی سانسیں
وہ بازوؤں کی پھڑک اور چبھی ہوئی پھانسیں
وہ ضبط اور طلب، انہدامِ لمسِ طویل!
فلک فلک! کہ ہے سارا جہان گرد و عبیر

پیو پیو بھی تو جام کچھ نہ رہنے پائے!
ادھر بھی ساقیٔ گلفام! کچھ نہ رہنے پائے!
مگر خمار! نہ ٹوٹیں گی کیا طنابِ حیات
زمیں سے کتنا اٹھاؤ گے عشرتوں کا خمیر؟

× × × × × × × ×
× × × × × × × ×

کسے خبر تھی کہ اتنے میں چشمِ سنگ کھلی
گلوں کے چاک ہیں سینے، قبائے تنگ کھلی
کلی کا ننھا سا منہ اور بھی نکل آیا!
بدل رہا ہے جہاں، ہل رہی ہے خود تقدیر!!

ابھی تو خوابِ گراں سے اُٹھے ہیں سنگ گراں
کہ ہو گی سنگِ محبت پہ اک نئی تعمیر!

وہ نرم آنچ بکھرے ان کے ریشمی آنچل
بدن کی رنگ ترنگ جن کی تہ میں ہے چنچل
وہ ٹھنڈے جسم کے سوتے ہوئے سے شیش محل
شباب جن میں مقید، خیال جن کا اسیر

اکہری زندگی جس میں کوئی نہ فکر و عمل
کبھی خیال میں ان کے کھلا نہ کوئی کنول
ہر ایک بند سے آزاد بندگانِ جمیل!
ذرا میں دشنہ و خنجر، ذرا میں شکر و شیر!

وہ طنطنے، وہ حقارت، وہ عشرتیں پیہم
یہ ریزۂ غمِ الفت کو جانتے ہیں الم
یہ سمجھے بیٹھے ہیں نقطہ کو اک محیطِ غم
کہ سنگ و خشت کے عالم کے یہ نہیں ہیں بصیر

ہے ان کی آنکھ بھی خودساختہ غموں سے نم
رگوں میں سرد لہو ہے کہو جیسے شبنم
تمام رہزنِ الفت مگر غریقِ غم
تلاش میں کوئی لا دے انھیں بھی جوئے شیر

ذخیرۂ زرِ گل لعل اور گہر کے ڈھیر
مروتوں میں بھی آجائے جن کے باعث پھیر
ہیں سیم و زر سے منقش محبتیں ان کی
یہ بوالہوس کبھی سمجھے بھی عشق کی تفسیر

انھوں نے سنگ سے کھینچا ہے رنگ و روپ نکھار
انھیں کی شعبدہ بازی نے یہ رچی ہے بہار
دبی دبی رہی صدیوں تلک لٹا کے زار

پنڈت جواہر لال نہرو
مسلم یونیورسٹی میں

آپ تقسیم اسناد کے لیے پنڈال تشریف لے جا رہے ہیں

اختر انصاری

ایک ستارہ

ایک طوفانی، بھیانک، سخت کالی رات ہے
دھر پہ چھائی ہوئی
کوئی ناگن جیسے بل کھائی ہوئی
موت جیسے سر پہ منڈلاتی ہوئی
دھر پہ چھائی ہوئی
روحِ انسانی کو لرزا دینے والی رات ہے

وسعتِ افلاک پر ہیں چارسُو چھائے ہوئے
بادلوں کے دَل کے دَل
جیسے بھوت آئیں بیاباں سے نکل
جیسے سایہ ڈال دے اپنا اجل
بادلوں کے دَل کے دَل
رفعتِ افلاک پر ہیں چارسُو چھائے ہوئے

ٹمٹماتا ہے فلک پر اس بھیانک رات میں
اک ستارہ ہائے ہائے
ایک ننھا سا شرارہ ہائے ہائے
ایک نازک برق پارہ ہائے ہائے
اک ستارہ ہائے ہائے
جھلملاتا ہے فلک پر اس بھیانک رات میں

دیکھنا یارو! یہ کم تقوں کا سہارا تو نہیں
یہ ستارہ اپنی قسمت کا ستارہ تو نہیں

خورشیدالاسلام

"سہرے"

رباب کا سا تموّج، ستار کی سی لے
کہیں کہیں وہ چھلکتا ہوا پیالۂ مے
کوئی ڈھلی ہوئی دھوپ اور کھنچی ہوئی تلوار
کوئی تلاطمِ دریا، کوئی نسیم بہار
کوئی وہ موسمِ سرما کی چاندنی کم کم
کوئی وہ رقصِ جواں ناتمام اور پیہم
کوئی حجاب درونِ حجاب و پردۂ ساز
کوئی تمام تکلم، کوئی فقط اک راز
کوئی وہ موجِ رمیدہ جسے خمار کہیں
کوئی وہ سروِ خمیدہ جسے بہار کہیں
کوئی وہ لہجہ کہ داؤد کی زبور میں ہے
کوئی وہ تلخیٔ احساس جو شعور میں ہے
کوئی وہ فکر جو آواز میں بدل جائے
کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے
کوئی وہ میر کی افسردگی میں تازہ نہال
کوئی تغزل خسرو میں آریوں کا جمال
کوئی وہ برف جو کرنوں کے انتظار میں ہو
کوئی وہ بات جو اُلجھے ہوئے شرار میں ہو
کوئی وہ قصہ جو اکثر دراز ہو جائے
کوئی وہ لے کہ جو بڑھے اور ساز ہو جائے
یہ رنگ روپ، یہ سائے، یہ دھوپ چھاؤں، یہ جال
کہیں شریکِ دو عالم، کہیں خیالِ محال

ہرایکسیلنسی سروجنی نایڈو علیگڑھ میں

ہرایکسیلنسی، پروفیسر حبیب اور بشیرالدین صاحب کی معیت میں لائبریری سے آرہی ہیں

کنووکیشن کا جلوس — آگے شیخ عبدالرشید صاحب اور پروفیسر طاہر رضوی ہیں

باقر مہدی

منزل

چمک چمک کے ستاروں نے روشنی کھوئی
مگر حیات کو نورِ سحر ملا ہی نہیں
اُلجھ رہے ہیں رہِ شوق ہی سے دیوانے
محبتوں کا ابھی کارواں چلا ہی نہیں
جنونِ عشق کی گمراہیوں سے کیا حاصل
نقابِ حسنِ لبِ شعر تو ابھی ہٹا ہی نہیں

ہزار موجِ حوادث سے کھیلتا ہی رہا
مگر ابھی تو نگاہوں سے دور ساحل ہے
چھلک رہے ہیں غمِ آرزو کے پیمانے
بھری بہار میں اُجڑی ہوئی سی محفل ہے
بجھی بجھی سی تمنا رُکے رُکے سے قدم
ہجومِ یاس کے ماروں کی کون منزل ہے؟

مغیث الدین فریدی

معذرت

تو مرے ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ چھیڑ   اپنی معصوم نگاہوں کو گنہگار نہ کر
فطرتِ عشق سمجھ، عشق کے شعلوں سے نہ کھیل   مرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار نہ کر

نغمہ کیا، اب کوئی فریاد بھی ہونٹوں پہ نہیں   آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب تڑپتا نہیں پلکوں پہ ستارا بھی کوئی   دل کی رگ رگ سے لہو کھینچ لیا ہے میں نے

ے مری شاہدِ معصوم مرے ساتھ نہ چل   تیری فطرت میں بغاوت کے عناصر ہی نہیں
ھ کو چلنا ہے زمانے کی روش سے ہٹ کر   رہبرِ عشق ہوں میں، صرف مسافر ہی نہیں

ور تو، حلقۂ تہذیب و روایت کی اسیر   تو بھلا وسعتِ آغوشِ نظر کیا جانے
ستاروں کی خنک چھاؤں میں سونے والی   کیسی ہوتی ہے قیامت کی سحر کیا جانے

ھ کو درکار ہے اک صاعقہ بر دوشِ نظر   ظلمتِ رسم و روایت کو مٹانے کے لئے
ھ کو درکار ہے وہ حشر در آغوش ادا   زلزلہ بن کے جو رہ جائے زمانے کے لئے

تو مرے ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ چھیڑ
اپنی معصوم نگاہوں کو گنہگار نہ کر

پرویز شاہدی

سیلابِ توقع بخش گئیں، طوفانِ تمنّا بخش گئیں
ہر قطرۂ خونِ دل کو مرے تم شورشِ دریا بخش گئیں

ہیجانِ محبت بخش گئیں، وجدانِ تمنّا بخش گئیں
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں دل کو کیا جانیے کیا کیا بخش گئیں

چبھتی سی نظر کی رنگینی پیغامِ خلش کچھ دے ہی گئی
رشک آتا ہے جس پہ پھولوں کو تم دل کو وہ کانٹا بخش گئیں

دامانِ نظارہ خالی ہی حسن کا نہیں رہتا جلووں سے
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ کو وہ چشمِ تماشا بخش گئیں

یک لخت سکوں برباد ہوا، اک میٹھا سا درد آباد ہوا
دنیا مرے دل کی کیا لوٹی دل کو مرے دنیا بخش گئیں

سائے میں گھنیری زلفوں کے تم نے مجھے آخر لے ہی لیا
جینے کا سہارا کوئی نہ تھا جینے کا سہارا بخش گئیں

تم اپنی مہکتی زلفوں کو بکھرا کے ہوا کے کاندھوں پہ
بے خواب جوانی کو میری اک خواب حسیں سا بخش گئیں

قسمت کے اندھیرے لرزاں ہیں دیواروں پہ تارے رقصاں ہیں
یعنی مرے ظلمت خانے کو تم آ کے اجالا بخش گئیں

کاشانے کی رونق کیا کہیے ایمن کی فضا شرماتی ہے
دیوار کے اک اک روزن کو تم دیدۂ موسیٰ بخش گئیں

خاکِ کفِ پائے نازک ٹکرا کے لگی ہے تاروں سے
یعنی مرے گھر کی چوکھٹ کو تم اوجِ ثریا بخش گئیں

چنگیزیٔ دوراں کانپ اٹھی جب دورِ نظر سے تم مجھ کو
اک عزمِ بغاوت بخش گئیں، اک شوقِ توانا بخش گئیں

اب سیلِ بلا سے کون ڈرے جب مجھ کو مرے نزدیک آ کے
طوفاں کی ہمت بخش گئیں، پتھر کا کلیجا بخش گئیں

محسوس تو کرتی ہو گی تم مانا کہ زباں سے کچھ نہ کہو
پرویز کا کیا کیا لوٹ لیا پرویز کو کیا کیا بخش گئیں

غزلیں

حسرت موہانی

دل اُن سے مل کے اب ان کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے، میں خود بھی بتا نہیں سکتا

بقدر حوصلۂ عاشق ھے شوقِ وصال
مگر وہ شوق جو دل میں ما نہیں سکتا

یہ کس کے عجز تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بہ زعم ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

تری نظر کا ہے ناوک وہ ناوکِ دل دوز
نشانہ کوئی بھی جس کا بچا نہیں سکتا

اُنھیں یقینِ محبت نہیں، غضب تو یہ ہے
کہ چیر کر میں دل اپنا دکھا نہیں سکتا

اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت
کوئی جو پوچھے، کہاں ہے؟ بتا نہیں سکتا

ایک بات

رشید احمد صدیقی

جھگڑالو

عادت سے مجبور جھگڑالو ہی نہیں ہوتے بہت کچھ اور بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی جھگڑے کی بات ہے لیکن میں بھی کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ جھگڑنے کے لئے عادت کی کچھ اتنی ضرورت نہیں۔ کھانے کے لئے بھوک کی کیا ضرورت ہوئی۔ دونوں کے لئے صرف موقع کی ضرورت ہے۔ اور موقع نکال لینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ آدمی کی یہی تو بڑی خاصیت ہے کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے موقع نکال لیتا ہے۔

بعض تو یوں جھگڑتے ہیں کہ ہاضمہ میں فتور ہو گیا ہے۔ جب غذا جزو بدن نہ ہوتی ہو تو تحمل جزو مزاج کیونکر ہو۔ بعض لوگ جھگڑتے ہی اس لئے ہیں کہ کھانا ہضم ہو۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس ورزش سے کھانا ہضم ہوتا ہے یا نہیں۔ البتہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ایسے حضرات دیکھے گئے ہیں جن کے جھگڑنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ناواقف یہ سمجھ لے کہ جو کچھ ہضم ہو چکا تھا وہ پھر سے ہرا ہو رہا ہے۔

بعض اس لئے جھگڑتے ہیں کہ نیت میں فتور ہوتا ہے۔ کہتے کچھ ہیں۔ کرنا کچھ اور چاہتے ہیں۔ اپنا نفع دیکھتے ہیں دوسرے کا نقصان خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ ایک اور ایک دو کو کچھ نہ مانیں گے جب تک ایک اور ایک کے معنی دو روٹی کے نہ ہوں۔ آپ کہیں گے یہ کہاوت تو بھوکے پر صادق آتی ہے جھگڑالو پر نہیں۔ میں بغیر جھگڑے یہ عرض کروں گا کہ بھوکے کی نیت کب بخیر ہوتی ہے؟

کچھ اس لئے جھگڑتے ہیں کہ عقل میں فتور ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھتے نہیں مار کھانے پر تیار رہتے ہیں۔ عقل کی کمی کو جھگڑنے یا دو بدو لڑنے سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ عورتیں اس فن میں طاق ہوتی ہیں اور اس میں شک نہیں ان کے یہ حربے کبھی خطا نہیں کرتے اس لئے اور کہ ایسے مواقع پر مرد عقل کے ہاتھوں لاچار ہوتا ہے۔ اکثر شاعری کے ہاتھوں بھی دنیا میں حادثے کو دو ہی طرح سے دعوت دی جاتی ہے۔ آیت پڑھ کر یا شعر پڑھ کر۔ البتہ ہمارا آپ کا حال یہ ہے کہ ہم شعر پڑھ کر مار کھاتے ہیں اور آیت پڑھ کر صبر کر لیتے ہیں!

مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد ہے، ریاضی میں صفر تھا۔ عبارتی سوال مجھے جتنا دلچسپ معلوم ہوتا تھا اتنا ہی اس کے حل کرنے میں کورا تھا۔ چھوٹے بڑے، ہمسائے، راہ چلتے، نئے شوہر، پنشن یافتہ ماسٹر بھی اپنے اپنے طور پر حساب سمجھانے کی کوشش کرتے۔ میں ان سے جھگڑتا تھا اور خفت یا خفگی سے رونا آتا تو اس کے چھپانے کی جتنی کوشش کرتا اگر اتنی کوشش آج کروں تو مارشل پلین اور بلیک مارکیٹ یا بلیک میل (BLACK MAIL) میں آپ کوئی امتیاز نہ کر سکیں۔ مجھے یہ چیز بڑی ناگوار گزرتی تھی کہ سوال کا جواب پہلے سے کیوں فرض کر لیا جائے۔ میرے دل میں معلوم نہیں کیوں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فرض کیا نہیں اور مارے گئے نہیں! جہاں ایک بات مانی پھر مقالات افلاطون کے سوا چارہ نہیں! سمجھانے یا سمجھنے کے دوران میں حسب معمول میں نے کوئی اور جمل بات کہی نہیں کہ سمجھانے والا ہنسا بگڑا یا مجھ پر ترس کھانے لگا۔ اور یہ تینوں باتیں مجھے زہر معلوم ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے میں عادت سے مجبور نہ تھا۔ لیکن جھگڑنے میں کسی سے پیچھے نہ تھا!

یہی حال نیت کے فتور کا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ لیڈر بنیں۔ روٹی کمائیں اور جیل نہ جائیں اور تبلیغ کرتے ہیں اس کی کہ دوسرے فاقے کریں، مار کھائیں اور جیل جائیں۔ یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ جھگڑا ختم کیا جائے اس لئے کہ جھگڑا ختم ہوتے ہی ان کا پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔ افراد نے ذاتی نفع کی خاطر جماعت اور ملک کو اکثر غارت کیا ہے۔ آپ جہاں کہیں کوئی جھگڑا دیکھیں گے بالآخر یہی معلوم ہوگا کہ کوئی ایک شخص ہے جو اپنے نفس کی خاطر معاملہ کو روبراہ نہیں ہونے دیتا۔ جو لوگ ہاضمے کے فتور میں مبتلا ہیں ان کو میں سب سے مخلص جھگڑنے والا سمجھتا ہوں اور ان کی بڑی قدر کرتا ہوں اس لئے کہ وہ جھگڑتے ہیں محض جھگڑے کی خاطر۔ اس میں نفع نقصان، دنیا آخرت، زید بکر، کسی کی قید نہیں۔ آرٹ برائے آرٹ۔ ہمارے اب مضمون رہا ہو یا نہیں لیکن جھگڑا برائے جھگڑا کی عظمت کا میں ہمیشہ سے قائل رہا!

وامق جونپوری

خ دامن میں شفق کے کوئی تارا تو نہیں
مستقبلِ زریں نے پکارا تو نہیں

دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں

کے پھر ٹوٹ چلی کشتیٔ دل ساحل سے
پھر کسی موجۂ طوفاں نے پکارا تو نہیں

اس غمِ دوست نے کیا کچھ نہ ستم ڈھائے مگر
غمِ دوراں کی طرح جان سے مارا تو نہیں

جو دبے نہ اُٹھے تو سرِ مژگاں آکر
اک قطرۂ شبنم ہے شرارا تو نہیں

اک اُجالا سا جھلکتا ہے پسِ پردۂ غیب
چشمِ بے خواب میں لرزاں کوئی تارا تو نہیں

ے گیتوں سے معمور ہے کیوں بربطِ جاں
یں کچھ آپ کی نظروں کا اشارا تو نہیں

دُور، مشرق میں جو روشن ہیں کئی انگارے
اپنی قسمت کا کوئی ان میں ستارا تو نہیں

امیدوں پہ جیتا رہا وامق اب تک
ب مگر اک بھی جینے کا سہارا تو نہیں

پنڈت رام کشن مضطر

متاعِ درد سے محروم ہے حیات ابھی
بنی نہیں ہے محبت کی کائنات ابھی

یہ ترکِ جور و تغافل بجا مگر اے دوست
نہیں نگاہ میں پہلا سا التفات ابھی

ابھی کچھ اور تغافل کر اے نگاہِ یار
نہیں ہے دل کو تمنائے التفات ابھی

حیاتِ غم کا نہیں ہے ابھی کوئی عالم
نہ بے ثبات ابھی ہے نہ باثبات ابھی

میں اس خموش ادائے سپردگی کے نثار
ابھی سے خوفِ سحر کیا بہت ہے رات ابھی

بنا نہیں غمِ دنیا ابھی غمِ جاناں
غمِ حیات نہیں ہے غمِ حیات ابھی

الٰہی خیر کہیں رازِ غم نہ کھل جائے
سکوتِ یاس نے چھیڑی ہے کوئی بات ابھی

ابھی نظر کو میسر کہاں ترے جلوے
اداس اداس ہے سونی ہے کائنات ابھی

اک انقلاب کا اس درجہ غم نہ کر مضطر
کہ دیکھنے ہیں بہت سے تغیرات ابھی

اس لئے کہ وہ دولت پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کی بیوی کو کیوں نہیں مار ڈالتا۔ وہ نوکر سے اس لئے جھگڑے کی کہ نوکر تو صرف نوکر ہوتے ہیں، تنخواہ یا معاوضہ سے کیا سروکار۔ یہ کھاتے پیتے سوتے جاگتے کیوں ہیں۔ وہ دوسروں کی بیویوں سے جھگڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ وہ خود ان کے بارے میں جیسی رائے رکھتی ہے اس سے کہیں زیادہ تند و تاریک رائے دوسری عورتیں اس کے بارے میں رکھتا ہے وہ خدا سے جھگڑا مول لے گی اس لئے کہ خدا کا تعلق دنیا کی عورتوں سے کیوں ہے!

ایڈیٹروں کی کرامات کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ایڈیٹر صاحب نے انتقال فرمایا۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جس روایت کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں وہ بیان کی ہوئی تو ہے ایک ایڈیٹر صاحب کے ہم پیشہ کی لیکن دوسری یعنی ان کا انتقال فرمانا ایک ایسی ایجنسی سے ہے جس کا کوئی تعلق پہلی سے نہیں ہے۔ مرحوم ایڈیٹر صاحب کی روح جنت کے دروازہ پر پہنچی تو داروغہ جنت نے ان کی پذیرائی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جنت میں ایڈیٹر کا کام نہیں۔ وہاں سے روح جہنم کے دروازہ پر آئی۔ مالک دوزخ نے بھی ان کو قبول کرنے سے انکار کیا کہ جہنم کسی ایڈیٹر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ایڈیٹر صاحب کی روح نے بغیر کسی تکلیف کے جنت اور دوزخ کے درمیان اپنا آفس کھول دیا! نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن ان کو دو دعوتی کارڈ وصول ہوئے۔ ایک جنت سے دوسرا جہنم سے!

دوسرا قصہ اسی دنیا کا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بستی میں دو اخبارات تھے ایک کا نام بچھو تھا اور دوسرے کا نام بھالا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بستی میں کہرام مچ گیا۔ نہ کسی کی جان کی خیر تھی نہ مال کی نہ آبرو کی۔ آخر میں ایک شریف آدمی نے بڑی جد و جہد کے بعد دونوں اخباروں کے ایڈیٹروں کو مدعو کیا تاکہ وہ صلح کر لیں اور بستی کے لوگ حیات مستعار کے کچھ دن امن و عافیت سے بسر کر لیں۔

بچھو کے مدیر مسئول صاحب تشریف لائے جو ہر حیثیت سے اسم با مسمی تھے اب تلاش شروع ہوئی کہ بھالا کے سمپادک کہاں تشریف رکھتے ہیں، بڑی دیر کی جستجو اور دوڑ دھوپ کے بعد بچھو صاحب نے ظاہر فرمایا کہ موصوف ہی بھالا کے بھی ایڈیٹر تھے۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سعادت مند فرقہ کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے!

جھگڑنا اکثر غم و غصہ یا حماقت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ محض ایک مشغلۂ زندگی کے طور پر۔ جیسے شعر کہنا، خضاب لگانا یا افیون کھانا۔ ایک زمانہ میں میرا قیام ایک ایسے محلہ میں تھا۔ جہاں دو پڑوسیوں میں مکان کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ یہ جھگڑا ہر منزل سے گذر کر عدالت تک پہنچا اور مکان دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن جھگڑے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سورج ڈوبتے ہی ڈیورنڈ لائن کے ادھر ادھر دو بڈھے دکھائی دیتے پہلے ایک آیا۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا رومال، دوسرے میں حقہ، دوسرے صاحب بھی فوراً نمودار ہوئے۔ ایک ہاتھ میں رومال دوسرے میں بٹیر۔ دونوں نے اپنے اپنے رومالوں سے بیٹھنے کی جگہ صاف کی۔ ایک نے اللہ کا نام لیا اور بیٹھ گیا۔ دوسرے نے نزلہ کو گالی دی اور بیٹھ گیا۔ ایک نے کہا۔ آداب بجا لاتا ہوں میرن صاحب، دوسرے نے کہا مجرا عرض ہے منجھو صاحب۔ اس کے بعد حجت شروع ہوئی۔ ۱۵ منٹ تک میرن صاحب بے نقط سناتے رہے۔ اور منجھو صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے اس کے بعد منجھو صاحب نے حقہ میرن صاحب کے اور میرن صاحب نے بٹیر منجھو صاحب کے حوالے کی جن کو دونوں نے فرشی سلام کے ساتھ قبول کیا اور دوسرے ۱۵ منٹ تک منجھو صاحب میرن صاحب کو صلواتیں سناتے رہے اور میرن صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔ دو گھنٹے مسلسل میر صاحبان جھگڑتے رہے اور حقہ اور بٹیر باری باری بدلتے رہے، حقہ جل جاتا تو نوکر دوسرا حقہ لا کر رکھ دیتا اور پہلا حقہ اٹھائے جاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ جب ایک گلفشانی کر رہا ہو تو دوسرا حقہ چھوڑ کر جواب دے۔ یہاں تک کہ وقت ختم ہو جاتا اور میر صاحبان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتے!

میرے ایک دوست ہیں، اور یقیناً آپ کا بھی کوئی دوست ایسا ہی ہوگا جو بغیر جھگڑے سلام بھی نہ کرتا ہو۔ لیکن میرے اور آپ کے دوست میں ایک نمایاں فرق ہے۔ میرے دوست کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ ان سے اتفاق کریں تو یہ اور زیادہ چراغ پا ہوں گے۔ ان کا خیال ہے کہ جب اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی تو اقلیدس کی لکیر کیسے سیدھی ہو سکتی ہے۔

فرض کر لیجئے یہ کمیونسٹ ہیں اور اس مان لینے میں مضائقہ ہی کیا ہے، آخر دنیا میں فرضی کمیونسٹ ہوتے ہی ہوں گے۔ اب اگر آپ کمیونزم کے خلاف کچھ کہیں تو سوا مار ڈالنے کے یہ آپ کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کریں گے۔ مار ڈالنے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف بحث کرنے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس لئے جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوتا۔ ان دوست کا ہاضمہ اور حافظہ دونوں عجیب و غریب ہے اور جھگڑے یہ پیدا کرتے ہیں ان دونوں کے عجیب و غریب ہی استعمال سے۔ یعنی ہاضمہ کا کام حافظہ سے لیتے ہیں اور حافظہ کا ہاضمے سے! مثلاً دعوتوں میں یہ یاد رکھتے ہیں کہ کون سی چیز گھر پر کھانے کو نہیں ملتی اور بحث میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کہاں اتفاق ہو سکتا ہے۔

کمیونزم پر یہ پختہ یقین رکھتے ہیں لیکن خود کمیونسٹوں سے ہر مسئلہ پر جھگڑتے ہیں اسی صحبت میں اگر کوئی شخص خود جھگڑنے میں ان سے متفق ہو جائے تو اس سے جھگڑنے لگیں گے۔ خدائی قانون سے اختلاف کریں گے اس لئے کہ یہ خود خدا نہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی مخالفت کریں گے۔ اس لئے کہ یہ خود انسان ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی تعریف اور بڑائی کرنے کے لئے پیدا کیا۔ پھر معلوم نہیں کون سی مصلحت سمجھی کہ شیطان کو پیدا کر دیا۔ یہاں شیطان کی نژاد ان کی بحث میں پڑنے سے نہ کوئی حاصل نہ اس کا کوئی موقع۔ البتہ میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ فرشتہ اور شیطان دونوں کو پیدا کرنے کے بعد مشیت الٰہی نے کوئی کمی کہیں ضرور دیکھی اور ہمارے دوست کو پیدا کر دیا۔ عالم طبعی کا نظام مثبت و منفی قوتوں کی ہمہ گیر و ہمہ وقت کشاکش سے قائم رہتا ہے۔ ان میں توازن قائم ہوا نہیں اور عالم کا شیرازہ بکھرا نہیں۔ دونوں قوتیں کبھی بھی آپس میں ساز باز کر کے دنیا کا سارا کھیل بگاڑ سکتی تھیں۔ اس خطرے کی روک تھام کے لئے ہمارے دوست وجود میں آ گئے۔ یہ نہ مثبت ہیں نہ منفی بلکہ دونوں کے لئے خطرہ اور خطرہ بھی ایسا جس سے بڑا کوئی دوسرا خطرہ ہو نہیں سکتا یعنی نیوٹرل!

شعر و ادب کے بھی جھگڑالو ہوتے ہیں۔ آپ نے انیس کا مشہور شعر سنا ہوگا۔

> غلط یہ لفظ وہ مضموں خلاف، بندش سست
> ہنر عجیب بڑا ہے یہ عیب چینوں کو

ہمارے دوست کو بہترین شعرا کے بہترین کلام میں بھی نقص نظر آ جاتا ہے۔ مثلاً الف گرتا ہے، ی دبتی ہے۔ یہاں الف جلی ہے وہاں خفی۔ شتر گربگی ہے۔ وہ کتا خصی۔ ان کا زمانہ خود ان سے اور یہ خود زمانہ سے اکتا کر ختم ہو گئے لیکن اس طرح کے جھگڑے اور جھگڑالو اب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ نظم ہو یا نثر، افسانہ ہو یا تنقید، جھگڑے چلے ہی جاتے ہیں۔ اب جھگڑا اس پر ہے کہ آرٹ برائے آرٹ ہے یا برائے زندگی۔ پہلے الف کا گرنا اور ی کا دبنا یا خفی و جلی کا جھگڑا تھا۔ اب اس کا کہ بورژوا ہے یا پرولتاری، جنسیت ہے یا فراریت، لاشعور ہے یا تحت شعور، رجائیت ہے یا حقیقیت، انقلاب ہے یا التماس۔ خون ہے یا صفر!

اس دنیا میں جھگڑنے سے زیادہ آسان مشغلہ ہمارے آپ کے لئے شاید ہی کوئی اور ہو اور اس فن میں عورتوں اور ایڈیٹروں سے شاید ہی کوئی اور بازی لے گیا ہو۔ اس بنا پر عورتوں سے گھر کے اندر اور ایڈیٹروں سے گھر کے باہر کی دنیا نورٌ علیٰ نور ہوتی ہے یہ بتانا تو آسان ہے لیکن اس کا مان لینا مشکل کہ جنت میں شیطان نے عورت کو بہکایا یا عورت نے شیطان کو۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ مرد اور شیطان دونوں وہاں سے نکالے گئے۔ بہکانے اور جھگڑنے میں فرق ضرور ہے لیکن دراصل بہکانے اور جھگڑا کرنے میں صرف مقدم اور مؤخر کا فرق ہے۔ بہکانے میں جھگڑے کی نیت یقیناً پوشیدہ ہوتی ہے۔ عورت اور شیطان اس جرم میں جنت سے نکالے گئے اور اس دنیا میں آ گئے۔ بہت سے ایسے ہیں جو شیطان اور عورت ہی کے واسطے سے اس دنیا کو جنت سے کچھ کم نہیں سمجھتے!

گھر میں عورت اور گھر سے باہر ایڈیٹر طرح طرح سے جھگڑتے ہیں۔ عورت کروڑپتی ہی کی بیوی کیوں نہ ہو۔ اس کی شکایت کرے گی کہ اسے پیسے میسر نہیں۔ ظاہر ہے اس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن وہ شوہر سے جھگڑے گی

پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں اگر بیچ بچ اور کٹ حجتی پر اتر آؤں تو جواب میں کہہ سکتا ہوں کہ ان عظیم المرتبت شاعروں اور گرامی قدر ادیبوں کا مقصد بھی تخریبی ہوتا ہے۔ سماجی، سیاسی، اور معاشی زندگی کے جن مختلف پہلوؤں کی وہ چغلی کھاتے ہیں ان پہلوؤں کے انہدام یا شکست و ریخت ہی کو وہ اپنا مطمح نظر بناتے ہیں۔ اور انہیں تخریبی سرگرمیوں کے صلے میں انہیں اصلاح کا علم بردار، اور انقلاب کا نقیب اور نہ جانے کیا کیا کچھ خیال کیا جاتا ہے۔

آخر میں زچ ہو کر آپ یہی تو کہیں گے نا کہ اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ تو میں بھی دراصل یہی کہنا چاہتا ہوں کہ نقطۂ نظر بڑی چیز ہے اور اصل چیز ہے۔ اور یہ کہ نقطۂ نظر ہمیشہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے۔ جب زمانہ آگے بڑھتا ہے، حالات تبدیل ہوتے ہیں، سماجی تعلقات کی نوعیت اور معاشی طبقات کی حیثیت بدلتی ہے، تو خیالات تصورات اور عقائد میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ پرانی قدروں پر نظر ثانی کی جاتی ہے، اور ان کو از سر نو معین کیا جاتا ہے زندگی کے تمام مختلف شعبوں میں ایک نئے نقطۂ نظر کی کارفرمائی نظر آنے لگتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی کے اندر زندگی کا خارجی پیرہن اور اس کے ساتھ ساتھ داخلی رنگ و آہنگ کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس دوران میں جو مادی تغیرات رونما ہوئے انھوں نے ہمارے اخلاقی معیاروں اور قدروں کو یکسر منقلب کر دیا۔ سیاست کی دنیا میں جو سر بلند اور سربرآوردہ تھے وہ معتوب قرار پائے اور جو محکوم و مجبور تھے وہ حاکمیت اعلیٰ کے امین ٹھہرے۔ تمدن، معاشرت اور عام رسمی کی دنیا میں جو باتیں پہلے لازمی اور بنیادی سمجھی جاتی تھیں اب وہ فضول و غیر اہم خیال کی جاتی ہیں۔ اور وہ امور جنکو لوگ پہلے اس حد تک معیوب جانتے تھے کہ ان کے ذکر سے بھی کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اب انکو قولاً و فعلاً پسندیدہ اور مستحسن ثابت کیا جاتا ہے۔ تعلیمات کی دنیا میں بھی معاملہ برعکس نظر آتا ہے معلم، متعلم اور موضوع تعلیم کے عناصر ثلاثہ میں پہلے متعلم غریب کسی شمار قطار میں نہیں تھا اور ساری اہمیت استاد اور استاد کے علم کو حاصل تھی۔ اب متعلم ہی کو تعلیم و تعلم کے سارے ہنگامے کا مرکز و محور سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس صدی کو بھی بچے کی صدی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں پہلے نوابوں اور رئیسوں کی شان میں قصیدے لکھے جاتے تھے۔ اب انکے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ اور عوام کی طاقت و عظمت کے گیت گائے جاتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کو پہلے ایک بازاری شاعر سمجھا جاتا تھا۔ اب اسی بازاری ادب کا پیش رو اور انقلابی شاعری کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے۔ پہلے کہانیوں میں جن و پری اور دوسرے طلسماتی کردار گوشت پوست کے اصلی انسانوں کیلئے اپنی جگہ خالی کر چکے ہیں۔ جنسیات کی دنیا میں نقطۂ نظر کی تبدیلی کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ بدترین قسم کی جنسی بے اعتدالی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس حد تک کبھی کہ انکی بے راہ روی جرم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انکو مجرم قرار دینے کی بجائے ہمدردی اور دلجوئی کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ پہلے طوائف کو حقیر اور فطرتاً خبیث سمجھا یا کم خیال کیا جاتا تھا۔ اب اس کے ساتھ رواداری برتی جاتی ہے اور اس کی گناہ آلود فطرت کی تہوں میں شرافت پاکیزگی اور اعلیٰ انسانیت کے جوہر کی تلاش کی جاتی ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمارے نقطۂ نظر کی تبدیلی کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن تبدیلی کے اس تاریخی عمل نے بے چارے چغل خور کو اور اس سماجی تعصب کو جس کا وہ شکار رہا ہے یکسر نظر انداز کیا ہے۔ چغل خور کی قدروں کو ڈھونڈنے اور از سر نو متعین کرنے کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔ یہ تو اکثر سننے میں آیا کہ اگر سماج کو چوروں کے وجود سے پاک کرنا ہے تو دولت کی تقسیم زیادہ منصفانہ انداز میں ہونی چاہیے۔ یہ بات بھی بار ہا کہی گئی کہ اگر طوائفیت کے ادارے کو ختم کرنا ہے تو جنسی اخلاق کے معیاروں کو بدلنا ہوگا اور عورت کو معاشی حیثیت سے آزاد بنانا ہوگا۔ مگر یہ کسی نے نہیں کہا کہ چغل خور کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا محض بے کار ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حالات کو ختم کیا جائے جو چغل خور کی چغل خوری کا سبب بنتے ہیں۔ آخر آپ کسی شخص کے بارے میں اپنی زبان سے ایسی بات ہی کیوں کہیں کہ جو اس تک پہنچا دی جائے تو فضیحت کا باعث ہو؟ اور میں مکر و فریب یا سازش یا چوری کا مرتکب ہو کر کسی کو بھانڈا پھوڑنے کا موقع ہی کیوں دوں؟ جب تک دنیا میں بدی کا وجود ہے بدگوئی کا وجود بھی رہے گا۔ جب تک لوگوں کی زندگی میں بد دیانتی، عیاری، نالائقی اور فرض ناشناسی کے اوصاف موجود ہیں اس وقت تک چغل خور کی ہستی بھی برقرار رہے گی۔

اور یہاں یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ چغل خور جو بظاہر ایک بری عادت میں مبتلا نظر آتا ہے دراصل ایک نہایت مفید خدمت انجام دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سماج میں بالواسطہ طور پر ایک پہرے دار، ایک سنتری اور ایک محتسب کی حیثیت

اخترانصاری

چغل خور

کسی شاعر کے کلام پر اظہارِ خیال مقصود ہوتا ہے تو ادبی تنقید کی زبان میں ہم اس طرح کہتے ہیں: "وہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کا بڑا رمز شناس تھا اور اسرارِ حیات کی نقاب کشائی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ چنانچہ قلبی واردات کی مصوری اور ذہنی کیفیات کی ترجمانی میں جو کامیابی اُسے حاصل ہوئی وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔ وہ یقیناً اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر تھا۔" اسی بات کو اگر ہم چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں: "وہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے بھیدوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ان دونوں کا بھانڈا پھوڑنے میں کمال رکھتا تھا۔ وہ عمر بھر دل اور دماغ کی چغلیاں دوسروں سے کھاتا رہا اور اس فن میں جو کامیابی اسے حاصل ہوئی وہ بہت کم دوسرے چغل خوروں کے حصے میں آئی ہے۔ وہ یقیناً اپنے عہد کا سب سے بڑا چغل خور تھا۔" چنانچہ ایک شاعر نے جو اپنی شاعری کو غالباً اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا اپنے چغل خور ہونے کا ایک شعر میں کھلم کھلا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

میں کسی سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا نہ تھا
اب سخن کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہنا آ گیا

اسی شاعر نے ایک دوسرے شعر میں یہ مضمون باندھا ہے کہ میں دنیا والوں کے راز طشت از بام کرتا ہوں اور دنیا والے مجھے صرف شاعر سمجھتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ کہ اگرچہ لوگ مجھے شاعر خیال کرتے ہیں، لیکن در اصل ہوں میں چغل خور! اور پھر شاعروں پر ہی کیا موقوف ہے۔ غور کیا جائے تو ہمارے افسانہ نگار بھی سماج، سیاست، تمدن اور عام انسانی زندگی کی چغلیاں کھانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کرتے۔ اور ترقی پسند افسانہ نگار تو اور بھی اپنے گرد و پیش کے حالات یا افراد یا رسوم و روایات یا اداروں ہی کی چغلی کھاتے ہیں۔ ادبی نقاد اپنی زبان میں اس چیز کو سماجی احساس یا اجتماعی شعور کہتے ہیں۔ اور جو افسانہ نگار چغلی کھانے میں جتنی دور کی کوڑی لاتا ہے اتنی ہی زیادہ تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اُسے یہ کہہ کر داد دی جاتی ہے کہ اس کے مطالعے میں گہرائی اور مشاہدے میں باریکی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے اسرار و رموز اور دقائق و غوامض کو بے نقاب کرنے میں عدیم المثال جرأت، دلیری، اور عمیق النظری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے آرٹ نے ہمیشہ سماجی زندگی کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لانے اور سیاسی نظام کی دکھتی ہوئی رگوں کو پکڑنے کی وقیع اور نمایاں خدمت انجام دی ہے۔

شاعروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور فن کاروں کی تخلیقات کو بھی اسی زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سب کے سب چغلی کھانے کے فن کی بنیادوں پر ہی اپنی ادبی اور فن کارانہ عظمت کا محل تعمیر کرتے ہیں۔

پھر اگر ایک بھولا بھالا شخص اس بے ضرر عادت کا شکار ہے کہ میری بات آپ سے کہہ دیتا ہے اور آپ کی بات مجھ سے کہہ دیتا ہے اور ہم دونوں کی باتیں ایک تیسرے شخص کے علم میں لے آتا ہے تو آپ کیوں اُسے مطعون کرتے ہیں؟ اور کیوں اس انداز سے اُسے چغل خور کہتے ہیں کہ لفظ چغل خور میں نفرت اور حقارت کی ایک پوری دنیا سمٹ آتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانے بھر کی لعنتیں اور ملامتیں اُسکے ناچیز وجود پر بے طرح انڈیل دی گئی ہیں؟ آپ ایسا کرتے وقت دنیا کے بڑے بڑے شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کی کارگزاریوں کو ذہن میں کیوں نہیں رکھتے؟ آپ کہیں گے کہ شاعر اور ادیب اگر واقعی چغل خور ہیں تو یہ اپنی چغل خوری سے نہایت بلند اور اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتے ہیں اور وہ جو نرا چغل خور ہوتا ہے اُس کے محرکات بھی نہایت پست ہوتے ہیں اور مقاصد بھی حد درجہ مذموم۔ وہ شخص اپنی طینت کی بُرائی اور ذہنیت کے سقم کی بنا پر چغلی کھاتا ہے اور اس کا مقصد دوسروں کو نقصان

تماشائی

خاکے

نوجوان طالب علم

میں جب ۱۹۲۴ء میں کیمبرج پہنچا تو وہ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا، اس کا دوسرا سال تھا اور میرا پہلا، کسی نے مجھے اس سے ملا دیا اور اس نے مجھے ایک دن اپنے کالج لنچ پہ بلایا، لنچ میں کچھ تکلف نہ تھا، وہی نفاست آمیز سادگی تھی جو کیمبرج کی زندگی کی جان ہے، میز پر شراب سپید کی ایک بوتل بھی تھی، قریب قریب پوری بوتل اسے خود ہی پینی پڑی، اس کے مہمان (تین بہ شمول راوی) یا تو بالکل پیتے ہی نہ تھے، یا محض برائے نام، لنچ کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ برج کھیلا جائے جو بالاتفاق منظور ہوئی، میزبان نے یہ کہہ کر کہ میری اب کی بار جیت نہیں، سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا ساتھی بنا لیا، اس نے کئی بار اپنے ساتھی سے اس بات کی معذرت کی کہ وہ شراب زیادہ پی گیا ہے اور اچھی طرح نہیں کھیل سکتا، یہ معذرت مجھے اور میرے ساتھی کو قطعی غیر ضروری معلوم ہوئی، کیونکہ ہماری دانست میں اس نے نہ کبھی غلط کال دی اور نہ کبھی غلط پتا چلا، سات بجے شام کو کھیل موقوف ہوا تو میزبان اور اس کے ساتھی نے ہم دونوں سے سترہ سترہ شلنگ جیتے تھے، ہم دونوں نے جیب سے روپے نکال کر ادا کرنا چاہے، لیکن اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کل پھر کھیلیں گے، تم لوگوں کو انتقام کا موقع دینا چاہیئے، آج تمہاری قسمت بڑی خراب تھی، یہ بات طے ہوئی کہ دوسرے دن غزنوی کے یہاں لنچ رہے اور لنچ کے بعد تاش کھیلا جائے، دوسرے دن بھی وہ اور غزنوی ایک ساتھ ہو گئے، اور قسمت پھر ہمارے خلاف رہی، دونوں دن ملا کر ہم دونوں نے تیس تیس شلنگ ہارے جو ہم نے فوراً ادا کر دیے۔

اس کے بعد اس سے برابر ملاقات ہوتی رہی، اس کا انداز مربیانہ تھا لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ یہ بات ظاہر نہ ہونے پائے اس نے وہی مضمون لے رکھا تھا جو میں نے لیا تھا، وہ مجھے مشورے دیتا کہ کن لکچروں میں شریک ہوں، کن لکچروں میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں، کن سوسائٹیوں کا ممبر بنوں، لندن جاؤں تو کہاں قیام کروں، کس درزی سے کپڑے سلواؤں، کہاں جوتے بنواؤں، میں جوانا، سعادت مند کی طرح اس "پیر دانا" کی باتیں سن لیا کرتا تھا۔ حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے سال دو سال کم ہی ہوگا۔

کیمبرج میں مجھے رہتے ہوئے جب کچھ دن ہو گئے اور ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اپنے کو مردم شناس

رکھتا ہے۔ وہ اخلاقِ عامہ کا مصلح ہے۔ وہ ہمارے قول و فعل پر ذمہ داری، احتیاط اور انضباط کی کڑی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ ہمیں انجام بینی اور عاقبت اندیشی کا سبق سکھاتا ہے۔ اور سوچ سمجھ کر بات کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کسی محفل میں داخل ہوتا ہے تو گویا خطرے کی گھنٹی بج جاتی ہے۔ غیر ذمہ دارانہ گفتگو کرنے والوں کی چلتی ہوئی زبانیں رک جاتی ہیں۔ بدگوئی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لوگ بے دھیانی اور بے پروائی کا انداز ترک کر کے فوراً محتاط اور چوکنے ہو جاتے ہیں۔ طبیعتوں میں ٹھہراؤ اور مزاجوں میں سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ چغل خور کی شخصیت کے ان ادب آموز پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اکثر افعال اور ہماری زندگی کے اکثر مشاغل ہماری شخصیت کے اظہار کی مختلف صورتیں اور ذہنی تسکین اور جذباتی آسودگی فراہم کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ شاعری، انشا پردازی، مصوری اور دوسرے تخلیقی فنون سے بھی ہم یہی مقصد حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص شاعر یا انشا پرداز یا آرٹسٹ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لامحالہ انسانوں کی کثیر تعداد کو اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے دوسرے ذرائع ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور دوسری چیزوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اُس شخص کو لیجئے جو عمر بھر رات کو سونے سے پہلے طلسم ہوشربا پڑھنے کا عادی رہا ہے۔ اب محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ وہ ایک اچھی یا بری عادت کا شکار ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ طلسم ہوشربا کا مطالعہ اُس کے لئے دراصل اظہارِ شخصیت، تزکیۂ جذبات اور حصولِ تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ طلسم ہوشربا گویا ایک جذباتی سانچہ ہے جس میں اُس کی اُمنگیں، آرزوئیں، حوصلے اور عزائم قدرتی طور پر ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اگر اُس جذباتی سانچے سے اُس کو محروم کر دیا جائے تو اُس کی ساری زندگی بے مزہ، بے کیف اور کھوکھلی ہو کر رہ جائے گی۔ یہی حال اُس شخص کا ہے جو چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں مدہوش رہنا چاہتا ہے، اور اُس شخص کا بھی جو سارے زمانے سے اپنے لاتعداد معاشقوں کا ذکر کرتا پھرتا ہے، درآں حالیکہ قدرت نے عشق میں مبتلا ہونے کا اُسے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو بظاہر ناخوش گوار یا ناپسندیدہ عادتوں کے شکار ہیں، مگر جو دراصل اپنی فطرت کے تقاضوں کو کسی نہ کسی طور پر پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور گرتے پڑتے لشتم پشتم اپنی ودیعتوں کے اظہار میں مصروف ہیں۔ کون ہے جو قلبِ وسیع اور چشمِ بینا رکھتا ہو اور ان کو نفرت کی نظر سے دیکھ سکے۔ چغل خور بھی اسی انبوہِ کثیر کا ایک فرد ہے۔ وہ بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں کی طرح اپنی فطرت کو بروئے کار لانے اور اپنے وجود کو بامقصد بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ بھی اپنی پیدائش کے منشائے اصلی کو پورا کر رہا ہے۔ ہم اُس سے بیزار ہیں، شاید اس لئے کہ وہ ہماری بعض ناجائز آزادیوں میں خلل انداز ہوتا ہے۔ مگر وہ جو کچھ کرتا ہے اُس پر مجبور ہے۔ اس کے سوا وہ کچھ اور کر نہیں سکتا۔ زندگی کے نظام اور سماج کے نقشے میں اُس کی ایک مخصوص جگہ ہے۔ اُسکے مخصوص فرائض ہیں جن کی اہمیت کو گھٹایا نہیں جا سکتا۔ زندگی کی رونق، چہل پہل اور گہما گہمی میں باعزت اور بااصول لوگوں کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اُس کی کوششوں کو بھی تھوڑا بہت دخل ہے۔ زندگی کے ہنگامے کو برقرار رکھنے میں کسی نہ کسی حد تک اُس کا بھی ہاتھ ہے۔ اگر اُس کی مصروفیتیں ختم ہو جائیں تو ہماری مجلسی زندگی میں سے ایک جاندار عنصر نکل جائے اور سماجی تعلقات کی دنیا یقیناً کسی قدر روکھی پھیکی، بے مزہ اور بے جان ہو کر رہ جائے۔

قاعدہ ہے کہ بعض چیزوں کے روشن پہلو اُس وقت خاص طور پر اجاگر ہوتے ہیں جب اُن کو بعض دوسری چیزوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ آپ چغل خور کو اُس شخص کے مقابلے میں رکھ کر دیکھئے جو اُس کی ضد ہوتا ہے۔ اُس شخص کا کوئی نام نہیں ہے، مگر اُس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ چند خود ساختہ اصولوں کا پابند ہوتا ہے، ہوشمند ہوتا ہے، محتاط ہوتا ہے اور گھنا ہوتا ہے۔ وہ آپ سے ملاقات کرے گا تو ظاہر ہے کہ اُس کی بات چیت نہایت مختصر، نپی تلی، سطحی اور غیر مخلصانہ ہو گی۔ آپ اُس کی پوری شخصیت کو خشک، بے رنگ، سپاٹ اور غیر دلچسپ پائیں گے۔ وہ اپنی فرزانگی کے غلاف میں لپٹا ہوا اور اپنے مکر آلود چہرے پر ایک مصنوعی سنجیدگی طاری کئے ہوئے آپ کے سامنے بیٹھا رہے گا اور آپ اُس سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اب آپ ہی بتائیے کیا ایسے شخص سے وہ بدنصیب جسے چغل خور کہا جاتا ہے بدرجہا بہتر نہیں ہے؟ کیا اس شخص کے گھنے پن کو دیکھتے ہوئے آپ چغل خور کے کردار کو زیادہ فطری اور زیادہ انسانی قرار دینے پر مجبور نہیں ہو جائیں گے؟

ہو گیا تو اس کے دل کا غبار نکل گیا۔" اُس نے کہا۔ "سب اب بھی جب اُسے یاد کرتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے، کرسٹیلا کی خفگی بجا تھی، لیکن میرا غصہ بھی بے سبب نہ تھا۔ تم جانتے ہو کہ ساری دولت میرے والد کی پیدا کی ہوئی ہے، ان کا بچپن اور جوانی بڑی تنگ دستی میں کٹی ہے، انھوں نے میری تربیت خاص طور پر کی ہے، وہ بچپن ہی سے میرے کان میں یہ بات ڈالتے رہے ہیں کہ ان لوگوں کی قدر کروں جو بے غرض مجھ سے ملتے ہیں، اور غرض والوں کی دوستی پر بھروسا نہ کروں۔ اُن کی یہ نصیحت رہی ہے کہ خوشامد ہرگز بے وجہ نہیں ہوتی، اور ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی ڈرنے کی چیز ہے۔"

"ال اے ترو پولی پو اترا دینت" (جو ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق ہے، وہ ایماندار نہیں ہو سکتا) میں نے ایک فرانسیسی مقولہ اسے یاد دلایا۔

"یہ کس کا قول ہے؟ میرے دل کی بات چھین لی۔"

"مجھے مصنف کا نام یاد نہیں۔" لیکن، کیا تمہارا پہلا نام لے کر پکارنا بڑی خوش اخلاقی کی بات ہے؟

"واقعہ تو سنو، یہ تو اونٹ کی پیٹھ پر آخری اسٹرا تھا، ورنہ اس سے مجھ سے زیادہ ملاقات نہ تھی، سوا صاحب سلامت کے کبھی بات چیت نہیں ہوئی، ایک دن بڑے اصرار سے اس نے مجھے لنچ پر بلایا، مجھے انکار کی کوئی صورت نظر نہ آئی، میں نے قبول کر لیا، جس دن اُس نے مجھے بلایا تھا، صبح ہی سے بڑی برف باری ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ کون گھر سے باہر نکلے، لیکن با دل ناخواستہ نکلنا ہی پڑا۔ میں نے اُس کے یہاں پہنچ کر گھنٹی بجائی، لینڈ لیڈی کے بجائے خود وہ نے دروازہ کھولا، میرا اوور کوٹ اُتار کر کھونٹی پر رکھا، اور کمرے میں لے جا کر سب سے آرام دہ کرسی پر آگ کے سامنے مجھے بٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ اُس نے اور لوگوں کو بھی بلایا ہوگا، لیکن یہ خیال غلط نکلا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھانا لانے کا حکم دیا۔ کھانا آیا، اتنا کھانا اور ایسا کھانا کیمبرج میں تو مجھے کبھی کسی نے نہیں کھلایا تھا، اس پر طرّہ یہ کہ شیمپین کی بھی ایک بوتل تھی۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "سم پیپل ہیو آل دی لک اِن دی ورلڈ" (کچھ لوگ قسمت کے بڑے دھنی ہوتے ہیں)

"جی ہاں" دن کا وقت اور شیمپین! میں نے بہت منع کیا کہ نہ کھولو، وہ نہ مانا اور مجھے بھی اُس کی خاطر سے تھوڑی سی پینی پڑی۔ لیکن تم یقین کرو کہ شیمپین اور لنچ کی اُس کی گفتگو کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ تھی، تعجب نہیں کہ اُسے سن کر میرا وزن بڑھ گیا ہو، خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن جب گفتگو میں بار بار یہ جملہ آنے لگا کہ "یو آر دی اونلی فرینڈ آئی ہیو" ممکن ہے کہ یہ شیمپین کا اثر ہو لیکن میں بھی تو آخر آدمی ہوں۔ اس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا، اور قہوے کی پیالی ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سے

سمجھتے ہیں، ورما کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ایک صاحب مدتوں سے کیمبرج میں مقیم تھے۔ اس وقت تک کوئی امتحان انہوں نے نہیں پاس کیا تھا، جب اُن سے کوئی ہمدرد اس بارے میں کچھ کہتا تو وہ پوپ کا مصرع پڑھ دیتے "دی پروپر اسٹڈی فور مین از مین، کانڈ" اور کہتے "آپ کو کیا معلوم کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا کچھ سیکھا ہے۔ امتحان پاس کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، اصل چیز مردم شناسی ہے"۔ ورما ان کی رائے میں پرلے سرے کا خود غرض، کمینہ اور اسنوب تھا۔ اور اس سے زیادہ اتحاد خطرے سے خالی نہیں۔

"تم نے کبھی اُسے ڈسلوا کے ساتھ بھی دیکھا ہے؟ اس کے ساتھ ٹہلتا ہے تو واقعی اس کا قد ایک دو انچ بڑھ جاتا ہے، اور ڈسلوا ہے کہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا، میاں ورما اگر وہ گالیاں بھی دے تو تبرک اور سمجھ کر پی لینے کے لئے تیار ہیں۔ اور یہ سب اس لیے کہ وہ کرکٹ بلو ہے، انگلستان سے ورما کی ملاقات نہ تھی، ادھر اس کا آئی سی ایس میں کامیاب ہوا تھا اور ورما کو علم ہوا کہ وہ میرے ہی صوبے میں جانے والا ہے، اس نے اس سے جس طرح ممکن ہوا ملاقات پیدا کی اور خاطر مدارات سے اس قدر راضی کر لیا کہ اس کا سب سے بڑا دوست ہو گیا ہے، ایک بار کا قصہ ہے، [illegible] دو ایک دن کے لئے لندن گیا، وہاں جا کر بیمار پڑ گیا، ورما ہر دوسرے تیسرے کیمبرج سے اُسے لندن دیکھنے جایا کرتا تھا اور جب نہ جاتا، خیریت کے لئے جوابی تار دیتا، مجلس میں سب لوگوں کے سامنے دادیا نے اُسے جس بُری طرح ڈانٹا ہے، تم نے بچشم خود دیکھا ہوگا"

دادیا ایک پارسی لڑکا تھا، جو بڑے ٹھاٹھ سے رہا کرتا تھا، جس واقعے کی طرف شرما نے اشارہ کیا تھا، اُس کا شاہد عینی میں بھی تھا۔ اس کا محل وقوع لائینز ہوٹل تھا، جہاں اس زمانے میں انڈین مجلس کے ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے، ابھی باقاعدہ کارروائی نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پریزیڈنٹ کی کرسی کے پیچھے دادیا، کوسٹیلو، غزنوی وغیرہ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ورما اندر آیا سب سے پہلے تپاک سے وہ دادیا سے مخاطب ہوا اور بے تکلفانہ انداز میں "ہلو کیکی" کہا، کیکی، دادیا کا پہلا نام تھا جس کی سوا اس کے خاص احباب کے کسی کو خبر نہ تھی، یہ سننا تھا کہ دادیا نے نہایت غضب ناک ہو کر پوچھا "سنس وھن ہیو آئی گون یو دی رائٹ ٹو کول می بائی فرسٹ نیم" (کب سے میں نے تمہیں اس بات کا حق دیا ہے کہ تم میرا پہلا نام لے کر مجھے پکارو؟) ورما تو بالکل ہکا بکا ہو گیا، ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا، لیکن کوسٹیلو کو جو دادیا کا سب سے بڑا دوست تھا، یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور اس نے دادیا سے کہا "میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے لئے اجازت کی ضرورت ہے، تمہارے بغل میں بیٹھنے کے لئے تو پہلے سے اجازت کی ضرورت نہیں؟ آؤ ورما، ادھر بیٹھو" کوسٹیلو دادیا کے بغل میں بیٹھا تھا، اس نے اپنی جگہ خالی کر دی، اور ورما کو زبردستی وہاں پر بٹھا دیا، اس واقعے کے بہت دن بعد جب میں دادیا سے بے تکلف

امتحان جلد ختم کر لیے اور ایک برس کے اندر ہی ہندوستان واپس چلا گیا۔ اس کو پانچ چھ مہینے گزرے تھے کہ ایک دن پٹی کیوری میں شرما سے ملاقات ہوئی، وہ ہیفر کی دکان سے باہر نکل رہا تھا، اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جو بعد میں معلوم ہوا کہ پیرانڈیلو کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ ہے، شرما مجھے پٹی کیوری ہی کے کسی قہوہ خانے میں لے گیا، اور ملازمہ کو قہوہ لانے کا حکم دینے کے بعد یوں گویا ہوا :۔

"تمہیں ورما کا آخری کارنامہ بھی معلوم ہے؟" میں نے جواب دیا کہ ہندوستان جاتے وقت وہ مجھ سے ملا بھی نہیں، شرما نے دریافت کیا کہ میرے روپے تو اس کے ذمے نہیں نکلتے تھے، یہ صاف بات تھی کہ شرما کو ورما کی ایمان داری میں شک تھا۔ اور میں نے اُس کے شکوک کو دُور کرنے کی کوشش کی۔

"یہ بات نہیں، ورما میں اور جو کچھ برائیاں ہوں، وہ بد معاملہ نہ تھا، مجھ سے اُس نے بارہا قرض لیا، اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔"

"تم نے کبھی انگریزوں کا یہ مقولہ بھی سنا ہے "اونسٹی از دی بسٹ پالیسی"۔ ایمان داری کسی اخلاقی اُصول پر مبنی نہ تھی وہ محض پیش بندی کر رہا تھا، اُس نے اعتبار قائم کر رہا تھا کہ بعد میں اچھی طرح لُوٹنے کا موقع ملے تمہیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ چلنے کے وقت کیمبرج کے مختلف دکان داروں سے اُس نے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ کی چیزیں خریدیں، اور ایک پیسہ ادا کیے بغیر ہندوستان روانہ ہو گیا، مجھے یقین ہے کہ اگر اسے موقع ملا ہوگا تو اس نے لندن کے وہ چار دکانداروں کو بھی چرکے دیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی دکانداروں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ قرض کا بیوپار نہ کیا جائے۔ مجھے یہ بات پہلے پہل راٹیڈرامیر کے یہاں معلوم ہوئی، میں نے وہاں سے پندرہ سولہ شلنگ کی ٹائیاں اور موزے خریدے تھے اور تین قمیصوں کا آرڈر دیا تھا، اُس نے میرا آرڈر تو لکھ لیا، لیکن نہایت ادب سے کہنے لگا کہ "قیمت آپ اسی وقت ادا کریں گے، یا جس وقت چیزیں آپ کے یہاں پہنچ جائیں گی؟" میں نے کہا کہ "میں کوئی نیا خریدار تو ہوں نہیں، آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" میری آواز ذرا بلند ہو گئی تھی، منیجر قریب ہی تھا، وہ اور قریب آ گیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ "مسٹر شرما ذرا تکلیف کر کے آپ میرے آفس میں چلیں"۔ میں منیجر سے اچھی طرح واقف تھا اُس کے ساتھ آفس میں گیا تو اُس نے ورما کا واقعہ بیان کیا۔" ورما تین برس مسلسل اس دکان سے چیزیں خریدتا رہا، اور کبھی اُس نے بل کے ادا کرنے میں ایک دن کی بھی دیر نہ کی۔ کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد اس نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ ابھی قانون کے امتحانات میں شریک ہونا ہے، کیمبرج میں ابھی دو سال قیام اور رہے گا، باوجود اس کے کہ اب یونیورسٹی کا ممبر نہ تھا، اس کا اعتبار اتنا تھا کہ یہ لوگ برابر اسے اُدھار دیتے رہے، جانے سے قبل ورما نے تیس پونڈ کی چیزیں کچھ بنوائیں اور کچھ بنی بنائی مول لیں۔ بل جب اس کے مکان پر بھیجا گیا

رخصت ہو کر چلا آیا، اجازت اس نے بڑی مشکل سے دی تھی، لیکن میری طبیعت کا انداز یہ تھا کہ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتا تو اُسے میں چھوڑ کر چلا آتا، مجھے چاہیے تھا کہ میں اُسے اپنے یہاں بلاتا، لیکن بلانا تو بڑی بات ہے اس کے سلام کا جواب بھی بڑی رُکھائی سے دیا کرتا تھا، اس کے بعد اس کا اس قدر بے تکلف ہونا، میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوا، اور مجھ سے وہ حماقت سرزد ہوئی جس پر اب تک شرمندہ ہوں۔"

ورما کی حمایت کرتے ہوئے میں نے شرما کو یہ جواب دیا" آخر تمہارا اعتراض کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ورما کی دوستیوں میں غرض کا پہلو شامل ہوتا ہے اور ان کی بنیاد اتحاد ذوق پر نہیں، تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، آگے چل کر، تم، ہم سب یہی کریں گے ورما اگر سچ پوچھو تو قابل مبارک باد ہے کہ اُسے اس کم سنی ہی میں یہ گر معلوم ہو گیا کہ دو چڑیوں کا شکار ایک ہی پتھر سے ہو سکتا ہے، دوستی کو اگر اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ یہ انسان کی عام کمزوری ہے۔"

شرما کی نصیحت کے باوجود میں ورما سے ملتا رہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً مجھ سے روپے بھی قرض لیے اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔ زمانہ ... جوں گزرتا گیا مجھے بھی اس کا احساس ہوتا گیا کہ گو ورما بد دیانت نہیں، لیکن پرلے سرے کا کائیاں اور خود غرض ضرور ہے، ایک بار تعطیل میں قطعی فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ حلیم اور میرے ساتھ ایسٹ بورن چلے گا لیکن عین وقت پر اُس نے آکر کہا کہ "میں سوئٹزرلینڈ جا رہا ہوں، آئنگر سے میں نے لاکھ کہا کہ میں تم سے اور حلیم سے ایسٹ بورن جانے کا وعدہ کر چکا ہوں، لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔" تھوڑی دیر کے بعد اپنے جرم کے استخفاف میں یہ دلیل پیش کی" تم جانتے ہو آئنگر پنجاب جا رہا ہے اور مجھے بیرسٹری کرنی ہے، اس کی دوستی میرے لیے بڑی مفید ہو گی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا اور حلیم کا مجھ پر زیادہ حق ہے، لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔" یہ عذر گناہ بدتر از گناہ سہی، لیکن اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی، میرا اُس کا ساتھ لندن میں بھی رہا، پہلی بار جو میرا اس کے ساتھ تھیٹر گیا تو میرا ٹکٹ بھی اسی نے خریدا، دوسری بار میں اُسے اپنے خرچ سے تھیٹر لے گیا، تیسری مرتبہ اُس نے ٹکٹ خریدنے کی آمادگی تو ظاہر کی، لیکن اُس کا ہاتھ جیب کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ سینما کی سلوموشن پکچرز کا لطف آ رہا تھا، جب تک وہ بٹوا نکالے میں نے ٹکٹ خرید لیا تھا، چوتھی بار غلطی سے وہ بٹوا گھر ہی پر بھول آیا تھا، پانچویں مرتبہ جو اس نے تھیٹر ساتھ چلنے کی جو تحریک کی تو میں نے کہہ دیا کہ میرے پاس کافی روپے نہیں، اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "تم بہت تکلف کرتے ہو، تمہارے پاس نہیں ہیں تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہیں۔"

ورما کو کیمبرج سے ڈگری مل گئی، لیکن قانون کے امتحان باقی تھے، اُس نے کہا تھا کہ دو برس اور رہوں گا، لیکن اس نے

لیکن گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت آگیا ہے، میں نے اس کو تیسرے پہر کے لئے اٹھا رکھا، اور بس پر سوار ہو کر جیری ہنٹن روڈ پہنچا۔ گھر آکر جو دیکھتا ہوں تو جیب میں بٹوا ندارد، کسی نے جیب سے نکال لیا۔ یا خود بخود گر پڑا۔ لنچ کھانے کا کسے ہوش تھا، فوراً گھر سے نکلا اور بس اسٹینڈ تک تلاش کرتا ہوا گیا لیکن نہ معلوم کہاں گرا تھا، کچھ پتا نہ چلا۔ اس کے بعد میں نے فوراً لوسٹ پراپرٹی آفس کو اطلاع دی اور پولیس کو بھی خبر کر دی۔ کیمبرج اور لندن دونوں جگہ کا پتہ دے دیا کہ اگر پتہ چلے تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے، دوسرے دن سخت پریشانی کے عالم میں لندن پہنچا، بجائے اس کے کہ کیمبرج میں کسی سے قرض لوں یا لندن میں کسی کو تکلیف دوں، میں نے گھر تار دے کر تیس پونڈ اور منگوائے، ٹکٹ میں نے پہلے ہی سے خرید رکھا تھا، لندن میں دو چار روز اور ٹھہر سکتا تھا لیکن طبیعت بالکل اچاٹ تھی جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو گیا، پیرس میں بھی نہ ٹھہرا، سیدھا مارسیلز پہنچا اور جہاز پر سوار ہو گیا، دکانداروں کو روپے ادا کرنا خارج از بحث تھا، ڈیڑھ سو پونڈ محض تار دینے سے تو آنہ جاتے، خیال آیا کہ چیزیں واپس کر دوں، لیکن کل سامان میں نے پہلے ہی لندن روانہ کر دیا تھا، اور وہ چیزیں جو خاص میری فرمائش سے بنی تھیں، وہ دکانداروں کے لئے بیکار بھی ہوتیں، تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟ یہ اعتراض کہ میں نے اصلی پتا نہیں بتایا بہت مضحکہ خیز ہے، میرے والد صاحب جس زمانے میں، میں نے اپنا پتا دیا ہے، رہتک ہی میں تھے، اب پنشن لے کر لاہور میں مقیم ہو گئے ہیں، رہتک کا خط اگر لاہور نہ پہنچے تو میرا کیا قصور؟ تم میرا نیا پتا سب کو دے دو، اور جس جس کا یہاں جانا ہو میری طرف سے اطمینان دلا دو کہ جہاں تک جلد ممکن ہوگا میں روپے ادا کر دوں گا۔ آنگر اسی ضلعے میں ہے، اس کے اجلاس میں، میں کئی بار کام کر چکا ہوں، لیکن اب وہ آنگر نہیں تفصیل کسی دوسرے وقت، تمہارے واپسی کے دن بھی اب قریب ہوں گے تمہیں اگر زیادہ تکلیف نہ ہو تو دو تصویریں لیتے آنا قیمت میں یہاں آؤ گے تو ادا کر دوں گا، ایک تو وہ تصویر ہے جو میں نے بٹسی کے ساتھ کھنچوائی تھی دوسرا اس ٹرنر کا گروپ ہے جو میں نے اس کے کیمبرج سے رخصت ہونے کے وقت آنگر کو دیا تھا، میں یہ دونوں تصویریں ساتھ لایا تھا، لیکن راستے میں وہ بکس ہی غائب ہو گیا جس میں یہ تصویریں تھیں......" میں نے یہ خط شرما کو سنایا، وہ دیر تک ہنستا رہا، جب اسے ہنسی سے افاقہ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا: "تمہارا پیرانڈیلو اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ ورما ایمان دار ہے یا بے ایمان؟" "یہ تو مجھے علم نہیں کہ پیرانڈیلو کیا کہے گا، لیکن یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ ورما تمہیں کیا سمجھتا ہے، اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" لوگ کہتے ہیں کہ "علم شے بہ از جہل شے" لیکن میں نے یہ معلوم کرنے کی بالکل کوشش نہ کی کہ ورما مجھے کیا سمجھتا ہے۔

تو لینڈ لیڈی سے معلوم ہوا کہ ورما ہندوستان چلے گئے ہیں۔ ورما کے بتائے ہوئے پتے سے اس وقت تک تین چار خط بھیجے جا چکے ہیں، لیکن وہ خط اس وقت تک واپس آ چکے ہیں، ڈاک خانے والوں کو مکتوب الیہ کا پتا نہیں ملتا۔ میں نے خود رجسٹر منگوا کر دیکھا، ورما نے رہتک کا پتا دیا تھا، حالانکہ رہتک سے اس کو کوئی تعلق نہیں، میں نے منیجر سے کہا کہ تم حق بجانب ہو، اور آج سے میں تو عہد کرتا ہوں کہ بھولے سے بھی کسی دکان سے کوئی چیز ادھار نہ منگواؤں گا۔ منیجر نے مجھ سے بہت معذرت کی اور کہا کہ میرا حکم آپ کے لئے نہیں، آپ دکان سے حسبِ دستور چیزیں منگا سکتے ہیں، لیکن میں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا منظور نہ کیا، اس کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہارڈوک بلینڈر سمتھ، بینز، ایڈمس، تھرسل، ڈکسٹر، میفر، اسٹرن سب کے ساتھ ورما نے یہی سلوک کیا ہے، ان کے علاوہ اور دکان داروں کو بھی اس نے لوٹا ہے، کہاں تک سب کا نام لوں، میری تحقیقات ابھی مکمل نہیں، صفر کا تو ابھی پتا چلا ہے، اب آپ فرمائیں کہ ورما کی ایمان داری کے متعلق، آپ کی کیا رائے ہے؟"

میں نے ایک لمبا چوڑا خط ورما کو لکھا، ورما نے فوراً جواب دیا جو ذیل میں درج ہے بعض فقرے حذف کر دیئے گئے ہیں۔

"تمہاری شکایت بجا ہے، ہندوستان، جنت نشان، (جو لوگ اسے جنت نشان کہتے ہیں، میں ان کی تخیل کی عسرت پر حیران ہوں) کی فضا اور ہی ہے، جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیت سے یہاں آ کر انسان بالکل کاہل ہو جاتا ہے، ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں، تم میرے والد صاحب سے نہیں ملے، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، لیکن ذرا سی کسر یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ سے بالکل محروم ہیں، انہوں نے میری تعلیم میں پچیس تیس ہزار روپے صرف کئے، واپسی پر قانون کی کتابیں منگوا دیں، اور ہائی کورٹ میں داخل کرا دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محض میری وجہ سے لاہور میں قیام اختیار کیا، اس کے بعد انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اور میں چھ مہینے کے اندر شادی لال، شفیع یا فضل حسین نہ بن جاؤں تو یہ میرا قصور ہے، تفصیل کہاں تک لکھوں، مختصر یہ ہے اگر والدہ صاحبہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ورما کو عبداللہ کے بدلے قینچی سگریٹ پینے پڑتے اور کلب کا خرچ نکلنا تو قطعاً ناممکن ہوتا، سن چکے میری داستان! پھر بھی شکایت کرو گے کہ میں نے خط نہیں لکھا؟

اب اپنی اور شکایتوں کا جواب سنو:۔ دکانداروں کو دھوکا دینے کی میری نیت نہ تھی، جس وقت چیزوں کا میں نے آرڈر دیا بینک میں میرے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ موجود تھے، ایک تو والد صاحب ہی نے سفر کے اخراجات کے لئے کافی روپے بھیجے تھے، دوسرے یہ کہ میں نے والدہ صاحبہ کو لکھ کر اور روپے منگوائے تھے، کیمبرج سے روانہ ہونے سے ایک دن قبل میں نے لائیڈز بینک سے کل روپے نکال لئے اور اپنا کھاتا بند کرا دیا، ارادہ تھا کہ دکانداروں کے روپے اسی وقت جا کر ادا کر دوں،

بی بی نے چھوٹتے ہی کہا کہ "میں نے اپنی نظموں میں کوشش کی ہے ......" لیکن بڈھے کے جوش و خروش نے اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ "نہیں میں اس کا قائل نہیں۔" اس نے سوچ کر جواب دیا اور پھر ذرا ٹھہر کر وہ کہنے لگا۔ "میں نہیں مانتا کہ روح موت کے بعد زندہ رہتی ہے۔ مجھے اس کا رنج ضرور ہے، لیکن کیا چارہ ہے، مجھے بڑا صدمہ ہے کہ اس قدر مشقت سے جمع کی ہوئی علمی پونجی میرے مرجانے کے بعد خاک میں مل جائے گی۔ میں نے نہ تو کوئی کتاب لکھی ہے، نہ کبھی ان کے متعلق کوئی لیکچر دیا ہے۔ میری عمر ملازمت میں گزری ہے (وہ فرانسیسی کونسلر سروس میں تھا) اور مجھے شاذ و نادر ہی ایسے ذہین لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو میرے علم سے مستفید ہو سکتے۔ مجھے ایسے مواقع بھی کم ملے کہ میں اپنا علم دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا، اس علمی سرمایے کا ایک لفظ بھی میرے بعد نہ بچے گا اور اگرچہ مجھے اس کا صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر نوشتہ قدرت کے مقابلے میں سوائے سر جھکانے کے چارہ ہی کیا ہے، اس پر بھی میں کتب بینی سے باز نہیں آتا۔ میں پڑھتا اس لیے ہوں کہ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس ضعیفی میں میرے لئے یہی ایک واحد ذریعہ تفریح ہے باوجودیکہ میری موت کے دن قریب آتے جا رہے ہیں، میں پڑھے جاتا ہوں، بلکہ یہ معلوم کر کے کہ میری زندگی اب تھوڑی سی رہ گئی ہے میں اور زیادہ کتب بینی کرتا ہوں، انتہائی عجلت کے ساتھ، مجھے ان باتوں سے آگاہی حاصل کرنی ہے جن سے میں اب تک نابلد ہوں، صبح کو اُٹھتے کے ساتھ ہی پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہوں اور دن بھر پڑھا کرتا ہوں، سونے کے وقت تک پڑھتا رہتا ہوں، کبھی کبھی میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ "اب جب کہ میں سال دو سال سے زیادہ جی نہیں سکتا تو کیا کتابوں کے مطالعے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟""

ایک برس کے بعد جب میں اس سے پھر ملا تو وہ اتنا بیمار تھا کہ بیٹھے بیٹھے بات چیت نہیں کر سکتا تھا، اور اس نے مجھ سے اجازت چاہی کہ لیٹے ہی لیٹے گفتگو کرے۔ دورانِ گفتگو میں وہ کبھی کبھی یکایک قلب پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور چپ چاپ ہو جایا کرتا تھا، افاقے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتا۔ "(کومیڈی آف ہیومرس) ذرا عامیانہ تو ضرور تھی، لیکن یہ خیال کہ سیرت کی انفرادیت اعادے سے نمایاں ہو جاتی ہے، بلاشبہ صحیح تھا اور چیخوف کے سے دقت پسند جانتے تھے کہ محض کسی بات کے دہرانے سے نازک خصوصیات بھی ظاہر کی جا سکتی ہیں۔"

"اب تم سناؤ، میں ہندوؤں کی ایک نظم کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے سناؤں گی، مجھے یقین ہے کہ مسٹر ......"

لیکن وہ بولتا ہی رہا، "شیلی کی شاعری کا موضوع مابعد الطبیعیات ہے، لیکن میں فرانسس ٹامسن کے ہونڈ آف ہیون (آسمان کا شکاری کتا) کو صوفیانہ نظم سمجھتا ہوں، اور اسپنسر کی فیری کوئین (پریوں کی ملکہ) اس نے اپنے قلب پر ہاتھ رکھا اور دس منٹ تک خاموش رہا۔ جب اُسے افاقہ ہوا تو اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا کتب خانہ مکمل ہے، یہ خیال کر کے بڑی اذیت ہوتی ہے کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔ ابھی ایسی کتابیں بھی ہیں جو میں نے اب تک نہیں پڑھیں، یہی وجہ ہے کہ میں رات دن پڑھتا رہتا ہوں، مجھے وقت کا مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی حرص ہے، لیکن یہ خیال کہ میں ایسی کتابیں چھوڑ جاؤں جو میری نظر سے نہیں گزری ہیں میرے لئے ناقابل برداشت ہے، کتابیں میری نظر میں انسانوں کی طرح ہیں۔" اُس نے اپنے مصنوعی دانتوں کو جو کسی سرکش چڑیا کی طرح جیسے کسی نے پنجرے میں بند کر رکھا ہو، ہر وقت باہر نکلے آتے تھے، بڑی کوشش سے درست کیا۔ اور پھر گویا ہوا۔ "اگر ہماری روح موت کے بعد باقی رہتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنا بہشت اپنے دل کی خواہش کے مطابق بنانے کا موقع

بوڑھا محقق

ادیب

مجھے جس عورت نے چائے پر بلایا تھا وہ نہایت حسین تھی، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کے باپ کے سامنے، اس کی تصویر جو میرے ذہن میں ہے بالکل ماند پڑ گئی ہے، اس کا باپ غضب کا ذہین تھا، اور اس کا دماغ بڑی سرعت کے ساتھ کام کرتا تھا، یہ لوگ ایک سفید رنگ کے مکان (ولا) میں رہتے تھے، جو جاکنائے کی دوسری کنارے پر سمندر سے قریب پائن کے جنگل کے درمیان تھا، تولون سے وہاں پہنچنے میں کشتی کے ذریعے آدھ گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔

وہ میرے آنے کے دو ہی ایک لمحے کے بعد آیا، وہ نہایت ضعیف اور بیمار تھا، اس کی مونچھ نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی، زیرپائیاں جو خواب گاہ کے لئے مخصوص ہیں اس کے پاؤں میں تھیں اور اس کا گدی دار جیکٹ گلے تک بند تھا۔

یہ معلوم کر کے کہ میں ناول لکھتا ہوں اس نے خوش اخلاقی سے ادبیات کے متعلق گفتگو کرنا ضروری سمجھا وہ اپنی معلومات کا اظہار بڑے لقلقے کے ساتھ کر رہا تھا نہ اسے کوئی چیز روک سکتی تھی اور نہ کوئی اس کی گفتگو میں مداخلت کر سکتا تھا، اس کی بی بی بھی شاعرہ ہونے کی مدعی تھی، اس نے کئی بار اس بات کی قابل رحم کوشش کی کہ مجھے اپنے متعلق اخبارات کی حوصلہ افزا رائیں دکھائے، لیکن بالکل بے سود، بڈھے کو بہت کچھ کہنا تھا، اور ایک ذوق ادب رکھنے والے مہمان کے سامنے اپنی واقفیت کی نمائش کا جو موقع اسے ملا تھا، اسے اپنی بی بی کی خودنمائی کی خاطر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بی بی کے اشعار، جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، محض ادنے درجے کے تھے، وہ بہت سخت بیمار تھا، اور ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ بولنا اس کے لئے تکلیف دہ تھا، لیکن اس کے باوجود خاموش رہنا اس کے لئے ناممکن تھا، اس کے مصنوعی دانت دوران گفتگو میں ایک خوف ناک انداز سے کھڑکھڑاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر کہتا تھا "معاف کیجئے گا میں ذرا لیٹ رہوں، میں فوراً ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس کی بی بی ایسے ہی موقع پر کود پڑتی تھی اور اپنی نظموں کا ذکر کرنے لگتی تھی لیکن زیادہ دیر کے لئے نہیں، بڈھا صوفے پر اپنے پاؤں کو سمیٹ کر بیٹھ گیا، اور پھر سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا "عہد الیزبتھ کا دوسرا شاعر جس کا میں دلدادہ ہوں ......" اس کا علم حیرت انگیز تھا، اس کے علم کی وسعت کل ممالک پر حاوی تھی اور بالکل ابتدا کے زمانے سے شروع ہو کر موجودہ زمانے پر ختم ہوتی تھی، انگریزی ادب میں چاؤسر کے وقت سے ڈیوڈ گارنٹ کے وقت تک کے مصنفین سے اسے واقفیت تھی، غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ پڑھنے میں وہ ایک لفظ سمجھ لیتا تھا، لیکن انگریزی الفاظ کا تلفظ اس کے لیے مشکل تھا، اگر احیاناً کوئی لفظ اس کی زبان پر آتا تو اس کا تلفظ غلط ہوتا تھا اس کا علم مجھے نہایت صحیح اور اس کی ناقدانہ رائیں منصفانہ معلوم ہوئیں، ہاں یہ ضرور تھا کہ مواد کی فراوانی کی وجہ سے وہ کسی مصنف کے کمالات ذاتی کے متعلق اظہار رائے کی جگہ یہ پتا چلانے کی کوشش کرتا تھا کہ اس پر کس کس کا اثر ہوا ہے۔

صوفیانہ شاعری کا ذکر آیا، تو میں نے اس کی رائے بقائے روح کے متعلق دریافت کی، وہ ٹھٹک گیا، جب سے وہ صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھا تھا، اس سے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوا تھا، اس کی

ادبی و علمی معلومات

مکتوبات

خطوط خواہ ذاتی اور نجی ہوں یا علمی اور ادبی، کسی حال میں بھی ان کا مطالعہ غیر مفید نہیں ہوتا۔ ذاتی خطوط میں انسان بہت سی
ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو دانستہ طور پر وہ کبھی لکھ کر دینے کو تیار نہ ہو، اس سے لکھنے والے کی شخصیت و ذہنیت اور کردار کا صحیح پتہ چلتا ہے اور
علمی خطوط اپنے اندر بہت سے نایاب خزانے چھپائے رہتے ہیں جن سے ہم بے حد مستفید ہو سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں ایسے خطوط جن سے
کچھ کام کی باتیں معلوم ہوتی ہوں اور جن سے علم و ادب کے سوتے پھوٹتے ہوں، وہ صرف مکتوب الیہوں کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ اس میں
آدمی کا حصہ ہے جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے، اس لئے ہماری رائے میں ادبی خطوط افراد کی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے، یہ جماعت اور قوم کی
چیز ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اچھے خطوں کی تلاش میں رہیں اور انھیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہیں۔

سرسید شبلی اور اکبر کے یہ خطوط ان کے خطوط کے مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں ہم نے پٹنہ میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسہ
کے موقع پر قلمی کتابوں، سکوں اور پرانے خطوط اور دستاویزوں کی نمائش کی تھی، یہ خطوط بزرگان صادق پور سے ملے تھے اور ہمیں [illegible]
صاحب کی عنایت سے اس بات کا موقع ملا کہ ہم ان خطوط کی نقلیں لے سکے۔

سرسید کا پہلا خط سید اشرف علی صاحب ایم اے کے نام ہے، ان کا تعلق خاندان صادق پور سے ہے اور یہ خاندان انگریز دشمنی اور وہابی تحریک
کی بنا پر کافی مشہور رہا ہے۔

مولنا امجد علی ایم اے، مولنا یحیی علی مرحوم کے صاحبزادے تھے جنھیں انگریزی عدالت نے عبور دریائے شور کی سزا دی تھی اور جو
میں ۱۸۶۸ء میں انتقال کر گئے تھے۔ سید امجد علی صاحب بنارس، علی گڑھ اور الہ آباد میں پروفیسر بھی رہے تھے۔ عربی زبان کے بڑے عالم
تھے۔ آپ نے ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔

اکبر الہ آبادی کے مکتوب الیہ شمس العلماء مولنا امجد علی عظیم آبادی ہیں اور شبلی نعمانی کے مخاطب مولنا اشرف علی ایم اے۔

احسن مارہروی کے خطوط کے لئے ہم ان کے صاحبزادے سید شاہ محمد احسن صاحب مارہروی اسسٹنٹ رجسٹرار علی گڑھ کے ممنون ہیں جنہوں نے
کرم فرما کر مکاتیب احسن کا پورا مسودہ ہمارے حوالے کر دیا۔ ہمیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان کے لائق شاگرد صغیر احسنی "احسن المکاتیب" کے
نام سے ان کے سارے خطوط شائع کر رہے ہیں۔ موجودہ خط جناب عبد اللطیف اعظمی (جامعہ ملیہ) کے نام ہے۔

مولنا آزاد کی ذات گرامی مختلف صفات کی حامل رہی ہے۔ علوم و فنون کے مختلف پہلوؤں پر دسترس اور کمال حاصل ہے۔ غبار خاطر کی
نے ایک زمانہ گوشہ سے نقاب سرکایا ہے۔ مولنا نے یہ خط خورشید الاسلام صاحب کے مضمون "شبلی" (مطبوعہ علی گڑھ میگزین) کے مطالعہ کے بعد جناب
نواب رشید احمد صاحب صدیقی کے نام لکھا تھا۔ ہم مولنا کے اصل خط کا عکس چھاپنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبد الحق کے یہ خطوط ہندوستان کے مشہور محقق قاضی عبد الودود بی اے (کنٹب) بار ایٹ لا کے نام ہیں۔ قاضی صاحب ہم سے وعدہ فرما چکے تھے
وہ محمود شیرانی مرحوم کا ایک نہایت قیمتی ادبی و علمی خط ہمیں شائع کرنے کے لئے دیں گے۔ متعدد یاد دہانیوں کے باوجود وہ خط ہم تک نہ پہنچ سکا۔ ناچار اتفاقاً ہم عبد الحق
صاحب کے یہ خطوط جو اتفاق سے ہمارے پاس تھے قاضی صاحب کی اجازت کے بغیر شائع کر رہے ہیں۔

فصاحت جنگ جلیل کا یہ خط ہمارے فاضل دوست [illegible] صاحب شروانی کا عطیہ ہے [illegible] صاحب "باغی" [illegible] "اور کاروان خیال"
[illegible]
[illegible] تلامذہ میں ہیں۔ ریاضی کی [illegible]

دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو میرے بہشت میں بڑے بڑے ہوادار کمرے ہوں گے، جہاں بے شمار کتابیں ہوں گی ان گنت کتب خانے، جہاں میں ہمیشہ کتابیں پڑھتا رہوں اور تنگیٔ وقت کی کبھی شکایت نہ ہو۔"

"لیکن کس قسم کی کتابیں؟ یہی کتابیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں، بہت سی کتابیں ابھی ایسی ہیں جنھیں میں مرنے سے قبل ختم نہیں کر سکتا، وقت قریب آتا جاتا ہے۔" میں رخصت ہو رہا تھا کہ اس نے میز پر جو پارسل رکھا تھا، اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"فارسی شاعری۔"

"اچھی کتابیں ہیں؟"

"ابھی تک پارسل کھولا نہیں، پھر ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

اس کے بعد جو میں گیا تو رات کا وقت تھا مینھ پڑ رہا تھا (میرے چند دوستوں نے جو خاکنائے پر مقیم تھے مجھے مدعو کیا تھا، دعوت کی تاریخ مجھے غلط یاد تھی اور وہ آخری گاڑی جو تولون جاتی تھی چھوٹ گئی تھی) ملازمہ نے کہا کہ بیبیاں شہر گئی ہیں اور غالباً ابھی رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔ میں کتب خانے میں ان کے انتظار میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مجھے قدموں کی آہٹ نے چونکا کر دیا، یہ آنے والا وہی بڈھا تھا جو وہی لباس پہنے تھا جس میں پہلی بار میں نے اُسے دیکھا تھا، چاند کی روشنی میں جو برآمدے کے شیشوں سے گزر کر اندر آ رہی تھی، یہ ضعیف شخص بھوت کی طرح سفید معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اپنی خواب گاہ سے کتب خانے میں کوئی کتاب لینے آیا تھا میں کھڑا ہو گیا، وہ بھی ٹھہر کر مجھے دیکھنے لگا۔ بعد ازاں الماری کی طرف جا کر اس نے دو بڑی بڑی جلدیں نکال لیں۔ اور پھر دروازے سے باہر چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ یا تو اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، یا وہ خواب کی حالت میں یہاں چلا آیا تھا یا بیماری نے اُس کی بینائی کو کم کر دیا تھا۔

صبح کے وقت جب اس کی بی بی اپنی لڑکی کے ساتھ تولون سے واپس آئی تو میں نے اُس سے کہا "آپ کے شوہر شب کو کتابیں لینے کے لئے نیچے اترے تھے، لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے، یہ سن کر وہ مجھے تعجب کے ساتھ گھورنے لگی، "وہ تو تین ہفتے ہوئے جمعے کے دن انتقال کر گئے۔"

"میں نے تو رات انہیں دیکھا تھا، وہ دو کتابیں کتب خانے سے نکال کر ساتھ لے بھی گئے۔"

ہم لوگ فوراً اس بات کی تحقیقات کے لیے کتب خانے میں گئے۔ اس کی بی بی نے ان جلدوں کی خالی جگہ کو فوراً دیکھ لیا۔ اور فہرست دیکھ کر ان دونوں کتابوں کے نام بھی معلوم کر لیے، یہ لارڈ بائرن کے خطوط تھے، پہلی اور دوسری جلد۔

شب وصال جھلکتا ہوا وہ پیراہن
جو جاگنے کی تمنا کرے وہ سو سو جائے
وہ رس میں ڈوبی ہوئی اور ادھ کھلی آنکھیں
نگاہ ان سے ملائے کوئی تو دل کھو جائے
یہ تیرگی، یہ اندھیرا، یہ ظلمتوں کے پڑاؤ
یہ اپنا دل ہے کوئی اور ہو تو خوں ہو جائے
نہ جانے کون سا جادو ہے تیری آنکھوں میں
اُٹھے یہ جب بھی تغافل کہ داغ دھو جائے

(رفیق اختر)

---

(۶)

مولانا!

آپ کے فضل و کمال کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہوگا باوجود اس کے میں نے انجمن اردو میں آپ کو تکلیف نہیں دی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اس طرف آپ کے میلان کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔ آج ایک صاحب کے خط سے کچھ امید بندھی تو یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ روداد انجمن اردو اور رسالہ خدمت ہے۔ سب سے بڑا کام لغات علمیہ کا ترجمہ ہے۔ ناگری پرچار سبھا نے سات جلدوں میں سائنٹفک لغت تیار کر لیا۔ لیکن ہمارے یہاں کون کرے گا۔ انگریزی دان عربی سے کورے ہیں و بالعکس۔ مصطلحات کمسٹری الگ چھپوا لئے ہیں۔ وہ بھیجتا ہوں۔ کیا آپ اس کا کوئی حصہ ترجمہ فرما دیں گے؟ ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ارسطو کی منطق کا جو انگریزی میں ترجمہ ہوگئی ہے۔ ترجمہ کیا جائے تاکہ موازنہ ہو سکے کہ مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔ دوسرا کام میں کر دوں گا۔ لیکن کیا آپ پہلا کام کر دینگے۔ غرض آپ اس مد میں جو کچھ کر سکیں اس سے مطلع فرمائیں۔

شبلی۔ حیدر آباد ۱۴ مئی ۱۹۰۴ء

(۷)

نادر منزل۔ سیف آباد
حیدر آباد دکن۔ ۲۲ نومبر ۳۷ء

مشفقی و مکرمی۔ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ جس ہمت اور مستعدی سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں وہ بہت قابل داد ہے۔ آپ اور مولانا ابوالکلام کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ پرلطف ہے۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ اگر گورنمنٹ ہماری تجویز منظور نہ کرے تو بلاشبہ ہمیں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی کوشش کرنی چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام کا خط میرے پاس محفوظ ہے اس میں انھوں نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ میں اس خط کی نقل آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں آپ کو پہلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ تمام تجویزیں پیش نظر ہیں۔ اس وقت میں سرمایہ کی فکر میں ہوں یہاں جو امداد کی درخواست دی تھی وہ معاملہ دیر ہو رہا ہے۔ ذرا مجھے اس سے فارغ ہو لینے دیجئے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں یہ ہوا تو سب ہیچ ہے۔

انجمن دہلی پہنچتے ہی ماہانہ رسالہ شائع کرے گی جس کا نام ہوگا "ہماری زبان"۔ اس میں افکار و واقعات جیسی سب چیزیں آجائیں گی یہ رسالہ پروپیگنڈا کا کام بھی دے گا اور معلومات کا بھی، زبان آسان ہو گی جسے سب سمجھ سکیں۔ اڈیٹر وغیرہ سب میں نے تجویز کر لیا ہے۔

عبدالحق

(۸)

۱۰ مئی ۴۸ء

شفیقی و کرمی۔ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ بہت ممنون ہوں۔ آرزو جلیلی صاحب کی رپورٹ ابھی تک مجھے نہیں ملی، حیدر آباد کی ڈاک بھی یہیں آجاتی ہے شاید کل پرسوں تک آجائے۔ اپنی رپورٹ آپ میرے نام نہیں بھیج دیں۔

کتب خانہ کے حالات معلوم ہوئے۔ بہت افسوس ہوا۔ ہماری قوم کے لوگ بھی عجیب و غریب ہیں۔ نہ خود کام کریں اور نہ دوسرے کو کرنے دیں۔ آپ کو ایسے لوگوں کے اعتراضات کی مطلق پرواہ نہیں کرنا چاہیئے، مگر آپ کو بددل بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا آپ کے الگ ہو جانے سے معاملات درست ہو جائیں گے؟ میرے خیال میں تو اور بدتر ہو جائیں گے۔

مہربانی کر کے تذکرۂ میر حسن کی تکمیل (جس طرح بھی ممکن ہو) فرما دیجئے بڑی عنایت ہو گی۔

دیوان جوشش کے متعلق ذرا نظامی صاحب کو لکھئے کہ یہ کیا بات ہے۔ چھوٹی سی کتاب ہے چند روز میں طبع ہو سکتی ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ یہاں سے واپسی میں پٹنہ ٹھہرتا ہوا جاؤں اور آپ کو پہلے سے اطلاع کر دوں گا۔

عبدالحق

(۱)

مخدوم و شفیق من مولوی سید اشرف علی صاحب ایم۔ اے

بہ وقت مراجعت پٹنہ سے آپ ضرور مجھ سے ملتے جائیے گا۔ ایک امر آپ سے کہنا ہے اور بغیر زبانی کہے طے نہیں ہو سکنے کا۔ مولوی امجد علی صاحب کو شادی کی مبارکباد دیتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ آپ کو بھی دو دن یا نہیں۔ یہاں سب دوست منتظر ہیں کہ مولوی امجد علی صاحب تشریف لاکر بہت بڑی دعوت شادی کی تقریب میں کریں گے۔ مولوی محمد حسن صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ مولوی امجد علی صاحب کی خدمت میں بشرطیکہ اُن کا ارادہ علی گڑھ میں آکر دعوت کرنے کا ہو، سلام

والسلام خاکسار

سید احمد علی گڑھ ۱۷ر جولائی

(۲)

جناب مولانا مولوی سید امجد علی صاحب ایم۔ اے

آپ کا عنایت نامہ اگرچہ دل خراش تھا جو کچھ مصائب و ترددات و پریشانی فرمادیں بجا ہے۔ بہر حال "از تن برضائے قضا داد چارہ نیست"۔ قبل آنے عنایت نامہ آپ کے تاریخ (اکرم خوردہ) مقرر ہو چکی ہے اکرم خوردہ) ۲۱ر جولائی، روز یکشنبہ معلوم نہیں آپ کی حالت کے مناسب ہے یا نہیں۔ بہر حال یہ تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ کاغذات منمولی چھپ گئے ہیں۔ دو تین روز میں روانہ ہوں گے۔

والسلام

خاکسار سید احمد علی گڑھ ۸ر جون ۱۸۹۵ء

محمد موسیٰ کا حال معلوم نہیں کس طرح ہے اور آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔

(۳)

مخدومی مکرمی مولوی سید محمد امجد علی صاحب۔

۲۱ جولائی کو (اکرم خوردہ) کا اجلاس ہوگا۔ امید کہ آپ اس میں شریک ہوں گے۔ مگر ابتک آپ نے اطلاع نہیں دی کہ کس وقت اور کس تاریخ آپ تشریف فرما ہوں گے۔ اگرچہ وقت اجلاس گیارہ بجے لکھا گیا ہے مگر ہم ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کریں گے تاکہ دہلی سے جو لوگ آنے والے ہیں وہ بھی آجاویں۔

والسلام

خاکسار سید احمد ۱۷ر جولائی ۱۸۹۵ء

(۴)

مخدومی و مکرمی مولوی سید امجد علی ایم اے

میری چٹھی پہونچنے کے بعد مسٹر تھیوبالڈ پرنسپل کالج نے کیا کہا۔ میری رائے جو اردو میں چھپی ہوئی ہے اس کو کس سے سنا اور مطالعہ فرمایا یا یونہی ڈالدی۔ اگر آپ ازراہ مہربانی سو روپیہ اپنی بخشش کے ابھی مہینہ میں بھیجدیں گے تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔

والسلام

خاکسار سید احمد علی گڑھ ۴ر اکتوبر ۱۸۹۶ء

(۵)

میرے مکرم و معظم عنایت فرما

میں نہایت خوشی سے آپ کو شمس العلماء کا خطاب پانے کی مبارکباد دیتا ہوں اگرچہ اس دو سطری مبارکبادی سے کچھ کام نہیں چلتا۔ آپ کے دوستوں کو ضرور ہے کہ عام جلسہ خوشی کا کریں۔ ڈنر ہو۔ اسپیچیں ہوں۔ لیکن افسوس کہ میں وہاں موجود نہیں ہوں۔ لہٰذا اسی خط مبارکباد پر اکتفا کرتا ہوں۔ بڑے دن میں برابر بیمار رہا اور سخت۔ اس سبب سے نہ مل سکا۔

خادم و معتقد

اکبر حسین آگرہ [illegible] ۱۸۹۶ء

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا مکتوب گرامی

جو انھوں نے علیگڑھ میگزین کے مطالعے کے بعد
علی گڑھ میگزین کے نگراں رشید احمد صدیقی صاحب کے نام
ارقام فرمایا

DEPARTMENT OF EDUCATION, HEALTH & LANDS • INDIA •

۸ مئی
دہلی

صدیقی صاحب سالانہ میگزین کو دیکھا، خورشید الاسلام صدیقی نے اس سالانہ میگزین
میں ایک مضمون شبلی مرحوم پر لکھا ہے۔ انھوں نے شبلی مرحوم کی نسبت
جو رائیں قائم کی ہیں ان سے مجھے کوئی تعلق نہیں لیکن ان کا اسلوب تحریر
دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ میں نے ہمیشہ افسوس کے ساتھ محسوس کیا ہے
کہ اردو میں ایک عام تقلیدی رنگ کے سوا تجدید و تازگی مفقود ہے۔
ہمارا نیا طبقہ نئی تعلیم کی پیداوار ہے اسلیے ان سے توقع کی جاتی تھی
کہ یورپ کے ادبی اسالیب و مذاہب کو اپنے اندر جذب کرینگے
اور تجدید و تازگی کے نمونے نمایاں کرسکیں گے لیکن بہت کم کوئی
ایسی چیز نظر سے گزرتی ہے۔ میں ادھر سترہ اٹھارہ برس سے
انگریزی مطالعہ میں کھویا گیا ہوں اور اردو اخبار و رسائل کی کم خبر
رکھتا ہوں اسلیے ممکن ہے ادھر کی رفتار ترقی مجھے معلوم نہ ہو
بہرحال یہ مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وضعی معلوم ہو یا نہ ہو
لیکن انھوں نے ایک نئے اسلوب کا تتبع کیا ہے
یہ صاحب کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں ممکن ہو
تو مطلع کیجیے

(۹)

۴ مارلیسن روڈ

لطف فرمائے تسلیم

گرامی نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ جس مسئلہ کے متعلق جناب نے خاکسار کی رائے دریافت کی ہے اس کا جواب حسب ذیل ہے۔

لفظ "نکات" کے باب میں مجھے ان حضرات کی رائے سے اتفاق ہے جو بکسر اول یہ صحیح سمجھتے ہیں اگر کسی لفظ کی صحت و عدم صحت کا مدار لغت پر ہے تو غیاث اللغات کی یہ عبارت پڑھی جائے: نکات بکسر اول جمع نکتہ و بضم محض غلط' چراکہ وزن فعال بضم از اوزان جمع نیست (از منتخب و مدار و بہار عجم و مزیل) نکتے کی ایک جمع 'نکت' بھی ہے وہ بضم نون ہے۔ جو حضرات نکات کو بضم نون غلط العام فصیح کے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ اگر مسٹر ننھلے آئی سی ایس قسم کے لوگ ہیں تو ان کے نزدیک مرض۔ عرق۔ ورق۔ شرف وغیرہ بھی بہ سکون اوسط ہونا چاہئیں۔ دراں حالیکہ یہ الفاظ بفتحتین ہیں۔ اسی طرح حذف بسکون اوسط ہے مگر آج کل یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ تمام پی ایچ ڈی قسم کے حضرات کی زبانوں سے غلط استعمال ہوتے ہیں، بیشک بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جنھیں خلاف لغت استعمال کیا گیا ہے تحقیق لغت میں قیاس آرائی بے کار ہے صرف استعمال مستند و معتبر ہے۔

امروز۔ امشب۔ امسال پر قیاس کر کے ام سحر۔ امشام۔ ام لیل نہیں بول سکتے۔ وہ اہل علم اور ارباب قلم جن کی تحریریں مسلّم و معتبر ہیں اور جنھیں مجتہد فن کا مرتبہ حاصل ہے۔ اگر ان کے استعمال میں کوئی لفظ خلاف لغت مستعمل ہو گیا ہے اور متفق علیہ مروج ہو چکا ہے وہ فصیح سمجھا جائیگا اور انھیں فصحاء کو زمرۂ عام میں مانا جائے گا ورنہ بلحاظ استعمال تخت، دقت (بسکون اوسط) کو تخت، دقت بفتحتین بولئے۔

منحصر کو منصر اور فصیل کو سفیل بولنے والے جہلاء اور بازاری لوگ ہیں اور اس زمرے میں وہ حرف شناس آجاتے ہیں جنھیں فن سے آگاہی نہیں اور ادبی حیثیت نہیں رکھتے ان کو عوام کہا جائے گا نہ عام۔ میرے نزدیک غلط العام فصیح کے ساتھ یہ فقرہ بڑھانا چاہئے کہ غلط العوام قبیح۔

احسن مارہروی ۲۶ اپریل ۳۷ء

(۱۰)

سلطان پورہ
حیدر آباد دکن۔

دل نواز۔ سلام مسنون

غزل دیکھ کر بھیجی جاتی ہے، رسالہ منقبت اور دیوان ریاض کا نمونہ پہنچا بہت بہت شکریہ۔ الحمدللہ کہ دیوان ریاض کے طبع کا آغاز ہو گیا ایک مدت کی آرزو اللہ نے پوری کی۔ مگر افسوس ہے کہ ریاض کے بعد اس کی نوبت آئی۔ کاغذ اور تقطیع بہت مناسب ہے، لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے خدا کرے جلد تکمیل کو پہنچ جائے اردو میں ہرج بسکون را مستعمل ہے۔ جہاں کی طرح کہاں وغیرہ کا بھی الف نہ گرنا چاہیے باقی رہی غنّہ تو ہر ایک کا گرتا ہے۔ میں خیریت سے ہوں اللہ کا شکر ہے، ایک آنکھ قدح کرائی گئی ہے حالت بفضلہ تعالیٰ اچھی ہے۔

فصاحت جنگ جلیل ۲۷ جنوری ۳۵ء

خطبات

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

عزیزانِ گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے یقین۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں پکارا تو تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قطع کر لئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست" جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے۔ اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعتراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دورِ افتادہ صدا۔ جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے ہی اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا۔ جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جس پہ تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشار سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک عام طور پر فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی۔ اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔" آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بُری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔ ہاں تمہاری

پنڈت جواہر لال نہرو

خطبۂ تقسیم اسناد۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی گڑھ اور اس یونیورسٹی میں میری آمد ایک طویل وقفے کے بعد ہوئی ہے۔ نہ صرف وقت کے فاصلے نے بلکہ نظریہ اور نصب العین کے بُعد نے بھی ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ یا ہم میں سے بہت سے ہم [illegible] رات آج کس طرح سوچ رہے ہیں کیونکہ پچھلے دنوں ہم جس دماغی بحران اور دل شکستگیوں کا شکار رہ چکے ہیں انھوں نے ہمارے درمیان شکوک اور شبہات کی راہیں کھول دی ہیں۔ آج واقعات کی رفتار غیر یقینی ہے لیکن مستقبل کی راہ تو اس بھی زیادہ تاریک اور دشوار گذار ہے، تاہم ہمیں حال کا مقابلہ کرنا ہے اور مستقبل کو اپنے موافق ڈھالنا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو دیکھنا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ مستقبل پر اعتماد کامل کے بغیر ہمیں حالات اور وقت کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی، ورنہ زندگی کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد باقی نہیں رہ جائیگا جس کے حصول کی خاطر جد و جہد کی جائے۔

مجھے آپ کے وائس چانسلر کا دعوت نامہ منظور کرنے میں خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں آپ سب سے مل کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کے دماغ میں کیا باتیں ہیں اور آپ کو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ خود میرے اپنے دماغ میں کیا کیا ہے ہمارے لئے ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے اور اگر ہم ہر بات پر اتفاق نہیں کر سکتے تو کم از کم اتفاق رائے پر اتفاق کرنا چاہیئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کس بات پر ہم متفق ہیں اور کس بات پر اختلاف رائے ہے۔

ہندوستان کے ہر حساس انسان کو پچھلے چھ مہینے میں اذیت اور تکلیف پہنچی ہے اور سب سے معیوب بات یہ ہوئی ہے کہ ان کی روح کی ذلت ہوئی۔ معمر اور تجربہ کار لوگوں کے لئے یہ کافی تکلیف دہ تھا لیکن مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے کیا احساسات ہیں جو اپنی زندگی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور جنھوں نے آلام و مصائب اور تباہی کو دیکھا اور اُن کا مقابلہ کیا ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ اس پر غالب آجائیں گے لیکن بہت ممکن ہے کہ ان کی باقی زندگی پر اس کے نشانات باقی رہیں۔ لیکن اگر ہم دانشمند ہیں اور اب بھی صحیح راستہ پر چلنے کی طاقت رکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم اس داغ کو دھو ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مجھے ہندوستان پر فخر ہے صرف اس کی قدیم عظیم الشان میراث کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ دور دراز کے ملکوں سے آنے والی فرحت افزا اور تازگی بخش ہوا کے لئے اس نے اپنے دماغ اور اپنی روح کے دریچے اور دروازے کھلے رکھ کر ثابت کر دیا کہ اس میں اضافہ کی عجیب و غریب اہلیت موجود ہے۔ ہندوستان کی طاقت کا راز دو باتوں میں مضمر ہے اس کا اپنا فطری تمدن جو کئی صدیوں میں پروان چڑھا ہے اور دوسرے ذرائع سے مستفیض ہو کر اپنے تمدن کو مالا مال کرنے کی اہلیت۔ اس میں خود اتنی توانائی موجود ہے کہ وہ باہر سے آنے والے دھاروں کی رو میں نہ بہہ سکا اور اس میں اتنی دانشمندی بھی موجود ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ان سے علیحدہ بھی نہیں کیا اسی وجہ سے ہندوستان کی حقیقی تاریخ میں ایک مسلسل ترکیب اور امتزاج ہے اور متعدد سیاسی تبدیلیوں کا تنوع لیکن اس کے [illegible] ہی ساتھ اس کے متحدہ تمدن کے نشو و نما پر بہت کم اثر پڑا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی میراث اور اپنے آبا و اجداد پر فخر کرتا ہوں جنھوں نے ہندوستان کو ذہنی اور تمدنی برتری بخشی ہے۔

اس ماضی کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ کیا آپ بھی اس کے حصہ دار اور وارث ہیں اس لئے آپ بھی اس چیز پر فخر کرتے ہیں جو آپ کی بھی اتنی ہی ملکیت ہے جتنی میری ہے یا آپ اس سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں اور اس کو سمجھے بغیر اس کا خرچ کرتے ہیں وہ عجیب و غریب احتراز بھی محسوس کرتے ہیں جو اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس شاندار خزانے کے ولی اور وارث نہیں ہیں؟ میں آپ سے یہ سوال اس وجہ سے کرتا ہوں کہ پچھلے چند برسوں بہت سی ایسی طاقتیں کار فرما رہی ہیں جنھوں نے عوام کے دماغ غلط راہوں میں مبذول کر دیئے تھے اور تاریخ کے راستہ کو مسدود کرنے کی کوشش کی تھی۔

آپ مسلمان ہیں اور میں ہندو ہم مختلف مذہب کے پیرو ہو سکتے ہیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کسی مذہب کو نہ مانیں لیکن اسی وجہ سے ہم اس ثقافتی میراث سے محروم نہیں ہو سکتے۔ جو آپ سب کی ہے۔ ماضی ہم سب کا مشترک ہے اس لئے حال یا مستقبل ہمیں روحانی طور پر کیوں [illegible]

بے قراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور بری شے ہی کو نجات ادی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی
سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور
آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ
بھی درپیش آگیا ہے۔

میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا
انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔
یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو، تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اپنے
دماغ کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے
مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں
نے وضو کیا تھا اور تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا۔ اسی طرح
آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع
ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا
کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں
ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی
معرفت فرمایا۔ انّ الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا یحزنون (جو خدا پر ایمان لائے اور
اس پر جم گئے تو ان کے لئے نہ تو کسی ڈر ہے اور نہ کوئی غم)۔ ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں
ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ
اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔
اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمہارے اندر
سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اسی طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان ہی صفحوں میں زیب عنوان بن
سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک
رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو۔ کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی
حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے
ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو
پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود
خود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں
میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں کڑکیں تو ان پر مسکرا دئیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا۔
آندھیاں آئیں تو ان سے کہہ دیا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی
گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس کا پرانا نسخہ ہے، وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا
محسن لایا تھا اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان۔ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم [illegible]

کافی سے زیادہ مظاہرہ ہو چکا اور اس کے زہریلے اثرات سے ہم خوب متاثر ہو چکے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم فرقہ پرستی کی لعنت سے نکلیں جہاں تک میرا تعلق ہے تعلیمی ادارے کا کیا ذکر میں قومی زندگی کے کسی شعبہ میں فرقہ واریت کو پسند نہیں کرتا۔ تعلیم کا منشا تو یہ ہے کہ انسان کی روح اور ذہن کے جذبات آزاد رہیں نہ کہ ان کو فرقہ پرستی کے شعلوں میں اور محصور کر دیا جائے۔

میں اسے پسند نہیں کرتا کہ اس یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی رہے۔ اس طرح میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بنارس یونیورسٹی کو ہندو یونیورسٹی کہا جائے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی یونیورسٹی کسی مخصوص ثقافتی فن یا مخصوص طور پر تعلیم ہی نہ دے۔ میرے خیال میں یہ بالکل صحیح ہوگا اگر یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے تعلق رکھنے والے مضامین کی تعلیم خصوصیت سے دے۔

میری خواہش ہے کہ آپ خود ان مسائل پر غور کر کے ان کے نتائج کو اخذ کریں گے۔ ان نتائج کے لئے آپ کو مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ تو حالات کے فطری نتیجے کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے ہم آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی حیثیت یہاں غیر ملکیوں کی سی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ آپ بھی انڈیا کے جگر کے ٹکڑے اسی طرح ہیں جس طرح کوئی دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور آپ کو بھی ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے جو انڈیا اپنے باشندوں کو دے سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے حقوق سے متمتع ہونا چاہتے ہیں انھیں ذمہ داریوں میں بھی حصہ لینے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اگر ذمہ داریوں اور فرائض کے بار کو قبول کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حقوق خود بخود ملتے رہیں گے۔ میں آپ کو آزاد انڈیا کے آزاد باشندوں کی حیثیت سے دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنے عظیم ملک کی تعمیر میں اپنے فرائض کو محسوس کریں اور وطن کے اچھے اور برے وقت دونوں میں دوسروں کے ساتھ رہیں۔

موجودہ زمانہ اپنی تمام ناخوشگواریوں اور کلفتوں کے باوجود بھی گذر ہی جائے گا۔ اب تو مستقبل کی فکر کرنا چاہئے۔ خصوصاً آپ جیسے نوجوانوں کو جن کی طرف ہمارا مستقبل امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ اس آواز پر کہاں تک صدائے لبیک بلند کرتے ہیں۔

ضیاء احمد بدایونی

مولانا راغب بدایونیؒ

مولانا ابو الطیب یعقوب بخش صاحب راغب قادری، بدایوں کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عرصہ دراز سے دینی و دنیاوی دولت سے بہرہ ور اور علم و عمل میں معتبر رہا ہے۔ مولانا کے پرنانا مولوی علی بخش خاں شرر صدر الصدور زبردست فاضل اور ایک نادر کتب خانہ کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف سے کئی کتابیں جن میں سے چند سرسید کے رد میں لکھی تھیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ خاندان کے متعدد افراد آج کل بھی معزز عہدوں پر سرفراز ہیں۔

مولانا راغب مرحوم کی پیدائش [illegible] کے لگ بھگ ہوئی۔ قرآن مجید اور ابتدائی کتب ختم کرنے کے بعد درس نظامی کی تحصیل شروع کی۔ اور شہر اور خاندان کے علمی ماحول میں ایک آسودہ حال گھر کے نوجوان کو جو سہولتیں حصول علم کی راہ میں ممکن ہو سکتی تھیں سب سے فائدہ اٹھایا اور تھوڑی مدت میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ ان کے اساتذہ میں جناب مولانا رفاقت اللہ صاحب۔ حضرت فاضل اوحد مولوی محب احمد صاحب قادری اور حضرت مطیع الرسول شاہ محمد عبد المقتدر صاحب عثمانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان کی تعلیم معقول کا سلسلہ حضرت مولانا محب احمد صاحب کے واسطے سے خانوادۂ خیر آباد تک۔ اور علم حدیث کا سلسلہ حضرت مولانا سید یونس علی صاحب کے وسیلے سے خاندان ولی اللہی تک منتہی ہوتا ہے۔ مولانائے مرحوم بڑے جامع الکمالات انسان تھے۔ تفسیر و حدیث و فقہ، کلام و اصول میں تبحر کے ساتھ ساتھ تصوف فلسفہ۔ ریاضی۔ ہیئت۔ نجوم۔ رمل۔ جفر۔ طب۔ ادب۔ تاریخ اور دوسرے مختلف علوم میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ حدیث اور ادب سے ان کو خاص شغف تھا۔ حدیث کے رجال اور لغت کے شواہد پر حیرت انگیز عبور تھا۔ عربی لکھنے اور بولنے پر انھیں کامل قدرت تھی اور فارسی اور اردو کا بلند مذاق تھا۔ اسی کے ساتھ انگریزی اور سنسکرت بھی بقدر ضرورت جانتے تھے ذہن کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے مشکل مطالب بیک نظر مستحضر اور حافظہ کی یہ شان کہ ہزاروں اشعار اور حوالے نوک زبان رہتے تھے۔ انھوں نے کوئی بڑی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی کسی علمی کام شروع کئے مگر ناتمام رہے۔ قانون مسعودی کے چند مقالوں کا بھی ترجمہ کیا رسائل ذیل جو طبع ہو چکے ہیں مرحوم کی یادگار ہیں۔

سیاسی تبدیلیوں سے بعض نتائج پیدا ہوتے ہیں لیکن اہم تبدیلیاں صرف وہی ہیں جن کا تعلق کسی قوم کی روح یا اس کے نقطہ نظر سے ہے۔ پچھلے مہینوں اور برسوں میں مجھے جس چیز نے بے انتہا فکر مند بنایا ہے۔ وہ سیاسی تبدیلیاں نہیں ہیں بلکہ کسی حد تک روح کی تبدیلی کا بہت آہستہ آہستہ پیدا ہونے والا احساس ہے۔ جس نے ہمارے درمیان ایک بہت بڑی فصیل قائم کر دی ہے۔ ہندوستان کی روح کو بدل دینے کی کوشش تاریخ کے راستے کو بدل دینے کی کوشش کے مترادف ہے اور صرف اس وجہ سے کہ ہم نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدلنے کی کوشش کی تھی۔ ہم پر تباہی غالب آگئی۔ ہم جغرافیہ یا ان طاقتور رجحانات کو جن سے تاریخ کی تعمیر ہوتی ہے نہیں بنا سکتے اور اگر ہم نفرت اور تشدد کو اپنا سرچشمۂ عمل بنا لیں تو یہ قطعی طور پر اس سے بھی زیادہ بدتر چیز ہے۔

میرے خیال میں پاکستان کا وجود کسی حد تک غیر فطری طور پر عمل میں آیا ہے۔ پھر بھی وہ بہت بڑی آبادی کے مطالبات کی نمائندگی کرتا میرے خیال میں حالات کی تبدیلی رجعت قہقری ہے۔ لیکن ہم نے اسے بھی خلوص کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہمارا موجودہ نقطہ نظر کیا ہے۔ ہم پر الزام لگایا گیا ہے کہ ہم پاکستان کا گلا گھونٹ دینا اور اسے ہندوستان میں دوبارہ اتحاد پر مجبور کر دینا چاہتے ہیں۔ دوسرے الزامات کی طرح یہ الزام بھی خوف اور ہمارے طرز عمل کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ متعدد اسباب کی بنا پر ہندوستان اور پاکستان کے لئے ایک دوسرے کے قریب تر آنا ناگزیر ہے ورنہ ان دونوں میں تصادم ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنے طویل عرصہ سے جانتے ہیں۔ ایسے ہمسائے نہیں بن سکتے جو ایک دوسرے سے بے خبر رہیں۔

اس میں شک نہیں کہ میرا عقیدہ ہے کہ دنیا کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کو دوسرے ہمسائے ملکوں سے قریب تر تعلقات رکھنے ہوں گے لیکن اس کا مطلب پاکستان کا گلا گھونٹنا یا اسے کسی طرح مجبور کرنا ہرگز نہیں ہے۔ جبر کا تو کبھی امکان نہیں ہے اور پاکستان میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کا اثر الٹا ہندوستان پر پڑے گا۔ اگر ہم پاکستان کو ختم کرنا چاہتے تو ہم تقسیم پر کیوں راضی ہوتے؟ اسے اس وقت روکنا زیادہ آسان تھا نہ کہ اس وقت جب کہ یہ تمام واقعات پیش آچکے ہیں۔ تاریخ میں قدم پیچھے ہٹانا ممکن نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انڈیا کا فائدہ اسی میں ہے کہ پاکستان ایک مضبوط اور محفوظ و خوش حال مملکت بنے جس سے ہمارے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ اگر اتفاق سے آج کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ پاکستان خود یہ درخواست کرے کہ اسے انڈیا میں پھر شامل کر لیا جائے تو میں بعض واضح اسباب کی بنا پر اس کی مخالفت کروں گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ پاکستان کے نازک اور اہم مسائل کی ذمہ داری کا بوجھ بھی میں اپنے سر لے لوں۔ میری اپنی ذمہ داریاں ہی بہت کافی ہیں۔ انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کو اعتدال اور دوستی کے طریقے پر پیدا ہونا چاہئے۔ اس طرح بحیثیت مملکت کے پاکستان ختم نہ ہونے پائے گا بلکہ وہ ایک ایسی وسیع تر یونین کا جزو بننے کا اہل ہو جائے گا۔ جسے ممکن ہے کہ آئندہ کچھ ممالک مل کر بنائیں۔

طرز حکومت کا سوال ایک عجیب سوال ہے جو ہم سے پوچھا گیا ہے اس لئے کہ نظریاتی یا مذہبی حکومت کا تخیل دنیا نے صدیوں سے چھوڑ دیا ہے اور آجکل دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی آجکل انڈیا میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے اور ہم میں سے بہت سے لوگ عہد ماضی کی طرف پلٹ جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اس میں شمہ برابر شبہ نہیں کہ انفرادی حیثیت سے لوگوں کو چاہے جو خیال بھی ہو لیکن ہم پلٹ کر اس نظریہ کی طرف رخ نہیں کر سکتے جسے دنیا چھوڑ چکی ہے اور جو زمانہ حاضرہ کے نظریات اور تخیلات سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ جہاں تک انڈیا کا سوال ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ملک کو غیر مذہبی اور قومی اصولوں پر لیکر چلیں گے اور ہمارا رجحان بین الاقوامیت کی طرف ہوگا۔ اس وقت خواہ کچھ بھی انتشار پیدا ہو آئندہ کا ہندوستان ماضی کے ہندوستان کی طرح ایک ایسا ملک ہوگا جس میں مختلف مذہب اور مسلک کے لوگ رہتے ہوں [illegible] وہ سب مساوی حیثیت سے عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوں بلکہ ان سب کا ایک ہی قومی نظریہ ہو۔

مجھے امید ہے کہ یہ قومی نظریہ بھی اس قوم کی سی تنگ نظری پر مبنی نہ ہوگا جو کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح دنیا سے الگ تھلگ اپنے ہی ملک کی حدود میں رہنا چاہتی ہے بلکہ وہ اتنی وسعت نظری پر مبنی ہوگا کہ تمام دنیا کو اتحاد کے ایک رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتا ہوں۔

ہمارا مطمح نظر صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تمام دنیا ایک ہو جائے۔ یہ نعرہ اس زمانے میں جب کہ جنگجو قوتیں سرگرم عمل ہیں اور دنیا میں تیسری عالمگیر جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بے محل معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی صرف یہی ایک ایسا اعلیٰ مقصد ہے جسے ہم اپنے پیش نظر رکھ سکتے ہیں اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔

ہمیں یہی وسیع نظریہ اپنے پیش نظر رکھنا اور دوسروں کی کوتاہ نظری اور تنگ خیالی کا اثر قبول نہ کرنا [illegible] ملک میں فرقہ پرستی کا

طاقت سے بڑھ کے شوقِ تکلم کا جوش تھا — یوں کہہ رہا تھا حال میں گویا خموش تھا
نقاب اٹھتے ہیں دے کر نگاہ چھین کے ہوش — زباں ملی ہے لیکن بیاں نہیں ملتا
نہ تھی تلاش تو ملتے تھے سو نشاں اسکے — ہوئی تلاش تو اپنا نشاں نہیں ملتا
نہ تڑپاؤ کہ پہلو ضبط کا مشکل سے نکلے گا — تڑپ اٹھو گے جب نالہ تڑپ کر دل سے نکلے گا
ہنستے ہی رہو پھولوں کیطرح یوں غنچہ صفت دلگیر ہو گیا — کچھ اپنی کہو کچھ میری سنو خاموش ہو کیوں تصویر ہو گیا
کہتا ہے کبھی دل یہ کہئے کہتا ہے کبھی یہ کچھ بھی نہیں — جب ہونٹ ہلے کیا کہئے دلچسپ کوئی تقریر ہو گیا
فدا کی عشق نے آغاز ہی میں — اب اُن کے ہاتھ ہے انجام میرا
حریم دوست تک کیا فکر پہنچے — نہ پایا آج تک جب بام میرا
بگڑ بگڑ کے بنا ہے یہ سیر تو دیکھو — زمانہ کھیل ہے کس شوخ کی نگاہوں کا
طریقِ عشق میں گھبرا نہ قتل ہونے سے — کہ سر کٹاتے ہی کٹتا ہے پھیر راہوں کا
شکوہ نہ تھا مگر صفِ محشر میں دستِ شوق — رُک کے رُکا نہ دامنِ دلدار دیکھ کر
اب حشر تک بہارِ تماشا ہے اور ہم — آنکھیں ہوئی ہیں بند رُخِ یار دیکھ کر
ہمت بلند تر ہے کہ بیٹھا ہوں راہ میں — آسان قطعِ منزلِ دشوار دیکھ کر
کس نے یہ گل کھلائے ہیں اسکی خبر نہیں — تم خندہ زن ہو گریۂ خونبار دیکھ کر
اللہ کی یہ شان کہ ٹھہریں بشر حضور — شانِ حضور یہ کہ بشر کو خبر نہ ہو
پاسِ ادب کہوں اسے راغب کہ جوشِ رشک — ہر سجدہ چاہتا ہے کہ سر کو خبر نہ ہو
بنے کون جو ترے جلوے سے آنکھ بند کرے — مگر وہی جسے خود تو ہی نا[illegible] کرے
وہ مشتِ خاک ستاروں میں ہو ابھی شامل — ذرا بھی ہمتِ عالی جسے بلند کرے
یہ اتحاد بھی کیا عشق کی دلیل نہیں — مجھے پسند وہی ہے جو تو پسند کرے
یوں مطمئن ہیں بے سروسامانیوں میں ہم — گویا ہیں ساری عمر کے ساماں کئے ہوئے
ہر چند بہا اشکوں میں دل - دل کا ہر اک شوق — ٹپکی - مگر الفت نہ گری دیدۂ تر سے
محروم ہی جا دید ہوئی ہمتِ عالی — اونچا ہی رہا دستِ دُعا بامِ اثر سے
تا قفس مجھ کو چمن سے یہی دشمن لائی ہے — کیا چمن سے بھی کہیں بڑھ کے بہار آئی ہے
تیلیاں مشتِ خس و خار تھیں مجھ سے پہلے — میں جو پہنچا ہوں قفس میں تو بہار آئی ہے
ان کا ٹوٹا ہوا آئینہ ہے عالم کیا ہے — ریزہ ریزہ میں نظر آتی ہے تصویر اُن کی
یوں تو ہر ایک کی تقدیر ہے اُن کی نگاہ — دیکھتے ہیں جو انھیں دیکھئے تقدیر اُن کی
عبارت آپ کا پردہ معانی آپ کے جلوے — حدیثِ شوق میں رسوا ہی کیوں میری زباں کہئے
وہی چوٹ عشق کی تہہ تھی کہ ابھر کے دیدہ تر ہوئی — یہ جنوں عشق کی قہر تھی کہ تڑپ تڑپ کے نظر ہوئی
سکون یاس دل کی بیقراری ہوتی جاتی ہے — فشارِ دستِ موج آغوشِ ساحل ہوتا جاتا ہے
نظارہ ایک حسرتِ نظارہ ہے مجھے — ناکامِ دید ہوں نگہِ کامیاب سے
اجل چاہیں نہ کیوں جینے سے دل تنگ آ ہی جاتا ہے — تماشا ہو اگر یکساں تو جی گھبرا ہی جاتا ہے
بہار آرائیاں چھپتی ہیں کب لے جلوہ رنگیں — تری زحمت پہ کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے
نہ دل جانے کی پروا ہے نہ مجھ کو جان کھونے کی — کہ جو کھوتا ہے تیرے عشق میں کچھ پا ہی جاتا ہے
مایوسیوں کو شوق سے رسوا کرے کوئی... — یعنی وہ چاہتے ہیں تمنا کرے کوئی
ہر چند دل میں سیکڑوں جلوے ہیں موج موج — ہر قطرہ اس ہوا میں ہے دریا کرے کوئی

(۱) القصیدۃ الکوکبیہ فی المناقب العلویہ - (۲) قصائد (ہاصمیات) - (۳) اللامیہ وغیرہا (یہ تینوں عربی منظومات ہیں) - (۴) الانجم الطوالع مشتمل برمتن و عکس کتاب المطالع و ترجمہ و شرح اُردو - (۵) بہار بوستاں (انتخاب بوستاں مع مقدمہ) - (۶) ارکان دینیہ (اُردو) -

مولانا کو شعر سے فطرۃً ذوق تھا - ماحول کے اثرات نے اس ذوق کو اور ترقی دی - ابتداءً مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے - بعد کو نجی صحبتوں - نبی خانہ (بدایوں) کی محفلوں یا عرس قادری کے جلسوں کے سوا اور جگہ پڑھنا ترک کر دیا - غرض اسی شوق شعر نے باقاعدہ تلمذ کی جانب راغب کیا - اور وہ شیخ احمد علی شوق قدوائی لکھنوی کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھانے لگے - اُن کا اُردو کلام جو بیشتر غزلیات پر مشتمل ہے بہت کچھ تلف ہو گیا - جو کچھ حافظہ یا متفرق اجزا کی مدد سے ملا مرحوم نے ایک بیاض میں جمع کر لیا تھا - اُن کے کلام میں مشاقی اور روانی کے ساتھ خیال کی رفعت اور انداز کی لطافت دیکھ کر روح کو حظ اور دل کو کیف حاصل ہوتا ہے - اُن کے عربی قصائد جو اہل بیتؓ طہارت کی منقبت میں ہیں بیک وقت جوش عقیدت اور زور فصاحت کے آئینہ دار اور علو خیال و قدرت کلام کے شاہکار ہیں - بعض جگہ مشکل صنائع (مثلاً صنعت منقوط یا غیر منقوط) کے التزام نے ضرور تکلف پیدا کر دیا ہے -

آخر میں چند شعر جو درج کئے گئے ہیں اُن سے مرحوم کے رنگ شاعری کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے - مولانا عقیدۃً سنی حنفی - اور مشرباً قادری تھے - بچپن ہی میں ان کے والد ماجد نے ان کو حضرت مولانا عبد القادر صاحب عثمانی بدایونیؒ سے بیعت کرا دیا تھا - شیخ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کے خلف اکبر حضرت مولانا عبد المقتدر صاحبؒ سے تجدید بیعت کی تھی - ان کو بزرگوں سے عقیدت اور مزارات اولیاء سے ارادت تھی - بدایوں کے قیام میں علی الصباح اٹھ کر شہر سے دور حضرت شاہ ولایت علیہ الرحمۃ کے مزار پر حاضر ہونا اور وہاں نماز فجر پڑھ کر تلاوت قرآن کرنا اُن کا برسوں سے معمول تھا - صوفیہ کرام کی صحبت بالطبع مرغوب تھی - اور اوراد و وظائف کے معمولات برابر جاری رہتے تھے - جن کے اثر سے یک گونہ صفائے قلب حاصل ہو گئی تھی - عقائد میں محبت اہل بیت مصطفویؐ پر بہت زور دیتے تھے - اور فقہیات میں مسائل نزاعی فقہا میں حدیث نبویؐ کو مقدم سمجھتے تھے -

اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مرحوم کی ذات میں بہت سی خوبیاں تھیں - مذہبی جوش - قومی درد - مزاج میں سادگی - طبیعت میں بے تکلفی بدرجہ اتم تھی - بیان میں طلاقت - گفتگو میں ظرافت پائی جاتی تھی - والدین، خصوصاً اپنی والدہ ماجدہ کی اطاعت و خدمت کو ہمیشہ ہر کام سے مقدم جانتے - اولاد سے کمال شفقت اور دوستوں سے الفت رکھتے - اہلیہ کی رحلت کے بعد (جس کو ۲۲ سال کے قریب ہوئے) کبھی عقد ثانی کا خیال نہ کیا اور اپنے بچوں کی خاطر اپنے ذاتی آرام کو تج دیا -

معاش کی طرف سے خدا نے ان کو اطمینان دیا تھا - کیونکہ موروثی جائداد گذر کے لئے کافی تھی - تاہم ۱۹۳۸ء میں بعض دوستوں کے اصرار سے مسلم یونیورسٹی میں استاذ دینیات کا منصب قبول کر لیا تھا - چنانچہ آخر وقت تک مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں منہمک رہے - کلاس میں اور کلاس کے باہر تلامذہ میں مقبول اور اساتذہ میں محبوب تھے - علی گڑھ اور اطراف ملک میں ارباب علم کے حلقوں میں مولانا کی ہستی کافی مشہور و معروف تھی -

افسوس صد افسوس کہ بتاریخ ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء مطابق ۱ ربیع الآخر ۱۳۶۷ھ بروز شنبہ کلاس سے واپسی کے بعد اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے مولانا نے وفات پائی - اور قریب مغرب یہ خورشید علم ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا - انا للّٰہ

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

میت کو علی گڑھ سے بدایوں لیجایا گیا - اور درگاہ مجیدیہ قادریہ میں دفن کیا گیا - مرحوم کے خویش عزیزی صبیح احمد سلمہٗ ایم اے ایل ایل بی نے آیۃ کریمہ - ان المتقین فی جنت وعیون سے سال وفات نکالا ہے -

ذیل میں مولانائے مرحوم کا اُردو کلام بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے :-

منزل کے قرب و بعد میں پھر کیوں یہ بل پڑا ‏ جس راہ تو نے مجھ کو چلایا میں چل پڑا

نالے مرے سنے تو فرشتوں کو چپ لگی ‏ میں چپ رہا تو محفلِ انجم میں غل پڑا

سرو دید ہے پھر بھی نظارہ سوز ہے کیوں ‏ وہ موج موجِ تجلی مری نگاہ ہے کیا

بلا ہے ایک تماشا جہانِ فکر و نظر ‏ وہ جلوہ آئینۂ چشمِ سحر نگاہ ہے کیا

گرمی وہ عشق کی تھی کہ عمر یا جنوں ‏ تھا خلوت وجود کہ اک بار دوش تھا

محشر میں بھی خطابِ ازل تھا پیامِ ہجر ‏ محرومیِ نصیب سے فردا بھی دوش تھا

ازجنگ میں تکالیف اٹھا کر دنیا کے معماروں کے ساتھ کام کرنے میں دوش بدوش حصہ لیا ہے۔

نثر میں دوسرے درجہ کا انعام ویرا پنووا اس کی اور فائنڈر کی "امن کی جدوجہد" کو ملا۔

ویرا پنووا اس، جس کا سابق ناول "ہمسفر" اپنی اسٹائل کے لئے کافی شہرت رکھتا ہے۔ اس میں سوویت اسکیم کی مشغولیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ جس کے کام کرنے والے اشخاص، انتہائی محنت کی بلندی کے جذبے سے متاثر ہوئے ہیں۔

پنفرووف کے ناول "جنگی محاذ" میں محاذ کے افراد اور گھر کے مزدوروں کے رشتہ کی کڑی اور آپس کے گہرے تعلقات کو دکھایا ہے۔

محاذ جنگ کا موضوع ایک زمانے تک سوویت ادیبوں کے لئے دلچسپی کا باعث بنا رہے گا۔ محض اس لئے نہیں کہ ان میں سے بہت سے افراد نے فوج میں حصہ لیا ہے اور اپنے ذاتی تجربات کے ذریعہ معلومات کا قیمتی خزانہ فراہم کیا ہے بلکہ فاشیت کے خلاف سوویت عوام کی بہادری نتیجہ ہے، اشتراکی تعلیم اور آزاد اشتراکی زندگی کا۔ جنگ کی آزمائشوں کے بعد سوویت عوام ہمیشہ سے زیادہ طاقتور ہو گئے۔ الکزنڈر ٹونک کا "Emmanuil Kagakevich" اور "Standand Beaners" کا "ستارہ" میں جنگی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ دونوں جنگ کے ماہر ہیں۔ اور ان کے قیمتی کارنامے ان کے تجربات و تصورات پر منحصر ہیں۔ gon Chan کی کتاب پڑھنے والوں کو نجشکی کا کردار جو ہنگری کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتا ہے۔ سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ مصنف خود سوویت کی فوج میں کام کرتا ہے اور وہی بیان کرتا ہے جو جنگ میں درپیش آیا ہے۔ Kagakevich کے کرداروں نے پڑھنے والوں کے دلوں میں بڑی ہمدردی حاصل کی ہے۔ اس ناول میں نزاکت شاعری کا اظہار ہے۔ گو کہ ناول میں جنگ کا خشک ماحول چھایا ہوا ہے۔ انجام المیہ ہے۔ ناول کے ہیرو ایک جاسوسی دستہ کے جنگجو سپاہی ہیں جو لڑتے ہوئے مارے جاتے ہیں مگر کتاب میں کہیں قنوطیت نہیں ملتی۔ پڑھنے والا شہیدوں کی یاد صرف تعظیم و تکریم سے نہیں مناتا اور ان کے کارناموں کے احسان سے صرف متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ ان کا خون بیکار نہیں بہا ہے۔

روسی ادب کی تاریخ میں غیر روسی قومیتوں کا ایک نمایاں پہلو وہ ہے جس میں سوویت یونین کی تمام جمہوری ریاستوں کے ملکی کلچر کا حسین عکس نظر آتا ہے۔ وہ ایک ترکمانی مصنف کے ناول "Pelisine Staf" کی اشاعت ہے۔ ناول میں اکتوبر کے انقلاب اور ترکمانیہ کی خانہ جنگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ڈگی کے ایک ناول نگار تنگور کر اشصت نے "راہ مسرت" میں اپنے شہر کے عوام کی زندگی کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔

مختلف کتابوں نے تیسرے درجے کے انعام حاصل کئے ہیں جن میں ایک ڈکٹر آوڈیو کا مختصر ناول "Cattle on the Road" ہے جن میں جنگ کے ہولناک دنوں میں مویشیوں کی نسل گاہ کو ایک منظم طور پر خالی کرنے کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

دوسرا ناول ایون کزلاف (Iovan Kozlov) کا "Crimea Underground Diary" ہے۔ یہ سوویت کے روپوشوں کی بہادرانہ سرگرمیوں کی سچی یادگار ہے۔ کریمیا میں نازیوں کے قابض ہونے کے دوران میں لکھا گیا، جس میں مصنف خود کریمیا کے روپوش لیڈروں میں سے تھا۔

جوزف ٹلسٹناف کا صحیح ترجمان مختصر ناول "Jomgsten" (لڑکے) ہے جس میں اسکول کے تعلیم پانے والوں کی زندگی کی مصوری کی گئی ہے۔

Vera Keflinskaya کا ناول Under Seigl بھی کافی اہم ہے۔ اس کا موضوع محاصرۂ لینن گراڈ ہے۔

نکولے ماخیلوف کا ناول "ملک کے نقشہ کی طرف نظریں" In an In the Red Point اور بورس گالن کی کہانی "اوڈیوب میں زندگی" دیہاتی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔

میخلوف کی کتاب نے پڑھنے والوں کو اشتراکی سرزمین کی دولت، نئی تعمیر کی تیز رفتاری اور ان تمام واقعات سے جو سوویت یونین میں ۳۰ سال کے درمیان درپیش آئے ہیں روشناس کرایا ہے۔

بورس گالن کی تحریر کو تجزیئی مختصر ناول سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت اس قسم کے دیہاتی زندگی کے مرقعوں نے مقبولیت پائی ہے اور ... نے نظام کو مستحکم کر دیا ہے۔ سوویت یونین میں اس قسم کی طرز تحریر ایک سفرنامہ کی حیثیت نہیں اختیار کر ...

ادب

سید یوسف حسن

روسی ادب ۱۹۴۷ء میں

۱۹۴۷ء، روسی ادب کے لئے ایک ایسا سال گذرا ہے جس میں بے شمار ادبی کارنامے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سوویت ادیبوں کے ناول، ناولچے، ڈرامے، نظمیں، اور تنقیدیں جو شایع ہوئی ہیں ان کی قدر شناسی کا اظہار اسٹالن پرائز سے ہوتا ہے۔ اور جنھیں اسٹالن انعام ملتا ہے وہ بہ حیثیت ادیب کے ملک میں بے حد مقبول ہو جاتے ہیں۔

نثر کے میدان میں نمایاں طور پر ترقی ملتی ہے۔ علاوہ ایسی کتابوں کے مصنفوں کے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ نوجوان لکھنے والوں کے کارنامے جنھوں نے ابھی ادبی زندگی میں قدم رکھا ہے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

سارے سوویت ادب کے لئے آج دو مخصوص موضوع خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ تیسری جنگ عظیم اور تعمیر بعد از جنگ، انعام جیتنے والوں کی فہرست میں ان موضوع پر لکھنے والوں کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

نثر میں پہلا انعام میخائیل بیوبنوف کے ناول "سفید درخت"، پانٹر پاولنکوف کے "مسرت"۔ اور ایلیا اہرن برگ کے "طوفان" کو دیا گیا۔ یہ تینوں ناول سوویت عوام کی جنگوں اور فتوحات کی ایک دلکش تصویر پیش کرتے ہیں۔

"سفید درخت" کی تصنیف، جنگ کے ابتدائی دور میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کی گہرائی کا اندازہ اس کے کرداروں کی نقش گری، جنگ کے ابتدائی دور کے صحیح کارناموں اور موضوع کے لئے اسالیب سے ہوتا ہے۔ یہ پہلا ناول ہے جس میں مصنف سوویت کے عام مردوں اور عورتوں کی مبہم امداد کے بجائے عقیدوں کو پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ آندرے ایوپخوف اجتماعی طور پر کام کرنے والا ایک نوجوان کاشتکار ہے جو سوویت فوج میں انفرادی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کے دلیر ساتھی، اس کی بیوی اور اس کے گاؤں کے دوست ہیں جنھوں نے فاشی حملہ آوروں کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔ اب تک ناول کا صرف پہلا حصہ شایع ہوا ہے لیکن اس کے کردار ادبی دنیا میں کافی مقبول ہو چکے ہیں۔

ایلیا اہرن برگ کا "طوفان" کی تصنیف روس، فرانس، جرمنی اور دوسرے ملکوں میں ہوئی ہے لیکن عظیم جنگ کے ادوار کو شامل کر لیا ہے۔ ناول کے ابتدائی ابواب اہرن برگ کے کردار مشکل سے ہیرو کہلائے جا سکتے ہیں مگر جوں جوں جنگ بڑھتی جاتی ہے یہ کردار ہیرو اور سپاہی بنتے جاتے ہیں۔ جنگ کے شعلوں میں ان کی ہمت فولاد بن جاتی ہے اور یہیں اہرن برگ کا فن نکھرتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کردار کبھی ساکن نہیں دکھائی دیتے۔ بلکہ اپنی تقدیروں اور شخصیتوں کی نشو و نما کی مصوری میں ہر دم مشغول نظر آتے ہیں۔ زمانۂ جنگ کے فرانس کو ناول میں خاصی جگہ دی گئی ہے۔ اس مقام پر اہرن برگ ایک لمحہ کے لئے بھی سوویت فوج اور سوویت عوام کی دلیرانہ اور کامیاب جدوجہد کے اثرات کو فراموش نہیں کرتا جو فرانس کی مزاحمت کی تحریک اور اشتمالیوں کی سرگرمیوں پر پڑے ہیں۔ جہاں بھی فاشیت کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ اس کا عکس جنگ عظیم کی طرف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

اہرن برگ اپنے ناول میں جو کہنا چاہتا ہے اس کا تعلق صرف ماضی سے ہی نہیں ہے بلکہ مستقبل سے بھی ہے۔ سوویت کے عوام کی وہ طاقت جس کا امتحان فاشیت کے خلاف خوفناک جدوجہد میں لیا گیا ہے۔ آج ہر اس ارادہ کے لئے خطرناک کا نشانہ ہوئی ہے جس کا تعلق فاشیت کو پھر سے زندہ کرنے سے اور سامراج کا مختلف صورتوں سے غالب آنے سے ہے۔ ناول کا یہی انجام ہے اور اہرن برگ چاہتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے اس کی نئی کتاب سے نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

پانٹر پاولنکوف کا "مسرت" ایسا ناول ہے جو ہمیں مستقبل کی طرف راہ بتاتا ہے اور تعمیر بعد از جنگ کے مسئلہ پر بحث کرتا ہے۔ کرنیل وورو بیو جو کتاب کا سب سے اہم کردار ہے جنگ کے محاذ سے بیکار ہو کر شہری زندگی میں داخل ہو کر اپنے کو تعمیری کاموں میں گم کر دیتا ہے [illegible] "مسرت" صرف [illegible] کی داستان نہیں ہے بلکہ [illegible] بے شمار اشخاص کا [illegible] ہے جنھوں نے تعمیر بعد

آرٹ

عبدالباقی

آرٹ کی ترقیں

قومی زندگی میں آج ہمارا کچھ عجیب حال ہے۔ دشمنوں کی ایک زبردست فوج سامنے کھڑی ہے جو ہمارا سینہ چھلنی کر دینا چاہتی ہے۔ ہم بیٹھ دکھا نہیں سکتے، اور اگر ہم چپ چاپ ٹکٹکی باندھے دشمن کو دیکھتے رہے تو ہمارا تیا پانچا ہو جائے گا۔ بس ایک ہی راستہ ہے کہ کچھ کیا جائے، اور جم کر کیا جائے، نہیں تو مٹتے کیا دیر لگتی ہے!۔

جب ہم اپنی طاقت کا اندازہ لگاتے ہیں تو ہمارے حوصلے چھوٹ جاتے ہیں، یہ تو ایسا ہو رہا ہے جیسے ہم پہلے ہی ہار مان چکے ہیں۔ ہمارے آرٹ اور لٹریچر میں یہ رنگ صاف جھلکتا ہے، ہمارے آرٹ اور لٹریچر نے زندگی سے ناتہ توڑ لیا ہے۔ لیکن کیا کوئی آرٹ جو زندگی سے بالکل کٹ چکا ہو، زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے!۔ آئیے، ہم صاف صاف، بہت کھری کھری باتیں کریں اور آرٹ کو اس کی ٹھیک جگہ پہچاننے اور جاننے کی کوشش کریں۔

آرٹ اپنی آس پاس کی حالتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آرٹسٹ سماج میں رہتا ہے اور چونکہ وہ اس سماج کی پیداوار ہے اسلئے وہ ان دھاروں سے منہ نہیں پھیر سکتا جو سماج میں ایک خاص وقت میں بہ رہی ہوں۔ جاگیرداروں نے دھنیوں اور رئیسوں کا آرٹ پیدا کیا۔ سرمایہ داری نے ایک خاص رنگ روپ کا آرٹ پیدا کیا، جس میں وہی الجھی بے جوڑ باتیں ہیں، جو سرمایہ داری کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں نے بھی الگ ہی ایک نئے آرٹ کو جنم دیا۔ جس میں نہ تو انکل پچو باتیں ہیں، نہ خیالوں کا ٹکراؤ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سماج میں حسن اور سندرتا کے پرکھنے والے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ آرٹسٹ تو زندگی کی سماجی ضرورتوں سے بنتی اور پنپتی ہے، اور وہ یہی کش مکش کو ایک منٹ کے لئے بھی نہیں بھلا سکتا۔

تو یوں سمجھیئے کہ آرٹ زندگی ہی میں جنم لیتا ہے اور زندگی ہی کے لال لال گرم خون سے پلتا ہے، وہ زبردست جوش پیدا کرتا ہے، ایسا جوش جو کام کے لیئے ابھارے۔ دماغی اور دلی کام کی امنگ پیدا کرے۔ وہ امنگ جو آگے بڑھاتی ہے اور آدمیوں میں زبردست احساس، زبردست جاگ پیدا کر دیتی ہے۔

جوش بھی دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تو وہ جس کا اپنے سے پرے کوئی مقصد نہیں، جو صرف اپنے لئے جینا چاہتا ہے اور اس کا نتیجہ سپنے دیکھنا۔ گھروندے بنانا اور چپ چاپ دیکھنا اور پیچھے مڑ کر بھاگنا ہوتا ہے۔ اس جوش میں سڑاند پیدا کر دینے والا ٹھہراؤ ہوتا ہے یہ بے جان ہوتا ہے اور اس کی نہ تو ہمیں آج ضرورت ہے، اور نہ کسی وقت ضرورت تھی۔ زیادہ سے زیادہ اسے جذباتی کہہ سکتے ہیں اور اس کے نمونے ہمیں جارج کے زمانے کی انگریزی شاعری میں ملتے ہیں۔ شاعر ایک گدھے کی موت پر جھوٹے آنسو بہاتا ہے، جیسے وہ اسکا سگا بھائی ہی ہو، کچھ لوگ اگر ایسے آرٹسٹوں کی واہ واہ کرتے ہیں تو انھیں ان افیمیوں کی بھی پیٹھ ٹھونکنی چاہیئے جو افیم کھا کر اپنی پینک میں آسمان سے تارے توڑلانا چاہتے ہیں۔ دوسرا جوش طاقت دیتا ہے، شکتی دیتا ہے، اور کام کی طرف بڑھاتا ہے، ایسا جوش سماج کے سارے روگ دور کر دیتا ہے اور اسے بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیتا ہے۔ پہلے جوش کے سوتے خوابوں کے اتھاہ سمندر سے پھوٹتے ہیں، دوسرا جوش زندگی کی ایجاؤ زمین میں جنم لیتا ہے اور وہیں اس کی کونپلیں پھوٹتی ہیں "خوابوں والا" دھندلا دھندلا، آرٹ اور لٹریچر ہمیں جگا نہیں سکتا۔ اور جگاتا تو کیا ہمیں وہ چڑیا بنا دیتا ہے جو دن کو آنکھیں نہیں کھولتا۔

آرٹ کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں، جب ان دیکھی چیزوں کو روپ دیں تو وہی آرٹ ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ سر سے پیر تک حسن ہی حسن ہے یا غذا ہے، پلتے ہوئے احساسوں کا بہاؤ ہے، یہ سب باتیں ادھوری ادھوری ہیں۔ زندگی کے سب سے اونچے احساسوں کے اجاگر کرنے کا نام آرٹ ہے۔ ایسا آرٹ جو سماج کے نس نس میں بس جاتا ہے اور پھر اسے دماغی ترقی کی طرف لے جاتا ہے اور یہ دماغی ترقی اسے کام اور زندہ بناتی ہے۔

آرٹسٹ اپنے احساسوں کو ظاہر کرنے کے لئے لفظوں، بتوں اور روپ ریکھاؤں کا سہارا لیتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ آرٹسٹ کے احساسوں تک لوگ [illegible] پہنچ ہو۔ اس لئے کہ آرٹسٹ سب کچھ صرف اپنے ہی لئے نہیں بناتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ آرٹسٹ جو نقشہ

شاعری کے میدان میں اول انعام دو نوجوان شاعروں کو ملے۔ الکسی نیڈرگنوف کو "سوویت کے گاؤں پر پرچم کی خاطر" اور نکولے گرب اتزف کو "بالشویک کا پنچایتی کھیت" لکھنے پر۔ دونوں نظموں کا موضوع ایک ہے وہ ہے جنگ کے بعد کسانوں کے کھیتوں کو دوبارہ اجتماعی طور پر آباد کرنا۔ اور سوویت کے گاؤں میں اشتراکی اصولوں کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لانا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان شعرا نے اس اہم موضوع کی طرف اپنا رخ کیا ہے۔

ولادیمیر سسیورا نے جنگ کے بعد نظموں کا مجموعہ Let the orchards Rustle کو بھی اول انعام دیا گیا ہے۔ سسیورا یوکرین کا غیر معمولی شاعر ہے۔ ابھی حال میں سوویت کے ادبی مرکز میں شاعر کی ادبی زندگی کی پچاسویں سالگرہ منائی گئی ہے اس کا یہ مجموعہ زندگی کا ایک سنگ میل ہے۔ اور ساتھ ساتھ ایک زبردست قیمتی تحفہ ہے جو زمانہ حال میں یوکرین کی شاعری کو ملا ہے۔

دوسری قابل دید نظمیں۔ جان سدر بکل کی "ایک خوش اخلاق خاندان میں"۔ اور میکسم تنک کی "کیا تم نے دیکھا تھا" ہیں۔ دوران جنگ کی نظموں میں پرانے زمانے کا ایک شاعر جان سدر بکل صرف خود کو بہ حیثیت شاعر ہی نہیں پیش کرتا بلکہ ایک وطن پرست کی طرح اپنے ساتھیوں کو سوویت فوج میں داخل ہو کر نفرت انگیز دشمن کے خلاف جنگ کے لئے آواز بھی دیتا ہے۔

میکسم تنک مغربی روس کی کمیونسٹ روپوش تحریک کے تجربہ کار سپاہی نے اپنی تازہ نظموں کا مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں روس کی جنگ کے بعد کی زندگی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے

تاجک شاعر مرزا ترسن زادہ نے اپنی ان نظموں میں جو اس نے ہندوستان پر لکھی تھیں اور جن پر انھیں انعام ملا ہے عالمگیر اور گہرے موضوع کو پیش کیا ہے۔ شاعر خود ہندوستان آیا تھا اور یہاں رہ کر اس نے سامراجی مظالم خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ نظمیں محکوم لوگوں کے حالات کی ہو بہو تصویر ہیں۔

چار ڈراموں میں صرف ایک ڈرامہ جیبک سن کے "سرحد کے بعد جنگ" کو استالن انعام ملا۔

بورس رومشف کے "بڑی طاقت" میں سوویت سائنس دانوں کی دنیا پر بحث کی گئی ہے۔

نکولے ورتا کے ڈراما "ہماری روزانہ روٹی" میں سوویت کے گاؤں کی روزمرہ زندگی کو دکھایا ہے۔ جہاں نئے اور پرانے اور ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ تقریباً اسی موضوع پر اناطول فرانس نے بھی لکھا ہے۔

ادبی اور فن تنقید کے میدان میں اس سال پہلی مرتبہ استالن انعام پیش کیا گیا ہے جن سے اس میدان کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بورس اثرف موسیقی کا استاد ہے اسے اپنی کتاب "گلنکا" پر اول انعام ملا ہے۔ دوسرا انعام ملیسا نیچکنا کے گرب ڈف اور ودسمبرسٹ اور بورس ملیخ کی کتاب لینن اور روسی ادب کے مسائل ۱۹ صدی کے آخر اور ۲۰ صدی کی ابتدا میں" کو ملا۔

سالانہ استالن پرائز سوویت کے ادیبوں کی زندگی میں ایک خاص اہم درجہ رکھتی ہے۔ اس سال خاصکر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ کیونکہ اس سال ادبی میدان میں گذشتہ سال سے زیادہ کوششیں، ترقیاں اور وسعتیں ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوویت ادب روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ یہاں کا ادب جنگ کی سخت آزمائشوں کے بعد نئی راہوں اور تروتازگی کو ساتھ لیکر ابھرا ہے۔ سوویت ادب ملک کی زندگی، اس کی ترقی اور تعمیر میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے۔

سوویت ادیب صرف عوام کی قدر شناسی ہی کو اپنی کامیابی تصور نہیں کرتے بلکہ اُن کے سامنے عوام کی بھلائی کے لئے اس سے بھی زیادہ تیز اور ان گنت سرگرمیاں ہیں اور اشتراکیت کی خدمت ہے۔

سائنس

شمیم احمد

کل ہند "سائنس کانگریس" پٹنہ

کل ہند سائنس کانگریس کا سالانہ جلسہ جنوری ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتہ پٹنہ میں منعقد ہوا۔ علی گڑھ کے نمایندے کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد عمر فاروق صاحب موجود تھے۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری (شعبہ حیوانات) نہ آسکے۔ کیمیا کے طالب علم ڈاکٹر محمد عبدالعزیز صاحب کی سرکردگی میں شریک تھے۔ حمید الحسن صاحب (شعبہ کیمیا) نے بھی شرکت کی۔ جغرافیہ اور طبعیات کے بھی چند طلبا موجود تھے۔

سائنس کے مختلف شعبوں کے صدارتی خطبے تمام طور پر اعلیٰ معیار کے تھے۔ ڈاکٹر رام داس نے فضائی کرہ کے نیچے طبقہ کے متعلق ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔ پروفیسر سنجوا راؤ نے چاول کے Canning کے متعلق مختلف طریقوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ مختلف طریقوں سے چاول میں غذائی حیثیت سے کیا تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ Canning کے واسطے کس قدر چونے کے پانی کے ساتھ چاول کو ابالنا چاہیے۔ دیگر خطبات میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خطبہ ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ انھوں نے مستقبل کا تعمیری خاکہ بنانے والوں کے لئے ایک راہ عمل متعین کر دی۔ آپ نے فرمایا کہ انسان مختلف طبائع کے ہوتے ہیں اور اپنے قومی تمدن کے ان عناصر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ان کی طبیعت سے میل کھاتے ہوں اس لئے بہترین تربیت کے واسطے انسانی طبائع کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

مختلف شعبوں میں جو تحقیقاتی مضامین پڑھے گئے وہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے شایان شان نہ تھے۔ لوگوں کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ دنیائے سائنس میں اپنے ملک و ملت کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہو رہے ہیں۔ اور ان کے اپنے مقام سے ان کی ملت کا درجہ متعین ہوگا۔ اکثر مباحثے سطحی نظر آتے تھے۔ یہ بات بھی ہندوستانی سائنس پر تازہ تحقیقات کے سلسلہ میں خاص طور پر محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر دت (دہلی یونیورسٹی) نے بحث کا افتتاح کیا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اس کے لئے زیادہ تیاری نہیں کی تھی۔ جو کام وہ کر رہے ہیں اس کا سرسری تذکرہ کرنے پر انھوں نے اکتفا کیا۔

ڈاکٹر ششادری (آندھرا یونیورسٹی) نے پودوں کے رنگین فعالی اجزا کے خواص کے اوپر ایک پرمغز مقالہ پڑھا جس کے بعد کسی اور مقرر کے نہ ہونے کی وجہ سے مباحثہ ختم کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں بہت افسوس ہوا کہ کانگریس والوں نے دعوت نامہ علی گڑھ نہ بھیجا ورنہ ہم لوگ تیار ہو کر جاتے۔ گذشتہ سال سید مرغوب علی صاحب (ایم ایس سی) فائنل نے جو ایک عام طریقہ پر تمام رنگین فعالی اجزا کے ایک دن میں قلمی صورت میں نکالنے کا معلوم کیا تھا اس سے دنیا کو روشناس کرواتے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر ششادری سے ڈاکٹر عبدالعزیز اور میری ملاقات ایک ایٹ ہوم میں ہوئی تو اس موضوع پر ذکر چھڑا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ رنگین فعالی اجزا کو کتنے عرصہ میں نکال لیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ شروع میں چھ مہینے کے قریب لگتے ہیں اور بعد میں مشق ہو جانے پر دس دن میں نکالا جا سکتا ہے جب میں نے انھیں بتایا کہ سید مرغوب علی صاحب نے ڈاکٹر عبدالعزیز کے ماتحت اور میرے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک ایسا طریقہ نکالا ہے کہ کسی بھی رنگین فعالی جز کو خالص حالت میں اور تمام اجزا سے صرف ایک دن کے اندر قلمی صورت میں علیحدہ کیا جا سکتا ہے تو انھوں نے بہت تعریف کی اور اس کا اصول دریافت کیا۔ چونکہ یہ تحقیقی کام ابھی شائع نہیں کروایا گیا ہے اس واسطے مفصل جواب تو نہیں دیا گیا لیکن پھر بھی اتنا بتلایا گیا کہ محلول کی تربیت کو قابو میں رکھنے سے مختلف رنگین اجزا مختلف اوقات میں نیچے بیٹھتے ہیں۔ اس خیال کی انھوں نے بہت تعریف کی۔ وہ خود اس طریقہ کو آزمانا چاہتے تھے۔ ان اجزا پر جہاں تک میرا خیال ہے اس سے بہتر ہندوستان بلکہ دنیا کے اندر کام مشکل سے ہوا ہوگا۔

کیمیا کے شعبہ میں چند اچھے تحقیقی مقالات پڑھے گئے۔ ان میں سے پروفیسر جوشی پرنسپل سائنس کالج بنارس کا کام بہت دلچسپ اور اہم تھا۔ انھوں نے "روشنی کا ایک نیا اثر" پر کافی کام کیا ہے۔ عموماً روشنی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بجلی آسانی سے گیسوں میں گذر سکتی ہے لیکن کلورین وغیرہ چند گیسیں ایسی ہیں کہ جب ان پر روشنی پڑتی ہے تو بجائے آسانی کے بجلی زیادہ دقت سے گذرتی ہے۔ آپ اس پر تقریباً ۲۰ سال سے کام کر رہے ہیں۔ اور ابھی تک اس کی کوئی مکمل توجیہ نہیں کی جا سکی ہے۔ جب آپ کا لکچر ختم ہوا تو حاضرین نے اس پر مباحثے کے لئے کہا گیا۔ اور لوگوں نے ان پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ Semi Polar Single Bond پر تحقیقی مقالہ

آرٹ کی ترقیاں

ہندوستان اور ایشیا میں بہت سے آرٹسٹ اور لکھنے والے ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جو رنگوں کا صرف دھواں کھینچے وہ من مانا نہ ہو، ہندوستان اور ایشیا میں بہت سے آرٹسٹ اور لکھنے والے ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جو رنگوں کا صرف دھواں اڑاتے ہیں، اور اسی پہ اتراتے بھی ہیں۔ آرٹ تک عام لوگوں کی بھی پہنچ ہونی چاہیئے، اگر ایسا نہ ہوا تو آرٹسٹ اور پبلک میں وہ لگاؤ نہیں پیدا ہو سکتا جو انھیں آرٹسٹ کا ہمدرد بنا دے، اور وہ اسی ڈھنگ سے سوچنے اور دیکھنے لگیں، جب تک ان دونوں کا سچا میل نہ ہوگا۔ خیالوں اور وچاروں میں جان نہیں پڑ سکتی۔ اور نہ آگے جا کر لئے جی بڑھ سکتا ہے۔

آرٹسٹ ایک چیز لیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ آس پاس کی دنیا سے ایک چیز لیتا ہے اور پھر یہ چیز اس کے دل میں جو بھاؤ پیدا کرتی ہے اسے بھی سمیٹ لیتا ہے اور اب وہ اس میں مگن ہو جاتا ہے۔ بس اس کا ہر کام، اس کی زندگی کی ہر سانس یہیں سے چلتی ہے وہ جو خیال ظاہر کرتا ہے، وہ کچھ اس کے دماغ کا تراشا ہوا انوکھا نمونہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ نقشوں اور نشانیوں کے ذریعہ سے سماجی سچائیوں کی ایک جھلک دکھاتا ہے، اب یہ جھلک پھیلتی ہے اور رہتی ہے۔ ٹھیک جس طرح کرنیں نکلتی تو ایک جگہ سے ہیں، پر ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ اگر آرٹسٹ کی یہ بکھری ہوئی کرنیں اصل خیال کو دھندلا بنا دیتی ہیں یا اس خیال کے سمجھنے میں سیدھی سیدھی دل میں اتر جانے والی آسانیاں نہیں دیتیں، تو یہ آرٹ کبھی سچا نہیں ہو سکتا، مطلب یہ ہو کہ آرٹ کو خود سماجی احساس کو دھڑکتا ہوا دل ہونا چاہیئے۔ اگر آرٹ کا اصل خیال سماجی حقیقتوں سے نہیں بنا تو یہ بالکل پتھر کہلائیگا، اس کا کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ جو بات ہم میں جان نہیں ڈال سکتی، ہمیں آگے نہیں بڑھا سکتی، ہمیں ٹھنڈے ٹھنڈے سو جانے کو کہتی ہو وہ کبھی بھی آرٹ نہیں، اس لئے کہ وہ پورا نہیں ہے، ادھورا ہے، بے مطلب ہے، بے جان آرٹ سچائی کا گلا گھونٹ دیتا ہے، اس کا سمجھنے والا یا تو آرٹسٹ ہوتا ہے یا تھوڑے سے کچھ اور لوگ، مہاتما بودھ کی مورتیاں یونانی بتوں سے بہت الگ ہیں، مہاتما بودھ کی مورتیوں میں کھوکھلا پن ہے، یونانی بتوں میں ساری دنیا کے لئے سمجھنے اور پسند کرنے کی بات ہے، بدھسٹ بت تراش اپنے بودھ کو حقیقت سے دور کھینچ لاتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ آدمیوں کا اچھا ڈھانچہ نہیں بنا سکتے تھے، بلکہ اس لئے کہ وہ مہاتما بودھ کے صرف خاص خاص روحانی جلوے دکھانا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے ایسے ایسے بت بنائے جن میں ان کی ہر بیٹھک اور آسن بالکل روحانی ہے، مہاتما بودھ ان کے لئے آدمی اور ہیرو کی حیثیت سے زیادہ توجہ کے قابل نہ تھے ان کی ہر تصویر سے گیان اور سوچ کا پتہ چلتا ہے، اب وہ نقش اور نشان بن کر رہ گئے ہیں، ہم ان سے دور ہو گئے ہیں اور بدھ کے بتوں میں اس بات کے سوا کہ ان کے چہرہ پر شانتی اور امن کھیلتا ہوتا ہے، کوئی بات اپنی طرف کھینچنے والی نہیں ملتی۔ ہم ویراگ اور تصوف کے ان بھیدوں میں ڈوب کر بھی کچھ نہیں پا سکتے۔ کچھ خاص قسم کے مذہبی لوگ انھیں شاید سمجھ سکتے ہوں، پر دوسروں کی سمجھ سے تو یہ باہر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں یونانی بتوں کو لایئے ان میں ایک زبردست اپیل ہے۔ اس لئے کہ ہم ابھی آدمیوں کے اچھے، سڈول بدن کو دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ یہ ایک نہ مٹنے والی سچائی ہے جو سدا رہے گی۔ ایک نوجوان یونانی کی وہ تصویر جس میں وہ جوا کا پانسا پھینک رہا ہے [illegible] ابھی آج ضرور کھینچ لیتی ہے، اس کے ساتھ ہی بودھ کی وہ مورتی جس میں وہ ہاتھ میں گلاب لئے بیٹھے ہیں ایک دھندلی چھپی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ایسا آرٹ کبھی [illegible] نہیں ہو سکتا اور اس کی اپیل بہت کم لوگوں تک ہو گی۔ یہ ایک جانی بوجھی سچائی ہے کہ اپنی ترقی کی تاریخ میں جو ہم کل تھے وہ آج نہیں ہیں۔ اس لئے یہ ہونا ہی نہیں چاہیئے کہ ہم پرانے آرٹ کو زندہ کرنے کی کوشش کریں۔ دو ملکوں کے آرٹ کو لے لیجیے، تو اس میں آس پاس کی حالتیں، زندگی کے بہت سے واقعوں میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ آرٹ کا ایک ہی خیال دو زمانوں میں نہیں چل سکتا۔ اسلئے کہ کل جو بات ایک حقیقت تھی آج وہ سماجی حقیقت نہیں ہے۔ "ویدک زمانے کو لوٹ جاؤ" کی پکار آج بالکل پوچ بات ہے، اسی طرح یہ بھی فضول بات ہو کہ بھولی بسری چیزوں اور پرانی باتوں کو زندہ کیا جائے۔ گذرے ہوئے زمانے میں دوسری سماجی طاقتیں کام کرتی تھیں جن کی نہ تو آج ضرورت ہے اور نہ وہ آج رہ سکتی ہیں۔ کل کی سماجی حقیقت آج کی سماجی حقیقت نہیں بن سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں عبدالرحمن چغتائی اور بنگال اسکول کا آرٹ بالکل تصوف ہی تصوف معلوم ہوتا ہے، وہی خوابوں کی دنیا ہے، وہی دھندلا دھندلا، نیند لانے والا، افیم کی پینک میں اونچا سیر کرانے والا آرٹ اور لٹریچر ہے۔ یہ بیکار ہے، یہ نہ تو ہمت دیتا ہے نہ حوصلہ، بلکہ تھکا دیتا ہے اور ریڑھ کی ہڈی کو توڑ کر کبھی جھکا دیتا ہے۔ سماجی لگاؤ سے الگ رہ کر، سچائیوں کے احساس کو مٹا کر، کوئی اچھا آرٹ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس لئے ہر کسی نے آرٹ کو زندہ کرنے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے، کوئی سماجی مانگ نہیں ہے بلکہ نکلوں کی نقل ہے، یا منہ چڑانا ہے۔ اجنتا کے آرٹ میں اگرچہ آج کوئی خاص بات نہیں پھر بھی وہ ایک خاص زمانہ کی سماجی ضرورت تھی پر آج اس کی جتنی نقلیں کی جائیں گی وہ نقلیں ہی ہوں گی، اور دنیا انھیں بہت جلد بھول جائے گی۔

اعتراض نہیں کرتے تاہم ہم کو محتاط ہونا پڑتا ہے۔

اسی جلسہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک صاحب نے مقالہ پڑھا۔ جس پر میں نے اعتراض کیا۔ بحث کے بعد ڈاکٹر گوہا (پٹنہ) میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لائے اور کہنے لگے کہ بیس سالہ رنگوں پر تحقیق کے بعد میری یہ خواہش ہے کہ ان کی خواص کی توجیہ برقیاتی نظریہ پر کروں۔ آپ اس سلسلہ میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں برائے مہربانی میری مدد کیجئے۔ میں نے ان سے کہدیا کہ آپ مکمل مسئلہ میرے پاس بھیج دیجئے میں کوشش کروں گا کامیابی تاکامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔

مختلف لوگوں نے میرا پتہ پوچھا اور مجھ سے دلچسپی لی۔ ان کا خیال تھا کہ میں علی گڑھ میں پروفیسر ہوں اور وہاں کا تحقیقی کام میری ماتحتی میں ہوتا ہے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ میں انٹرمیڈیٹ کلاسوں کا پڑھانے والا ہوں۔ فرصت کے چند گھنٹوں میں ایک تیرہ و تار کمرہ میں تنہا بغیر کسی نوکر یا طالب علم کی مدد کے تھوڑا بہت کام کرتا رہتا ہوں۔ بہرحال میں نے انھیں بتایا کہ میں پروفیسر ہونا تو کجا میں تو علی گڑھ کا محض ایک لکچرر ہوں اور وہ بھی جونیر۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ علی گڑھ میں تحقیقی کام میری ماتحتی میں نہیں ہوتا ہے گو میں نے یہ نہیں کہا کہ وہاں کے اکثر پروفیسر اور طالب علم اپنے اپنے اہم کاموں میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ان میں سے بیشتر کو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ Semi polar Single Bond کیا ہے اور کس طرح وہ کیمیائی موجودہ مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

اسی زمانے میں سائنس کے کام کرنے والوں کی ایسوسی ایشن کا جلسہ ہوا جس میں حمید الحسن صاحب علی گڑھ کی طرف سے کونسل میں چُن لئے گئے۔ علی گڑھ کے طالب علم ہر موقع پر اپنے لئے ایک جگہ پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کا مظاہرہ اس سائنس کالج میں بھی ہوا۔

علی گڑھ کے لڑکوں نے ڈاکٹر سید محمود کو جا گھیرا۔ بیچارے بڑے خلوص دل سے ملے، ہم سب لوگوں پر ان کی محبت اور اُن کی شرافت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ ان سے ایک موٹر لاری لی جس پر بیٹھ کر　　پٹنہ کی سیر کی۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے یہاں پروفیسر کا لجو صاحب سے ملاقات ہوئی۔

ڈاکٹر کا لجو صاحب بڑی گرم جوشی سے پیش آئے۔ چونکہ آجکل وہ بہار صوبہ کے صنعت کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔ ان کی مدد سے لڑکوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ ڈالمیا نگر میں ایم۔ ایس۔ سی کے طالب علم کو چند ماہ کی ٹریننگ ملا کرے گی۔ کا لجو صاحب کی شرافت کے بھی ہم لوگ بہت قائل ہوئے۔ ہم اُن کے بہت مشکور ہیں۔

استدراک و تصحیح:۔ متعلق مقالہ ”غالب کی راست گفتاری“

(۱) صفحہ ۲۸ کلیات ابن یمین مجلدا سے متعلق اپنی لکھی ہوئی یادداشت کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں رباعیاں ہیں۔ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں اشعار ابن یمین کے جتنے قلمی نسخے ہیں، سب دیکھئے کسی میں وہ قطعہ نہیں جس کا غالب نے ذکر کیا ہے۔

(۲) صفحہ ۳۷ سطر ۱۸، ۱۹۔ اس کا امکان کہ شہید نے مصرع اس طرح لکھا ہو جس طرح اردوئے معلّٰے میں ہے بہت کم ہے۔

(۳) صفحہ ۴۷ سطر ۱۴۔ میری رائے میں غالب کا خط ضرور نصیر الدین حیدر کی وفات سے قبل کا ہے، لیکن اس کے متعلق اختلاف رائے ممکن ہے۔ میری تحریر میں ”یہ ظاہر ہے“ قابل ترمیم ہے۔

(۴) صفحہ ۴۸ سطر ۱۵ ”بات ہے“ کے بعد اضافہ ”از روئے دفتر“ تصدیق اس لئے نہیں ہو سکتی تھی کہ یوسف علی خاں نے وعدہ ہی نہیں کیا تھا۔

مضمون میں بعض اغلاط رہ گئے ہیں، یہاں صرف اہم اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے:۔ (۱) صفحہ ۳۴ سطر ۱۰۔ اور حاشیہ صفحہ ۳۸ پر ناموں کے آگے ”صاحب“ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ (۲) صفحہ ۳۵ سطر ۶ ”اغلاط عربی“ کی جگہ ”اغلاط الفاظ عربی“۔ (۳) صفحہ ۳۶ سطر ۱۶ ”اس بات کے“ کی جگہ ”اس کے“۔ (۴) صفحہ ۳۷ سطر ۲۰ ”اس کے بعد“ حذف کر دیا جائے۔ (۵) صفحہ ۳۹ سطر آخیر ”آتش قزلباش“ ہونا چاہیے۔

. . . کے اندر میں نے اس کی توجیہ اپنے نظریہ کی بنا پر کی جسکی بنیاد پر کیمسٹری کی موجودہ اکثر مشکلات کی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن مجھے اس بات کا بہت خطرہ تھا کہ کہیں ڈاکٹر جوشی اس توجیہ سے موافقت نہ کریں تو چونکہ اس مسئلہ پر اُن کی رائے آخری حیثیت رکھتی ہے۔ اسلئے میرے اپنے نظریہ کی حقیقت لوگوں کی نظر میں بہت کم ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ پہلو میرے نظریہ کا ایک اہم پہلو تھا۔ بہرحال میں نے اپنی بات سمجھا کر کہدی۔ لوگ جو قدرے آپس میں گفتگو کر رہے تھے مجھ کو ترکی ٹوپی اور کالی شیروانی میں دیکھکر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میرے بعد ڈاکٹر جوشی جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے کیا سکون حاصل ہوا جب انھوں نے میرے نظریہ کی بہت کھلے دل سے تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ اس مسئلہ پر میں نے اس پہلو سے کبھی غور نہیں کیا۔ میرے علی گڑھ کے دوست کے خیالات نہایت Suggestive ہیں۔

اس جلسہ کے بعد مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ لوگوں نے اس نظریہ کی بہت تعریف کی۔ ان میں ڈاکٹر جوشی اور ڈاکٹر پرشانت (کلکتہ) کے خلوص دل کا میں بہت معترف ہوں۔ پروفیسر منڈلے بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ بعد میں ایٹ ہوم میں ملاقات ہوئی۔ میں نے علی گڑھ آنے کی دعوت دی تو کہا کہ مجھے علی گڑھ آنے کا بہت اشتیاق ہے اور ضرور آؤں گا۔ دوسرے دن پھر ایک اور جگہ ملاقات ہوئی مختلف مباحث پر بات چیت ہوئی۔ اسی ایٹ ہوم میں ڈاکٹر جوشی سے بھی دوبارہ ملاقات ہوئی کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اپنے نظریہ کے ذریعہ "جوشی اثر" کی توجیہ کے متعلق ان سے بات چیت کی اور اس کے چند نتائج بتائے۔

۶ تاریخ کو میرے مقالہ کی باری آئی۔ پروفیسر سنجو اراؤ نے عام دستور کے خلاف میرے مقالہ کی اہمیت بتلائی اور کہا کہ اس پر کافی بحث ہونی چاہیے۔ میں نے اپنے دونوں مقالوں کے متعلق گفتگو شروع کی تو صدر صاحب نے ٹوکا کہ اگر آپ کا مفروضہ مان لیا جائے تو بقیہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آپ محض اپنے مفروضہ پر گفتگو کریں۔ اگرچہ یہ دستور کے خلاف تھا لیکن میں نے اسی موضوع پر تقریر کی۔ جب میں اختتام پر بیٹھا تو صدر صاحب نے فرمایا کہ اب اس مسئلہ پر بحث ہونی چاہیے۔ تمام ہال میں خاموشی تھی لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر داس (کانپور) نے کہا کہ ایسے اہم مقالہ پر بغیر سوچے سمجھے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور ہمیں افسوس ہے کہ مقالات کے اقتباسات ہمیں گھر نہیں بھیجے گئے۔ تاکہ ہم اس مسئلہ پر سوچ کر آتے۔ صدر صاحب نے حالات موجودہ کی دشواریوں کی طرف توجہ دلا کر معذرت چاہی۔ جب کوئی اور نہ اٹھا تو صدر صاحب نے پروفیسر رے صدر انڈین کیمیکل سوسائٹی سے کہا کہ آپ اعتراض کریں۔ میں نے یہ بات پیش کی تھی کہ کلورین کے سالمے کو $Cl : Cl$ کی حیثیت سے پیش کرنا غلط ہے۔ کیونکہ اس ضابطہ سے اس کی کیمیاوی فعالیت کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ اس کے رنگ کی توجیہ ہوتی ہے۔ (کلورین سبزی مائل زرد گیس ہے اس ضابطہ کے لحاظ سے اسکو بے رنگ ہونا چاہیئے) نہ اس کی توجیہ ہوتی ہے نہ اس کی برقی موصلیت سمجھ میں آسکتی ہے اور "جوشی اثر" کی وجہ بیان کی جا سکتی ہے۔ اور نہ روشنی سے سالمہ کے ٹوٹنے پر جو اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سالمہ کو اس طرح کا ضابطہ دینا چاہیے۔ $Cl^{+\frac{1}{2}}\,Cl^{-\frac{1}{2}}$ جس کو میں Semi Polar Single Bond کہتا ہوں۔ اس کی مدد سے دوسرے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں۔ جن کا ذکر میں نے دوسرے مقالہ میں کیا تھا۔

ڈاکٹر رے ابھی اعتراض کر کے فارغ ہوتے ہی تھے کہ ڈاکٹر داس (کانپور) نے خود ان پر اعتراض کر دیا کہ اگر آپ کا اعتراض صحیح ہے تو پھر Cl_2 میں رنگ کیوں ہوتا ہے۔ اس پر فاضل پروفیسر کو خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر سنہا (پٹنہ) جنھوں نے معدن کے مرکبات پر کام کیا تھا انھوں نے بھی ایک اعتراض کیا۔ یہ میرے کام (مقالہ ۲) کے بہت معترف تھے! اور جس خلوص سے انھوں نے میری ہمت افزائی کی تھی اس کے لئے میں ان کا بہت شکر گذار ہوں۔ بہرحال اعتراض کا جواب میں نے مسکت طور پر دیدیا۔ آخر میں ایک صاحب نے $-\frac{1}{2}$ ، $+\frac{1}{2}$ کے ہندسوں پر اعتراض کیا۔ میں نے انھیں سمجھایا۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ اس کو Dipo—ر کہنا چاہیے۔ محض لفظوں کا پھیر تھا میں نے کہدیا کہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ صدر صاحب نے حسب معمول تعریفی کلمات کہتے ہوئے بحث کو ختم کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ ہم کو اطمینان نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کا کوئی محل نہ تھا۔ میں نے فوراً کہا اگر کوئی اعتراض ایسا ہو جس کا میں جواب نہ دے سکوں تو آپ کا کہنا بجا تھا۔ لیکن بغیر اس بات کے آپ کا یہ کہنا جائز نہ تھا۔ اس پر ہال میں سب طرف سے معذرت طلبی شروع ہوئی۔ سنجو راؤ صاحب نے بھی معذرت کی۔ جلسہ کے بعد کہا کہ آپ کا نظریہ اس قدر انقلاب انگیز ہے کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو ہمیں اپنے خیالات میں بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اور اگرچہ ہم

بہت سے لوگ اتفاق نہیں کرتے، اس لئے ان کو انجمن سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس تحریک میں کوئی بھی شائبہ حقیقت کا ہو، اُردو کو جو لوگ عزیز رکھتے ہیں خواہ اُن کا مسلک کچھ ہی کیوں نہ ہو اُنکی حیثیت ہمیشہ یکساں ہے اور یکساں ہونی چاہیئے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی آپ اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ بات دل سے محو کر دیں اور آپ یہ نہ سوچیں کہ وہ شخص کس عقیدے سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا مسلک کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں اُردو کی طرف سے ہرگز ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ ہاں بعض اُردو والوں کی حرکتوں سے بایوس ضرور ہوں۔ یہ خیال کتنا غلط ہے کہ اُردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، اُردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہرگز نہیں، بلکہ اس کا تعلق اس ملک کے بیشتر رہنے والوں سے ہے، بات بڑی نازک ہے اور نازک میں خطرناک کے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ ایک وقت آیا جب کچھ لوگوں نے ایک تحریک اٹھائی اور وہ برسرکار آئی۔ کچھ لوگ بسنے، کچھ چلے گئے۔ جو چلے گئے اُن کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے یہ کہنا غلط ہے کہ اُردو کسی خاص فرقے یا طبقے کی ملکیت ہے۔ اگرچہ کوئی مخصوص گروہ اسکی اجارہ داری کا مدعی نہیں ہو سکتا لیکن اُن لوگوں کو جو آج دوسروں کے کہنے میں آکر اس سے رشتہ توڑ رہے ہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تاریخ ان کو انھیں الفاظ میں یاد کرے گی جن سے آج ہندوستان سے کسی دوسرے ملک میں جانیوالوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ صاف صاف الفاظ میں یہ غداری ہوگی۔ اس زبان کو ہم دونوں نے بنایا، دونوں نے اسکی خدمت کی، اسپر فخر کیا اور اس پر ہم دونوں کو ناز ہے۔ اب حکومت کے کہنے سے اگر وہ ساتھ چھوڑ دینگے تو وہ قابلِ الزام ٹھہریں گے اور انھیں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کا نام مورخ کیہاں کس طرح لیا جائے گا۔

لکھنؤ میں اُردو کی وہ حالت نہیں ہونی چاہیئے جو بعض جگہ حالت بنا دی گئی ہے، ایک چیز پورے طور پر ملحوظ رکھیں، یہ بات ہماری سرشت میں داخل ہو گئی ہے کہ جو حکومت کہتی ہے وہ صحیح کہتی ہے اور ہم اس کے کرنے پر ہر طرح سے مجبور اور لاچار ہیں، اور جو کچھ ہم کہیں گے یا کریں گے وہ یکسر خراب و ناقص ہے۔ حکومت کا کسی چیز کو نافذ کر دینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حق بجانب ہے۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے رشید صاحب نے اُردو کے مستقبل کے یاد رکھنے والوں سے ایک بار پھر اپیل کی کہ موجودہ حالات سے متاثر نہ ہوں بلکہ اس کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کے لئے جد و جہد کریں۔

یونیورسٹی کی عام حالت :۔

تعداد :۔ فسادات اور تقسیم ہند کا ہماری یونیورسٹی پر گہرا اثر پڑا ہے، دور دراز کے طلبا، فسادات اور دہلی کے ہنگاموں کی وجہ سے نہ آ سکے، تقسیم کی وجہ سے اور راہ کے خطرات کے باعث سرحد، کشمیر، پنجاب، بنگال کے طلبا بھی نہ آ سکے۔ جو آئے ہیں اُن کی تعداد بہت کم ہے لیکن انڈین یونین کے طلبا کی بہت اچھی خاصی تعداد اس سال آئی ہے، اس میں صوبہ متحدہ اور بہار کے طلبا کی تعداد سب سے زائد ہے۔ حیدرآباد کے معاملات ختم ہو جانے کے باعث اب وہاں سے بھی کچھ طلبا آنے شروع ہو گئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس سال طلبا کی وہ کثرت تو نہیں جو کبھی پہلے تھی پھر بھی ان کی تعداد بہت اچھی ہے صرف سرسید ہال میں ۱۵۱۴ ، وقار الملک ہال میں ۳۰۰ ۔ آفتاب ہال میں ۵۰۰ سے زائد۔ سرشاہ سلیمان ہال میں ۳۰۹ ہیں اسکے بعد بھی داخلے ہوتے رہے ہیں۔ اسکول، گرلز کالج، طبیہ کالج وغیرہ کے طلبا اور طالبات کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ مجموعی تعداد طلبا کی اکیس سو ہے۔

غیر مسلم طلباء :۔

سابق کی طرح اس سال بھی غیر مسلم طلبا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، پناہ گزین طلبا کی وجہ سے اس سال تعداد بڑھ گئی ہے، باہر سے آئے ہوئے غیر مسلم طلبا عام طور پر ٹیکنیکل لائن کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ ہوسٹل کے داخلے میں ذات، مذہب کسی چیز کی تفریق نہیں رکھی جاتی، اکثر ہوسٹلوں میں غیر مسلم طلبا ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ ہی کھاتے پیتے ہیں۔ ایس ایس ہال اور سلیمان ہال میں اُن کی اچھی خاصی تعداد ہے جو مسلم طلباء کے ساتھ رہ کر تعلیم میں مصروف ہیں۔ وہ طلبا جو الگ ہوسٹل میں رہنا چاہتے ہیں اُن کے لئے ایک علیحدہ ہوسٹل کا انتظام بہت پہلے سے ہے۔ امین ہوسٹل ایسے ہی غیر مسلم طلباء کے لئے مخصوص ہے۔

ہمارے ہال :۔

آفتاب ہال اپنی پرانی علمی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ محسن الملک ہال کے ٹوٹ جانے سے اس ہال میں طلباء کی تعداد کچھ زائد ہو گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ میکلین کورٹ جیسے ہوسٹل میں بھی ایک کمرے میں تین تین طالب علم رکھے گئے ہیں۔ بہرکیف یہ ہنگامی چیز ہے، امید ہے جلد ہی اس کا تدارک کر دیا جائیگا۔ وقار الملک ہال میں زیادہ تر سائنس کے طلباء ہیں اور ان کے محبوب پرووسٹ پروفیسر طاہر رضوی کی وجہ سے انھیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔ سرشاہ سلیمان ہال میں ڈاکٹر رفیق احمد صاحب نے ایک خاص زندگی پیدا کر دی ہے، اور امید ہے کہ ان کا دور، دورِ سعید ثابت ہوگا۔ سرسید ہال اپنے محبوب اور مقبول پرووسٹ جناب ایس ایم شفیع صاحب کی سرکردگی میں تیزی سے ترقی کے انتہائی مدارج طے کر رہا ہے۔ شفیع صاحب نے اپنے عہد میں اس ہال کو جس بام ترقی پر پہنچا دیا ہے اسکی نظیر علی گڑھ کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ان کی صبح و شام، دن رات، اسی فکر میں کٹتی ہے کہ اس ہال میں کون سے وسائل اختیار کرنے چاہئیں جس سے طلباء کا فائدہ ہو اور ہال کی عظمت بلند ہو۔ وہ جس نظم و ضبط، استقلال، محنت اور فرض شناسی سے کام کرتے

کوائفِ جامعہ

پروفیسر محمد حبیب۔

ہمارے شعبۂ تاریخ کے صدر پروفیسر محمد حبیب نے کل ہند تواریخی کانگریس کے دسویں اجلاس میں ایک جلسے کی صدارت کی۔ آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:—

اس وقت سب سے بڑا خطرہ افراد کے اوپر فرقہ پرستی کی گرفت تھی جو آج بھی اتنی ہی مکمل ہے جتنی ازمنۂ وسطیٰ میں تھی۔ اس لئے ہندوستان کے سامنے بنیادی کام یہ ہے کہ ایک قومی ثقافتی گروہ باقاعدہ قائم کریں جو پرانے ثقافتی گروہوں کے تمام محاسن کا وارث ہو اور ہمیں ان مخرب اخلاق مفادات سے محفوظ رکھے جو ہماری زندگی پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں" نہرو حکومت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:—

ازمنۂ وسطیٰ کی دو عظیم الشان سلطنتوں میں سے ایک میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کو اتنی نمایندگی نہیں ملی جتنی انھیں کانگریس کی موجودہ حکومت میں حاصل ہے"

پروفیسر محمد حبیب آجکل پیرس میں "انجمن اقوام متحدہ میں ہندوستان کی طرف سے معاون نمایندہ ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ایک شعبہ کی صدارت فرمائی۔ آپ نے فرمایا:—

آپ نے اس منصب پر مجھے فائز فرما کر جو کرم کیا ہے اُسکی مجھے بڑی خوشی ہے ایسی خوشی جس میں شکر گذاری شامل ہے۔ ایسی خوشی اور ایسی شکر گذاری جس کا مجموعہ فخر کہلاتا ہے۔ یہ تینوں جذبات میں اپنے اندر پاتا ہوں اور یہی نذرانہ آپکی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

سرور صاحب نے میرے متعلق جو کچھ فرمایا ہے میں سوچتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے کاش میں اس کا اہل ہوتا۔ میں یقیناً اُس کا اہل نہیں ہوں لیکن جس لطف و محبت سے انھوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے اس سے میں دل میں ایک ولولہ پاتا ہوں کہ میں کوشش کروں کہ اس سطح پر پہنچ سکوں جسکی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں کہ اپنے خیالات کا اظہار آپکے سامنے کس طرح کروں اسلئے کہ اس زمانے میں حالانکہ اس طرح سے بدلے ہیں کہ میری سمجھ میں تو آتا ہے لیکن دوسرے اس درجہ سراسیمہ و پریشان ہیں کہ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جو اتر میرے دل پر ہے یا جس کی طرف لوگ اشارہ کر رہے ہیں وہ واقعہ ہے درامل یہ واقعہ نہیں ہے۔ جہانتک اُردو کا تعلق ہے میں اسقدر پریشان اور مایوس نہیں ہوں جسقدر ہمارے دوست ہیں۔ ابھی جب میں آپکی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا تو مجھے دو رسالے ملے ایک کا نام "ہمچی سمجھا ہے" اور دوسرے کا "اُردو کا جنازہ" صورتِ حال کچھ بھی ہو تو ہماری کیفیت ایسی ہے کہ ہمارا شمار جریدوں میں ہونے لگے ورنہ جنازہ نکالنے کی کوئی وجہ نظر آتی ہے۔ بہرحال یہ عرض کرنا اسوقت بے محل نہ ہوگا کہ علی گڑھ نے اُردو کو جمہوری بنانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جو لوگ اُردو کی تحریکات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ علی گڑھ کسی طرح نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ اُردو کو مخصوص حلقوں سے نکال کر جمہور تک پہنچانے میں علی گڑھ کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جب علی گڑھ تحریک شروع ہوئی اور سرسید اور اُن کے رفقائے کار برسرِ اقتدار آئے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ اُردو جو پہلے بعض ٹکسالی ہونے کی حیثیت رکھتی تھی دہلی اور لکھنؤ کے ٹکسالوں میں مقید رہی۔ سرسید اور اُن کے رفقائے کار نے یہ قید توڑی اور وہی اُردو مستند اور مقبول عوام ٹھہری جو علی گڑھ میں پیدا ہوئی۔ آپ دیکھیں گے اسوقت ایسی نسل موجود ہے جو عوام میں اخبارات و رسائل اور ادبی جرائد میں مقبول ہے۔ ان سب کے امام ابتک وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس تحریک کو علی گڑھ سے اٹھایا اور چلایا۔ نثر کا کون سا اسلوب ایسا ہے جو سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد کے اسکول سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور یہ اسالیب اتنے رواں دواں ہیں کہ ہندوستان میں جہاں کہیں اُردو مقبول ہے اور اُردو کا کاروبار ہوتا ہے وہاں یہاں کی رہبری سے کسی کو مفر نہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی طرف سے جو اعزاز مجھے بخشا گیا ہے اس سلسلے میں مجھے عرض کرنا ہے کہ ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ مجھے بعض حلقوں میں پرانے خیال کا لکھنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب مجھے نئے طرز کے لکھنے والوں میں سمجھا جاتا تھا۔ آج وہ وقت ہے کہ نئے اور پرانے دونوں اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں اپنے انجام سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دونوں مجھ سے دست بردار نہ ہو جائیں مجھے یقین ہے وہ زمانہ کبھی نہیں آئیگا۔ میرے ایک بڑے ہی عزیز دوست سرور صاحب نے ایک بڑے مصنف کا مقولہ ہے کہ "دنیا میں جہاں کہیں بھی حسین عورت ہو وہ میری محبوبہ ہے" اس لئے اُردو جس شکل میں بھی رہیگی مجھے وہ محبوب ہوگی۔ مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ پچھلی صحبت میں ایک گوشے سے یہ تحریک پیش کی گئی کہ ترقی پسند مصنفین میں لوگوں کا مسلک کچھ ایسا ہو جس نے

لٹن لائبریری:-

ہمارے لائق لائبریرین سید بشیر الدین صاحب کی سرکردگی میں لٹن لائبریری کافی ترقی کر رہی ہے۔ ہر سال ایک اچھی تعداد مفید اور اعلیٰ کتابوں کی آجاتی ہے۔ اب لائبریری کی طرف سے ہر تین ماہ پر نئی [illegible] کتابوں کی فہرست انگریزی میں چھپنی شروع ہو گئی ہے، اسکی پہلی فہرست ہمارے سامنے ہے جولائی سے ستمبر تک ۱۳۵ نئی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ صرف انگریزی زبان کے تقریباً ۴۰ اخبارات و رسائل ہندوستان، انگلستان، امریکہ، فرانس اور دوسرے ممالک سے آتے ہیں۔ ۱۷ مارچ تک لٹن لائبریری میں انگریزی کی کتابوں کی تعداد ۴۲۸۵۴ تھی۔ مشرقی شعبے کی حالت بھی قابل ذکر ہے، ہمارے لائق دوست جناب عبدالستار خاں صاحب شروانی اور ینٹیل سکشن کے نگراں مقرر ہوئے ہیں۔ امید ہے ان کے زمانے میں اس شعبہ کو کافی ترقی ہو جائیگی۔ مشرقی حصہ میں لٹن لائبریری کی کتابوں کے علاوہ مختلف ذاتی ذخیرے بھی جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود ہم لائبریری کمیٹی کے اراکین سے عرض کریں گے کہ مشرقی شعبہ پر اس قدر توجہ نہیں دی جاتی ہے جس کا شعبہ مستحق ہے۔ بعض عمدہ اور اچھی کتابیں سال گذر جانے پر بھی لائبریری میں نہیں آتیں، جو مفید کتابیں غائب ہو جاتی ہیں تو اسکی جگہ جلد پر کرنے کی کوشش نہیں کیجاتی۔ ہر مشہور مصنف و شاعر کے لئے الگ الگ علیحدہ شلف ہونی چاہیئے جس پر اس سے متعلق سارا ممکن الحصول لٹریچر موجود ہو۔ غالب، اقبال، مولانا آزاد کے لئے تو الگ الماریاں چاہیئں جن میں اُن کی تمام تصانیف اور اس کے تمام ایڈیشن موجود ہوں۔ پھر ان مصنفین پر جتنی کتابیں ابتک اُردو اور انگریزی میں لکھی گئی ہیں سب موجود ہونی چاہیئں۔

یہ مقام افسوس ہے کہ غالب جیسے مشہور شاعر و مصنف کی بعض کتابیں یہاں نہیں ملتیں۔ مشرقی شعبہ میں قلمی کتابوں کی تعداد ۵۲۵۵ ہے۔ اس میں حبیب اللہ، عبدالسلام، شیفتہ، احسن مارہروی، سر سلیمان، منیر عالم کی کتابوں کے علاوہ ذخیرہ سہارنپور بھی شامل ہے۔ قلمی کتابوں میں متعدد نفیس اور بہت قیمتی نسخے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ابتک ان کتابوں کی تفصیلی فہرست انگریزی میں شائع نہیں ہوئی ہے، ایک زمانے میں کام شروع ہوا بھی تھا پھر وہ سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ ہم لائبریری کمیٹی کے اراکین خصوصاً ڈاکٹر ہادی حسن صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب سے عرض کریں گے کہ وہ اس ضروری کام کی طرف براہ کرم فوری توجہ فرمائیں۔

ہماری یونیورسٹی کے نتائج:-

یونیورسٹی کے امتحانات ۱۹۴۸ء کے نتائج کافی تشفی بخش ہیں، ایم اے فائنل میں طلباء ۹۲ فی صدی کامیاب ہوئے ہیں، پریویس میں ۸۸ فی صدی، ایم ایس سی فائنل ۶۰/ پریویس ۷۸/ بی اے آنرز ۷۵/ بی ایس سی آنرز ۱۰۰/ بی اے ۸۴/۔ بی ایس سی ۶۰/ بی کام ۹۴/ انٹر آرٹس ۸۵/ سائنس ۶۱/- زراعت ۸۵/- کامرس ۵۰/- ہائی اسکول ۷۷/- بی ٹی ۹۳/- قانون پریویس ۷۲/- فائنل ۹۰/- بی اس سی انجینیرنگ ۸۳/- ڈپلومہ ۸۵/- طبیہ ۱۰۰/-
امتحان میں شریک ہونے والے طلباء کی تعداد ۲۱۱۲ تھی اور کامیاب طلباء کی ۱۴۲۰۔

مسلم گرلز کالج:-

مسلم گرلز کالج کی تعلیم تشفی بخش ہی نہیں، بے حد قابل تعریف ہے ۱۹۴۸ء کے نتائج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی نہیں کہ ہماری بہنوں نے بے حد ترقی کی ہے بلکہ سارے امتحانات میں وہ اپنے بھائیوں پر بازی لے گئی ہیں۔ اس کا راز تو اید—
ذیل کے نقشہ سے اس کا اندازہ ہوگا۔

	کامیاب طلباء	کامیاب طالبات
ایم اے فائنل	۹۴ فیصدی	۱۰۰ فیصدی
ایم اے پریویس	۹۱ 〃	۱۰۰ 〃
ایم ایس سی فائنل	۵۷ 〃	۱۰۰ 〃
ایم ایس سی پریویس	۷۹ 〃	۱۰۰ 〃
بی ٹی	۹۳ 〃	۱۰۰ 〃
بی اے	۸۰ 〃	۸۸ 〃

	کامیاب طلباء	کامیاب طالبات
بی ایس سی	۵۹ فیصدی	۱۰۰ فیصدی
انٹرمیڈیٹ آرٹس	۵۸ 〃	۷۰ 〃
انٹر سائنس	۶۲ 〃	۸۴ 〃
ہائی اسکول	۷۷ 〃	۹۴ 〃

ہم اس شاندار نتیجہ پر خان بہادر شیخ عبداللہ، اور گرلز کالج کی پرنسپل مسز ممتاز حیدر دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

یہ وہ دوسروں کے لئے باعثِ تقلید ہے، ان کے ہال کے طلبا ان کی شفقت و محبت کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ یہ ایک مشہور مثل ہے کہ ہر ایک کو خوش رکھنا ناممکن ہے لیکن شفیع صاحب نے اس کلیہ اور مسلم الثبوت نظریہ کو باطل کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے عہد میں، ان کے ہال کا ہر طالب علم ان سے خوش اور راضی مطمئن ہے۔ ہم اس کامیاب عہد پر ادارہ کی طرف سے شفیع صاحب کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

یونین:۔

علی گڑھ کے طالب علم کے لئے یونین کی بڑی اہمیت ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وہ علمی اور سیاسی شعور حاصل کرتا ہے، مقامِ مسرت ہے کہ اس سال مسلم یونیورسٹی یونین کی باگ ڈور ایک ایسے نوجوان کے ہاتھ میں ہے کہ جسے اپنے فرائض کا پورا پورا احساس ہے اور وہ نازک موقع پر بھی طلبا کی نمائندگی کرتے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹاتا۔ میری مراد شاہ حسن عطا صاحب سے ہے جو پچھلی وزارت میں معتمد کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے چکے ہیں۔

کابینہ کی رسم جائزہ کے موقع پر انھوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ خطابت و سیاست کا اچھا نمونہ تھا۔ انھوں نے بہت سلجھے ہوئے اور سنجیدہ انداز میں ہندوستانی اور عالمی سیاست پر نگاہ ڈالی تھی، علی گڑھ اور علی گڑھ کی موجودہ پالیسی کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ان لوگوں کے لئے جو علی گڑھ کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، سرمۂ بصیرت کا کام دے گا۔ یونین کے کتب خانہ اور دار المطالعہ میں مفید اور اچھی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اخبار اور رسائل کی اچھی تعداد یونین میں آتی ہے۔ داخلی و خارجی کھیلوں کا انتظام بھی معقول ہے۔ اور بچوں کے اسکول کے انتظامات اچھے ہیں اور یہ سلسلہ بے حد مفید ہے۔ یونین کی عمارت بے حد مختصر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جمع شدہ رقم سے نئی عمارت کا کام شروع کر دیا جائے اور اب اس میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔

ہمارے نئے رسائل:۔

یونیورسٹی میگزین کے علاوہ یہاں مخصوص اداروں اور شعبوں کی طرف سے مختصر سے رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ گرلز کالج میگزین، اسکول میگزین، انجینئرنگ کالج میگزین، کے علاوہ سر سید ہال سے "سر سید ہال میگزین" اور شعبۂ کامرس سے "جرنل آف کامرس" اور شعبۂ جغرافیہ سے "جیاگرفر" نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہم ان نئے رسالوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے "آفتاب ہال"، "شعبۂ حیوانیات"، اور "شعبۂ تاریخ" کے رسالے شائع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالے جلد ہی شائع ہوں گے۔

ہمیں یہ جان کر مسرت ہوئی کہ عمر الدین صاحب شعبۂ فلسفہ سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتے ہیں، اس اقدام پر ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔

ہماری انجمنیں:۔

لجنۃ العربیہ (عربک سوسائٹی) کے معتمد مسعود صدیقی، نائب صدر مختار الدین احمد آرزو اور صدر استاذ عبد العزیز المیمنی بنائے گئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے رفیق مسعود صدیقی صاحب نے سوسائٹی میں نئی جان ڈال دی ہے اور تازہ روح پھونک دی ہے، انھوں نے جتنی ادبی پارٹیاں اور جلسے کئے ہیں وہ دوسری سوسائٹیوں کے لئے باعث رشک ہیں۔ سوسائٹی کے پہلے جلسہ میں اچھے مقالے پڑھے گئے ہیں جن میں محی الدین زبیری صاحب کا مقالہ "عربی کی اہمیت و ضرورت" پر خاص اہم تھا اس کے بعد راقم الحروف نے ایک تقریر کی۔ مولانا بدر الدین علوی نے بہت سی مفید باتیں اپنی صدارتی تقریر میں بتائیں۔ دوسرے جلسہ میں امریکی مستشرقہ مسز ڈونلڈسن نے "قدیم عربوں کے اخلاقی حالات" پر تقریر کی۔ تیسرے جلسہ میں مسعود صدیقی صاحب نے "کلیلہ و دمنہ" پر ایک پُرمعلومات مقالہ پڑھا۔ میمن صاحب نے کلیلہ و دمنہ، اس کے مصنف، اس کا عہد، اس عہد کا ادب، سیاسی و ثقافتی حالات کے ساتھ اس کتاب کے مختلف قدیم نسخے جو دنیا میں ہیں اور اس کے مختلف ایڈیشن پر بہت ہی فاضلانہ تقریر فرمائی۔ ہمارا ارادہ ہے کہ عربک سوسائٹی کی طرف سے ایک رسالہ نکالیں جس میں اسلامی تہذیب و تمدن، عربی زبان و ادب اور تاریخ اسلام پر مفید اور قیمتی مضامین ہوں۔

(اردو سوسائٹی) یوسف حسن صاحب ایم اے (رفاہیں)، انجمن اردوئے معلی کے معتمد مقرر ہوئے ہیں۔ انجمن کے تین جلسے رشید احمد صدیقی صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوئے، پہلے جلسہ میں ہنس راج رہبر نے اپنا افسانہ "ڈگورنا" اور کھیم سنگھ ناگر اور صاحب سنگھ مہرا نے اپنے گیت سنائے۔ مسعود حسین خاں، اختر انصاری، خورشید الاسلام، معین احسن جذبی نے بھی اپنی نظمیں سنائیں۔ دوسرے جلسہ میں یوسف حسن صاحب نے اپنا مقالہ "ہندی اور اردو" پڑھا۔ جذبی صاحب نے "نیا سورج" سنائی۔ تیسرے جلسہ میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب بھی موجود تھے۔ اس جلسہ میں سرور صاحب، اختر انصاری، مسعود حسین خاں، جذبی، خورشید الاسلام اور خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی نظمیں سنائیں۔

مولانا راغب بدایونی
(مرحوم)

سابق استاذ شعبہ دینیات
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

[illegible] الدین احمد مرحوم

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

سانحاتِ ارتحال
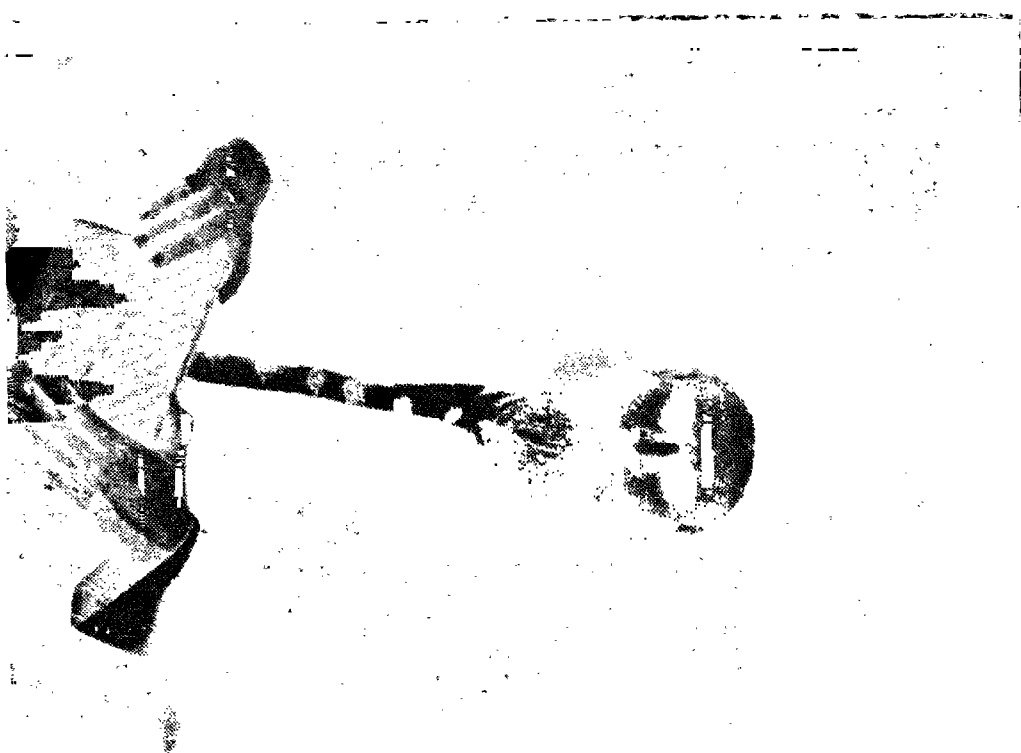
ڈاکٹر ضیاء الدین احمد :-

ہندوستان کے مشہور ریاضی داں، ماہر تعلیمات اور ہماری جامعہ کے ریکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد گزشتہ دسمبر میں لندن میں انتقال کر گئے۔ مرحوم نے علی گڑھ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ یہیں استاد ہوئے، بعد کو پرو وائس چانسلر اور پھر متعدد بار وائس چانسلر بنے اور تقریباً ساری زندگی انھوں نے علی گڑھ ہی میں ختم کر دی۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کی خدمت میں گزرا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے مستقل مزاج اور صابر شاکر تھے۔ بڑے بڑے حادثے اور واقعے کا اثر بھی ان کے لئے دیرپا نہ ہوتا تھا۔ وہ دھن کے پکے اور عزم کے بڑے راسخ تھے۔ جس کام کے لئے وہ کمر باندھ لیتے تھے پورا کئے چھوڑتے تھے۔ انکی سوچی ہوئی راہ اور رکھے کردہ منزل سے انھیں ہٹانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ سخت سے سخت حالات میں بھی مخالفتوں کے طوفان اور پریشانیوں کے انبار سے ان کے ارادوں میں تزلزل اور استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنی مخالفتوں کی کبھی پروا نہیں کی۔ بڑے سے بڑے کردار، ایک سے ایک صلاحیت اور مضبوط سے مضبوط طاقت کا شخص ان کے مقابل آیا اور ان کی حکمت عملی ... پاش پاش ہو گیا۔ ان کی موت سے ہم نے ایک ریاضی داں، ایک مسلم الثبوت ماہر تعلیمات اور ایک کھلاڑی سیاست داں کھو دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ علی گڑھ کا پچاس سالہ رفیق اور دوست ہمیں ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ گیا۔ انکی زندگی اور موت میں ہمارے لئے سبق بھی ہے اور عبرت بھی۔ خدا مرحوم کی قبر ٹھنڈی رکھے اور ان کی مغفرت فرمائے۔

مولانا یعقوب بخش راغب :-

جامعہ کا دوسرا بڑا سانحہ ہمارے شفیق استاد مولانا راغب کا انتقال پُر ملال ہے۔ مولانا مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، بے حد خلیق، ملنسار اور ظریف الطبع۔ ان کا علم بڑا وسیع تھا اور حافظہ بے پناہ، ہر عمر اور ہر انداز کا آدمی ان سے ملتا اور خوش ہو کر آتا، عربی بے تکان لکھتے تھے اور فارسی بے تکان بولتے تھے اور شاعری عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کیا کرتے تھے۔ ہیئات و ریاضی سے خاص دلچسپی تھی اور معقولات و منقولات دونوں پر حاوی تھے۔ مولانا کی وفات سے جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ دیر تک پُر نہ ہو سکے گی۔ ہمیں اس صدمہ میں ان کے صاحبزادے طیب بخش قادری بی اے آنرز (شلنگ) اور دوسرے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا مرحوم کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔

پروفیسر عبداللہ بٹ :-

عبداللہ بٹ صاحب ہمارے جامعہ میں ریاضی کے استاد تھے اور بے حد ملنسار اور خلیق آدمی تھے۔ گزشتہ لمبی چھٹیوں میں وطن تشریف لے گئے تھے وہیں کسی نے انھیں شہید کر دیا۔ ان کی موت پر ہم جتنا بھی افسوس کریں کم ہے۔ اس سانحہ میں ہم بیگم عبداللہ بٹ اور دوسرے اعزا سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ہر طرح ان کے غم میں شریک ہیں۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شاہ ہادی عطا :-

شاہ صاحب، صوبہ متحدہ میں سادات کے ایک مشہور مردم خیز قصبہ سلون سے تعلق رکھتے تھے، جو علمی خانوادہ ہونے کی وجہ سے صدیوں سے مشہور رہا ہے۔ وہ خود بھی بڑے لائق محنتی اور ذہین طالب علم تھے۔ انٹرمیڈیٹ (الٰہ آباد) میں بہت اچھی پوزیشن حاصل کی تھی، یہاں بی اے میں سارے طلباء سے اوّل آئے تھے۔ مرحوم بڑے منکسر المزاج، نیک دل، مذہبی اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی علمی دنیا میں اچھا نام پیدا کرتے۔ ہمیں اس حادثہ پر ان کے والد محترم حضرت سید شاہ حلیم عطا صاحب اور ان کے لائق بھائی شاہ حسن عطا صاحب متعلم ایم اے (نفسیات) سے گہری ہمدردی ہے۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

عبدالشکور :-

ابھی چند ہفتے ہوئے عبدالشکور صاحب جو ہمارے جامعہ میں بی کام کے طالب علم تھے انتقال کر گئے۔ مرحوم بے حد تیز اور ذکی طالب علم تھے۔ یہ تیزی ان کی گفتگو اور ان کے ہر کام سے نمایاں تھی۔ مرحوم بشرطِ زندگی دنیا میں بڑے کامیاب رہتے۔ ہمیں اس حادثۂ جانکاہ میں ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے۔ آمین۔

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

غالب نمبر

علی گڑہ میگزین کا آئندہ شمارہ غالب نمبر ہوگا
جس میں مشاہیر اہل قلم حصہ لے رہے ہیں

تین حصوں پر مشتمل (۱) آثار (۲) تذکرہ (۳) تنقید

لکھنے والے:— ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، مالک رام (مصر) وزیرالحسن (ایران)، امتیاز علی عرشی، مہیش پرشاد، غلام رسول مہر، حمید احمد خان اختراورینوی، پروفیسر محمد محسن، آل احمد سرور، احتشام حسین، حمیدہ سلطان ممتاز شاہنواز، عبدالمالک آروی، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، رتن لال بنسل، نورالحسن ہاشمی - ان کے علاوہ اور حضرات نے بھی لکھنے کا وعدہ کیا ہے

براہ کرم آپ بھی اپنے مضامین جلد بھیجئے -